مقالات حبیب

(حصہ سوم)

گوشۂ سیرت وتاریخ

تذکرہ ارباب کمال

تالیف

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

ناشر

شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

مقالات حبیب

(حصہ سوم)

گوشۂ سیرت وتاریخ

تذکرہ ارباب فضل وکمال

تالیف

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

ناشــــر

شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر نگرانی

حضرت مولانا بدرالدین اجمل علی القاسمی صاحب
رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلہ اشاعت ۴۱ع

نام کتاب : مقالات حبیب (حصہ سوم)
مولف : حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
سن اشاعت : ۱۴۳۰ھ — ۲۰۰۹ء
تعداد صفحات : ۴۴۰
ناشر : شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

فہرست ابواب وموضوعات

(حصہ سوم)

باب (۵) گوشۂ سیرت وتاریخ

باب (۶) تذکرہ ارباب فضل وکمال

☆ ☆ ☆

باب ﴿۵﴾

گوشۂ سیرت وتاریخ

سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

ایک نظر میں

سن عیسوی

٥٧٠ء ٢٠/اگست۔ ولادت باسعادت (ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق آنحضرت......کی ولادت ١٧/جون ٥٦٩ء کو ہوئی)

٥٧٥/٦/٧ء وفات حضرت آمنہ والدہ ماجدہ آنحضرت......۔

٥٧٨ء آنحضرت......کے دادا خواجہ عبدالمطلب کی وفات۔

٥٨٢ء آنحضرت......کا ملک شام کی طرف پہلا سفر۔

٥٩٥ء ملک شام کا دوسرا سفر، حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی تجارت کی غرض سے۔

٥٩٥ء حضرت خدیجۃ الکبری سے عقد

٦٠٥ء تجدید عمارت کعبہ معظّمہ

٦١٠ء آغاز وحی۔ (ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کی رو سے وحی کی ابتداء ٢٣/دسمبر ٦٠٩ء کو ہوئی ہے)

٦١٥ء حبشہ کی جانب پہلی ہجرت (رجب ۵ھ نبوی)

٦١٧ء قبائل عرب کی جانب سے بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کا معاشرتی مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ)

٦٢٠ء حضرت خدیجہ اور خواجہ ابو طالب کی وفات

٦٢٠ء آنحضرت......کا سفر طائف

٦٢١ء معراج وفرضیت نماز (ہجرت سے ایک سال قبل ٢٧/رجب)

۶۲۱ء	بیعت عقبۂ اولیٰ (۱۲ھ نبوی)
۲۸/جون	ہجرت مدینہ منورہ (۱۲/ربیع الاوّل بروز دوشنبہ) حسب تحقیق ڈاکٹر حمید اللہ
۶۲۲ء	۳۱/مئی ۶۲۲ء یوم دوشنبہ
۶۲۳ء	تحویل قبلہ (آنحضرت ...... نے مدینہ منورہ میں ۱۶/مہینے بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز ادا کی)
//	سریہ حمزہ وعبیدہ بن حارث۔
۶۲۳ء	(جون) غزوہ ابوا۔ (جولائی) غزوہ بواط (اکتوبر) غزوہ عشیرۃ (نومبر) سریہ عبداللہ بن جحش
۶۲۴ء	(جنوری) غزوہ بدرالکبریٰ (رمضان ۲ھ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق ۱۸/نومبر ۶۲۳ء یوم جمعہ (فروری) غزوۂ بنی قینقاع (شوال ۲ھ (اپریل) غزوۂ سویق، (ذی الحجہ ۲ھ (ستمبر) سریہ زید بن حارثہ
۶۲۵ء	(جنوری) غزوہ احد (شوال ۳ھ) وغزوہ حمراء الاسد (مئی) حادثہ رجیع و بیر معونہ ۴ھ (جون) غزوہ بنو نضیر وغزوہ ذات الرقاع ۴ھ) اسی سال شراب حرام ہوئی
۶۲۶ء	(جولائی) غزوہ دومۃ الجندل (ربیع الاوّل ۵ھ) وغزوہ بنی مصطلق (شعبان ۵ھ) اس کو غزوہ مریسیع بھی کہا جاتا ہے
۶۲۷ء	(فروری) غزوہ خندق (۲۹/شوال ۵ھ) (ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق ہے کہ غزوہ خندق ۱۴/جنوری ۶۲۷ء کو پیش آیا ہے) (اپریل) غزوہ بنی قریظہ (ذیقعدہ ۵ھ) (جون جولائی) غزوہ بنی لحیان (ربیع الاوّل ۶ھ) وغزوہ ذی قرد
۶۲۸ء	(جنوری) صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ھ) (مئی) روم و فارس کو دعوت اسلام بذریعہ مکتوب (اگست) غزوہ خیبر (محرم ۷ھ)
۶۲۹ء	(فروری) عمرۃ قضا (ستمبر) سریہ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) (اکتوبر) سریہ ذات سلاسل (جمادی الثانی ۸ھ)

٦٣٠ ÷ (جنوری) فتح مکہ معظّمہ وہدم اصنام (رمضان ٨ھ) (فروری) غزوۂ حنین (١٠رشوال ٨ھ)

٦٣٠ ÷ غزوۂ طائف (اپریل) آنحضرت...... کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی ولادت، (اکتوبر) غزوۂ تبوک (رجب ٩ھ)

٦٣١ ÷ (مارچ) حضرت ابوبکر صدیق کی امارت حج (ذی الحجہ ٩ھ) (جون) صاحبزادۂ رسول......حضرت ابراہیم کی وفات

٦٣٢ ÷ (مارچ) حجۃ الوداع (١٠ھ) حسب تحقیق ڈاکٹر حمید اللہ ٦ر مارچ ٦٣٢ ÷ یوم جمعہ (مئی) جیش اسامہ کی ملک شام جانے کی تیاری (صفر ١١ھ) (جون) وفات النبی ...... (ربیع الاوّل ١١ھ یوم دوشنبہ) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق ٢٥ر مئی ٦٣٢ ÷ کو آنحضرت......کا وصال ہوا۔

☆ ☆ ☆

ہادیٔ عالمؐ کی ازدواجی سیرت کا ایک پہلو

نبیٔ اسلام محمد رسول اللہ...... کی ازدواجی سیرت پر بہت سے مستشرقین، متعصب پادریوں اور ظاہر بیں معترضوں نے نہایت رکیک خیالات اور دور از حقیقت شبہات کا اظہار کیا ہے جس سے متاثر ہوکر نبیٔ کریم ...... کی سیرتِ پاک اور اخلاق کریمانہ سے ناواقف سادہ لوح مسلمان بھی شکوک واوہام میں مبتلا ہوجاتے ہیں، زیرنظر مقالہ میں اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے حضور پاکؐ کی عفت وعصمت، پاکدامنی ونفس کشی کے ساتھ وہ مصالح ومقاصد اور حکمتیں بھی واضح اور منقح ہوکر سامنے آجائیں گی جن کا حصول عرب جیسے جمود پسند ملک میں بغیر کثرتِ تزویج ممکن نہ تھا اور نہ ہی اس مصلح اعظم اور رحمۃ للعالمین کے لئے ان مصلحتوں سے صرف نظر کرنا مناسب تھا، اسی بنا پر رب العلمین نے ساری امت سے الگ اختصاصی طور پر آپ کو کثرتِ ازواج کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مسئلۂ کثرت ازدواج کے دو بنیادی نقطے

تفصیل میں جانے سے پہلے اس اہم مسئلہ میں دو بنیادی نقطوں کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے: (۱) نبی کریم ...... کے حبالۂ عقد میں امہات المومنین کی کثرت زمانۂ شیخوخت یعنی پچاس سال کی عمر کے بعد ہوئی ہے، تمام کتب سیر وتاریخ اس امر پر متفق ہیں کہ آنحضرت...... نے ابتدائی عمر سے ۲۵ برس تک کسی عورت سے ازدواجی تعلق قائم نہیں کیا۔

حالانکہ عمر کا یہی وہ دور ہے جس میں جوانی دیوانی ہوتی ہے اور شباب کا بھوت سر پر سوار ہوکر انسان کو پاگل بنادیتا ہے بالخصوص پندرہ برس سے پچیس سال تک کا زمانہ تو انتہائی نازک ہوتا ہے جس میں شہوت سے مغلوب اور نفس سے عاجز اشخاص ہر قسم کے

ناکردنی افعال کرگذرتے ہیں۔

لیکن تاریخ اور واقعات شاہد ہیں کہ زندگی کے یہ ایام نبی کریم ...... نے جس حزم واحتیاط اور عفت وعصمت کے ساتھ گذارے ہیں اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔

(۲) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی جملہ ازواج بیوہ تھیں، جب کہ یہ بات تقریباً مسلمات میں سے ہے کہ شہوت پرست، تعیش پسند بیوہ اور عمر رسیدہ عورتوں کی بجائے نئی نویلی کنواری لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں چاہے خود کتنے ہی عمر دراز اور سن رسیدہ کیوں نہ ہوں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ......اوّلاً تو پچیس سال کی عمر تک تجرّد وتفرد کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر جب عقد کرتے ہیں تو ایسی خاتون کے ساتھ جو عمر میں آپ سے پندرہ سال زیادہ اور ایک نہیں بلکہ دو خاوندوں کے نکاح میں رہ چکی ہیں اور ان کی عمر اور جوانی کا اکثر واہم حصہ گذر چکا تھا، پھر اپنی قوت وطاقت کے عمدہ زمانے یعنی پچیس سال سے ۵۰ سال تک کو اسی ایک سن رسیدہ و بیوہ رفیقۂ حیات کے ساتھ گذار دیتے ہیں۔

یہ دو نقطے اس مسئلے میں اس قدر اہم ہیں کہ انھیں پیش نظر رکھنے سے معاندین وجاہلین کے لگائے ہوئے الزامات کے برعکس نبی کریم......کی عفت اور پاکدامنی منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

اب ہم اختصار کے ساتھ ازواج مطہرات کے تراجم پیش کرتے ہیں جس سے ہمارا دعویٰ مدلل ومبرہن ہو کر ہر صاحب عدل وانصاف کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کردے گا کہ وہ ذات گرامی جو رحمۃ للعالمین اور مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں آئی تھی اس کے لئے کثرتِ ازواج ازبس ضروری تھی۔

تراجم امّہاتُ المومنین

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا: باتفاق ارباب سیر یہ آپ ......کی اوّلین بیوی ہیں، عقد کے وقت آنحضرت......کی عمر شریف پچیس سال اور خود ان

کی چالیس سال تھی، یہ پہلے ابو ہالہ بن زرارہ کے نکاح میں تھیں ان کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی سے بیاہی گئیں، اور عتیق کے فوت ہو جانے کے بعد آنحضرت...... کے حبالۂ عقد میں آئیں، حضرت خدیجۃ الکبریٰ عفت اور پاکدامنی میں ممتاز شخصیت کی مالکہ تھیں اور اپنے اسی وصف کی بنا پر مکہ میں طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔

نبی کریم...... نے اپنا مکمل عہد شباب انھیں کے ساتھ گذارا اور ان کی حیات میں کسی اور سے عقد نہیں فرمایا۔ حضرت ابراہیم کے علاوہ آپ کی جملہ اولاد انھیں کے بطن سے تھیں، ہجرت سے تین سال پیشتر ۱۰ نبوی میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی ان کے وصال کے وقت حضور...... عمر شریف کی پانچ دہائیاں پوری کر چکے تھے یعنی شباب کے دور سے گذر کر شیخوخت کی منزل میں داخل ہو گئے تھے۔

تبلیغ رسالت اور اسلام کی حمایت و نصرت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے اہم کارنامے انجام دیئے اور نبی کریم کی رفاقت کا کما حقہ حق پورا کیا۔(۱)

(۲) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا: حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات سے کچھ ہی روز بعد آپ کے نکاح میں آئیں، بوقت نکاح ان کی عمر پچاس یا پچپن سال تھی ان کے پہلے شوہر حضرت سکران بن عمرو انصاری تھے جو ہجرت حبشہ سے واپسی پر راستے میں فوت ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ بالکل بے یار و مددگار ہو گئیں، گھر والوں کے پاس جانے میں چونکہ ایمان کا خطرہ تھا اس لئے بڑی تنگی میں زندگی بسر کر رہی تھیں، نبی کریم ...... نے ان کی درازیٔ عمر کے باوجود ان کے دین و دنیا کی حفاظت و کفالت کے لئے نکاح کر لیا اور اپنے دامنِ رحمت میں لے کر انھیں سارے اندیشوں اور مصیبتوں سے محفوظ کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔(۲)

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا: ہجرت سے تین سال قبل ماہ شوال سنہ ۱۰ نبوی میں نبی کریم ...... سے نکاح ہوا اور رخصتی ۱ھ میں ہوئی، ۹؍سال

(۱) تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو عیون الاثر، اصابہ اور زرقانی وغیرہ۔

(۲) تاریخ کبیر امام بخاری، رحمۃ للعالمین، سیرت مصطفیٰ وغیرہ۔

آنحضرت...... کی رفاقت میں رہیں اور آپ...... کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد ۴۸ سال بقید حیات رہ کر ۵۷ھ میں رہ گرائے عالم جاودانی ہوئیں۔

ازواج مطہرات میں صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کنواری اور بن بیاہی تھیں فہم وفراست اور علم وتفقہ میں تمام ازواج مطہرات بلکہ بہت سے صحابۂ کرام پر فوقیت رکھتی تھیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ما اشکل عَلینا حدیث قط فسألنا عائشة الاوجدنا عندها منه علما. ہم اصحاب رسول کو جب بھی کسی مسئلہ میں اشکال پیش آتا تو دریافت کرنے پر حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس اس کا حل مل جاتا تھا۔

روایت حدیث میں حضرت ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمرو کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ ہی کی مرویات سب سے زیادہ ہیں، اکابر صحابہ میں حضرت فاروق اعظم، ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسی اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ نے آپ سے روایت کی ہے۔

علوم دینیہ کے علاوہ ایام عرب، اور اشعار جاہلیت میں بھی انھیں کامل رسوخ حاصل تھا یہی وہ فضائل ہیں جن کی بناء پر آنحضرت...... حضرت عائشہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے چونکہ تعدد نکاح کا ایک اہم اور بنیادی مقصد دین کی تعلیم اور وہ احکام ومسائل جو صنف نسواں سے متعلق ہیں انھیں ازواج مطہرات کے واسطہ سے امت کی عورتوں تک پہنچانا تھا، درحقیقت یہ ازواج مدرسۃ النسواں کی طالبات تھیں، مسجد نبوی اور صفّہ میں مردوں کو تعلیم دی جاتی تھی، اور بیت نبوی ...... میں امہات المومنین کو تاکہ آگے چل کر یہ دیگر عورتوں کی معلّمات بنیں چونکہ اس میدان میں حضرت عائشہ صدیقہ اپنی جودتِ فہم، دقّتِ نظر، اور قوت حافظہ کی بنا پر تمام ازواج سے ممتاز تھیں، اس لئے فطرتاً آنحضور...... کا میلان طبع ان کی جانب زیادہ تھا۔

(۴) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا: یہ حضرت فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی تھیں شعبان ۳ھ میں آنحضرت...... کے نکاح میں آئیں، ان کے پہلے شوہر

حضرت خنیس بن حذافہ سہمی کو غزوۂ بدر میں زخم آیا، جس کے صدمے سے کچھ عرصہ بعد فوت ہوگئے، شوہر کے انتقال کے بعد حضرت فاروق اعظم نے حضرت عثمان غنی اور ابوبکر صدیقؓ کو خطبہ دیا مگر یہ حضرات خاموش رہے بالآخر آپ...... نے خود انھیں اپنے حبالۂ عقد میں لے کر ان کے والد ماجد اور خود ان کی عزت افزائی فرمائی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت شعبان ۴۵ھ میں آپ کا وصال ہوا کل آٹھ سال آنحضرت...... کی رفاقت میں رہیں۔

(۵) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا: ۳ھ میں آپ کی زوجیت سے مشرف ہوئیں، ان کے پہلے شوہر حضرت عبداللہ بن جحش غزوۂ احد میں شہید ہوئے، حضرت زینب خود اس غزوہ میں شریک تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی اور دیکھ ریکھ کی خدمات نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور شوہر کی شہادت پر پورے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ نبی کریم کو جب ان کے صبر وثبات اور مجاہدین کی خدمات کا علم ہوا تو ان کی عزت افزائی اور قدردانی اور اطمینان خاطر کی غرض سے اپنی زوجیت میں لے لیا، نکاح کے دو تین ماہ ہی گذرے تھے کہ ان کا وصال ہوگیا، آنحضرت...... نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔

(۶) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا: یہ بھی بیوگی کی حالت میں آپ کے نکاح میں آئیں ان کے پہلے شوہر حضرت عبداللہ بن عبدالاسد اولین سابقین میں سے تھے اور دین کی حفاظت کے لئے اپنی زوجہ محترمہ کو ساتھ لے کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے، وہیں ان کے صاحبزادے سلمہ پیدا ہوئے، غزوۂ احد کے موقع پر دولتِ شہادت سے ہم کنار ہوئے۔

شوہر کے وصال کے بعد حضرت ام سلمہ اور ان کے چار یتیم بچے بالکل بے سہارا ہوگئے نبی کریم...... نے انھیں نکاح کا پیغام بھیجا تا کہ بچوں کی پرورش اور تربیت کے ساتھ خود ام سلمہؓ کی کفالت کا سامان بھی ہوجائے اور ان کی رضامندی پر نکاح فرمالیا اور ان کے بچوں کی اس طرح پیار ومحبت اور اپنائیت کے ساتھ پرورش فرمائی کہ وہ اپنے والد کو یکسر بھول گئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شرافت نسبی اور تقدم اسلام کے ساتھ فہم وفراست اور عقل وتدبّر کے لحاظ سے امتیازی شان رکھتی تھیں، حتیٰ کہ خود آنحضرت ......اپنے اور مومنین کے اہم امور میں ان سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، سات سال آنحضرت ...... کے ساتھ رہیں، اسّی یا چوراسی سال کی عمر میں وفات ہوئی۔(۱)

(۷) حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا: آنحضرت ...... کی پھوپھی زاد بہن ہیں، آپ کی زوجیت میں آنے سے پہلے آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنّیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں، حضرت زینب چونکہ زیدؓ کو حسب و نسب کے لحاظ سے اپنے آپ سے کمتر درجہ کا سمجھتی تھیں، اس لئے شوہر کا جیسا احترام ہونا چاہئے اسے پورا نہ کرسکیں، جس سے حضرت زیدؓ کو شکایت ہوئی اور بالآخر نوبت طلاق تک پہنچی، حضرت زید کے ساتھ ان کا نکاح نبی کریم ...... کے حکم سے ہوا تھا، اگرچہ وہ طبعی طور پر اس کے لئے آمادہ نہ تھیں، مزید برآں طلاق کا واقعہ ہوجانا اس سے ان کی بظاہر مزید سبکی و دل شکنی ہوئی، آنحضرت ...... نے اس کے ازالہ کی خاطر خود حضرت زینب سے بحکم خداوندی نکاح فرمالیا۔

بعض مخالفین اسلام اور اعداء رسول ...... نے ایک بے سروپا اسرائیلی روایت کے سہارے حضرت زینب سے متعلق النبی الذکی الطاہر ...... پر ایک رکیک اور بیہودہ الزام عائد کیا ہے جو روایتاً و درایتاً بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، تاریخ اسلامی میں اس روایت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اس مخترع، ساقط الاسناد اور یکسر باطل روایت کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن آنحضرت ...... حضرت زید کی غیر موجودگی میں ان کے گھر تشریف لے گئے، وہاں حضرت زینب پر آپ کی نظر پڑ گئی اور آپ کا دل ان کی جانب مائل ہوگیا دل کی اس بدلتی ہوئی حالت پر تعجب کرتے ہوئے آپ نے سبحان اللہ مقلب القلوب کا جملہ زبان سے ادا کیا، اس جملہ کو زینب نے سن لیا، اور حضور ...... کی حالت کا اندازہ کرلیا، جب زید گھر واپس آئے تو انھوں

(۱) تفصیل کے لئے صحیح بخاری، اصابہ، زرقانی، رحمۃ للعالمین وغیرہ ملاحظہ ہو۔

نے اس واقعہ کی اطلاع انھیں دی، زید سمجھ گئے کہ نبی کریم ......کو زینب پسند آ گئی ہیں اس لئے خدمت میں آ کر طلاق کا ارادہ ظاہر کیا، نبی علیہ السلام نے انھیں منع کیا لیکن (نعوذ باللہ) دل میں یہی تھا کہ زید انھیں طلاق دیدیں تو بہتر ہوگا، آخر کار زید نے انھیں اسی نیت سے طلاق دیدی کہ حضور......ان سے نکاح کرلیں۔

سند کے اعتبار سے یہ روایت ساقط الاعتبار ہے ہی ازروئے عقل بھی نہایت پوچ اور لغو ہے، زینب نبی کریم......کی پھوپھی زاد بہن ہیں، آپ انھیں لڑکپن سے جانتے پہچانتے تھے، اس تعارف وتوافق کے باوجود آپ ان کی جانب مائل نہیں ہوئے حالانکہ وہ اس وقت کنواری اور نئی نویلی تھیں پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ وہی زینب جب دوسرے کے عقد میں چلی گئیں اور ثیبہ ہوگئیں تو آپ ان کی جانب مائل ہوگئے، سبحانک ہذا بہتان عظیم۔

اسی لئے جمہور مفسرین ومؤرخین نے اس واقعہ کے موضوع اور جھوٹے ہونے کی واضح الفاظ میں تصریح کی ہے۔ آگے حضرت زیدؓ سے ان کے نکاح کی حکمت اور طلاق کے بعد پھر آنحضرت......کے ان سے عقد فرمانے کی مصلحت بالتفصیل آ رہی ہے۔

ابن سیّد الناس کی تفصیل کے مطابق ۴ھ میں حضرت زینب آپ......کے نکاح میں آئیں چھ سال حضور...... کے ساتھ رہیں اور ۲۰ھ میں بعمر ۵۷ سال وفات ہوئی، حضرت فاروق اعظمؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

(۸) حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا: یہ حارث بن ضرار سردار بنو مصطلق کی بیٹی تھیں ان کا شوہر مسافح بن صفوان مصطلقی غزوہ مریسیع میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا یہ قبیلہ اسلام اور مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا، ڈاکہ اور راہزنی میں اسے خاص شہرت تھی، دیگر بہت سے قیدیوں کے ساتھ حضرت جویریہ بھی گرفتار ہوکر آنحضرت......کی خدمت میں پیش ہوئیں، آنحضرت ...... نے انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، جس کی برکت سے اس قبیلہ کو دنیا اور آخرت دونوں میں نفع عظیم حاصل ہوا، ربیع الاول ۵۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۹) حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا: یہ ابوسفیان بن حرب مشہور سردار

عرب کی بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا، دونوں مشرف باسلام ہوکر حبشہ ہجرت کر گئے، وہاں کچھ عرصہ کے بعد عبید اللہ مرتد ہو کر عیسائی بن گیا، اور اسی حالت میں مر گیا مگر حضرت ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں، عبید اللہ کے انتقال اور عدّت کے ختم ہو جانے پر آنحضرت...... نے نجاشی شاہ حبشہ کو کہلا بھیجا کہ اگر ام حبیبہ نکاح پر راضی ہوں تو تم بطور وکیل میرا نکاح ان سے کرا دو اور انھیں میرے پاس مدینہ بھیج دو، ام حبیبہؓ کی منظوری پر نجاشی نے آنحضرت ...... سے ان کا نکاح کر دیا اور خود اپنی جانب سے چار ہزار درہم مہر کے انھیں دے کر حضرت شرحبیل کے ہمراہ آنحضرت ...... کی خدمت میں پہنچا دیا، ۴۴ھ میں بعمر ۷۴ سال مدینہ منورہ میں فوت ہوئیں، اس نکاح کے مصالح آئندہ آرہے ہیں۔

(۱۰) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا: اپنے قبیلے بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم قرظی سے ہوا، سلام کے طلاق دیدینے کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ غزوہ خیبر میں قتل ہوا، حضرت صفیہ گرفتار ہوئیں رسول اللہ...... نے انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، ۵۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی، سوا تین سال نبی کریم...... کی رفاقت میں رہنے کا موقع ملا۔

(۱۱) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا: ماہ ذی قعدہ ۷ھ میں جب آپ عمرۂ قضا کے لئے تشریف لے گئے اس وقت آپ کی زوجیت میں آئیں، یہ آپ کی آخری زوجہ ہیں ان کے بعد آپ...... نے کسی اور سے نکاح نہیں فرمایا یہ پہلے ابورہم بن عبدالعزہ کے نکاح میں تھیں ۵۱ھ میں بعمر اسّی (۸۰) سال مقام سرف میں انتقال ہوا، سرف ہی میں نکاح بھی ہوا تھا۔

تعدّد ازواج کے مصالح

حضرات امہات المومنین کے تذکرہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ جملہ ازواج مطہرات بیوہ ہونے کے بعد آپ کے نکاح میں آئی اور ان میں بعض وہ بھی ہیں جو عمر کی اس منزل میں پہنچ چکی تھیں، جس میں عورتیں نکاح کے قابل نہیں رہ

جاتیں پھران میں اکثر وہ ہیں جنھیں چند سالوں سے زیادہ آپ کے ساتھ زندگی گذارنے کا موقع نہ مل سکا۔

پھران کی خدمت نبوی میں آمد بھی ایسے دور میں ہوئی جب کہ مشرکین مکہ وغیرہ سے غزوات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، جس کی بنا پر آپ کو گھر چھوڑ کر باہر رہنا پڑتا تھا اور اطمینان وسکون تقریباً مفقود تھا اس لئے ان نکاحوں سے نعوذ باللہ خواہش نفس کی تکمیل مقصود نہیں تھی بلکہ اس کی مختلف حکمتیں تھیں جن کے پیشِ نظر مَالِی فِی النساء مِنْ حَاجَةٍ (مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں) کے باوجود بحکم خداوندی آپ نے یہ سارے نکاح کئے، ذیل میں اختصار کے ساتھ چند مصالح کا ذکر کیا جاتا ہے تا کہ حقیقتِ واقعہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

(۱) **تعلیمی مصلحت** : ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرات امہات المومنین درحقیقت درسگاہ رسول کی طالبات تھیں، بعثتِ رسول کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد امّت کو دین کی تعلیم دینا ہے ویعلمھم الکتاب والحکمة سے قرآن حکیم نے نبی کے اس فریضہ کی وضاحت کی ہے، اس تعلیم میں بہت سی باتیں وہ ہیں جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہے یا عورتوں اور مردوں کے باہمی رابطہ سے ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ جس طرح مردوں کی ایک جماعت سفر وحضر میں نبی کریم ...... کے ساتھ رہ کر تعلیماتِ نبوی سے مستفید ہو اسی طرح عورتوں کی بھی ایک جماعت خلوت وجلوت میں رسول اللہ...... کے ساتھ رہے تا کہ ان کے واسطہ سے صنف نسواں کے مخصوص مسائل واحکام امت کی تمام بیٹیوں تک پہنچائے جاسکیں، کیونکہ عورتیں بالعموم اپنی فطری حیاء کی بنا پر براہ راست نبی علیہ السلام سے ان مسائل کو پوچھنے میں شرم کرتی تھیں، علاوہ ازیں خود آنحضرت ......بھی اپنی حیاء کامل کی وجہ سے ان کے مخصوص مسائل کے جوابات صراحةً دینے پر قادر نہ ہوتے تھے بلکہ ایسی صورتوں میں اشارہ وکنایہ کو کام میں لاتے تھے اور عورتیں بسا اوقات انھیں سمجھ نہ پاتی تھیں۔

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک انصاریہ خاتون نے غسل حیض

سے متعلق احکام معلوم کیئے، آنحضرت ...... نے انھیں غسل کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا خذی فرصة ممسكة فتطهری بها (خوشبو آلود کپڑے کا ایک ٹکڑا لے لو اور اس سے طہارت حاصل کرو) انصاریہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور عرض کیا کیف اطهر بها (اس سے کیوں کر طہارت حاصل کروں) آپ نے جواب میں پھر اسی جملہ فتطهری بها کا اعادہ فرمایا، انصاریہ نے اظہار عجز کرتے ہوئے کہا کیف یا رسول الله اطهر بها نبی علیہ السلام نے ان کے اس اشارہ کو نہ سمجھنے پر تعجب آمیز لہجہ میں فرمایا سبحان الله تطهری بها لیکن انصاریہ پھر بھی نہ سمجھ سکیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب میں نے یہ حالت دیکھی تو انصاریہ کا ہاتھ بھینچتے ہوئے کہا ضعها فی مکان کذا کذا و تبتغی بها اثر الدم (اسے فلاں مقام میں رکھ لے اور پھر دیکھتی رہ کہ اس پر خون کا اثر ظاہر ہوتا ہے یا نہیں) وصرحت لها بالمکان الذی تضعها فيه اور اس جگہ کی صراحت کردی جس میں کپڑے کو رکھنا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے مخصوص مسائل کو عورتیں صراحتاً نہ تو نبی کریم سے دریافت کرسکتی تھیں (الاّ ماشاء اللہ) اور نہ خود آنحضرت ......انھیں ہر عورت سے بیان کرسکتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ دو چار نہیں بلکہ عورتوں کی ایک معتد بہ تعداد آپ کی زوجیت میں آ کران مسائل کو سیکھے اور دوسری عورتوں تک انھیں پہنچائے۔

چنانچہ احادیث وسیر کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں رات کی تاریکیوں میں آ آ کر حضرت عائشہ صدیقہ اور دوسری ازواجات مطہرات سے اس قسم کے مسائل دریافت کیا کرتی تھیں۔

پھر یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ سنّت مطہرہ صرف اقوال رسول میں منحصر نہیں بلکہ آنحضرت ...... کے اعمال اور تقریرات کی بھی وہی حیثیت ہے جو اقوال کی ہے اور جس طرح فرمان نبوی امت کے لئے ہدایت اور ذریعہ نجات وسعادت ہیں، بعینہٖ اقوال و تقریرات بھی سرمایہ رشد و ہدایت ہیں، اب ظاہر ہے کہ یہ امہات المومنین نہ ہوتیں تو آنحضرت ...... کے گھریلو اعمال اور تدبیر منزل کے احکامات کے معلوم ہونے کا ذریعہ کیا

ہوتا، الحاصل نبی کریم ...... نے کثرتِ زوجات کے ذریعہ عورتوں میں معلّمات کی ایک جماعت تیار کردی، احادیث نبوی اور سیرت رسول نیز احکام شرعیہ کا ایک قابل ذکر حصہ انھیں ازواجِ مطہرات کے ذریعہ امت تک پہنچا ہے بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہ تو اس وصف میں اکثر صحابۂ کرام پر بھی فوقیت رکھتی ہیں۔

یہ ہے کثرت ازواج کی بنیادی حکمت اور اساسی مصلحت، اسی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ معظّمہ کی پوری زندگی اور مدینہ منورہ کے ابتدائی سنین میں چونکہ اصلاح عقائد و اخلاق پر زور تھا، ازواجِ مطہرات کی یہ کثرت نہیں تھی ۲ھ کے بعد جب اصلاح اعمال و افعال پر خصوصی توجہ دی جانے لگی، اور احکام عملیہ تیزی کے ساتھ نازل ہونے لگے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ عورتوں کی ایک جماعت حریم نبوت میں داخل ہوجائے تاکہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی معلّمات کا ایک طبقہ پیدا ہوجائے۔

واذكرن ما يتلى في بيوتكن من آيات الله والحكمة.

اور تم (اے ازواج رسول) خدا کی ان آیتوں اور رسول کی سنتوں کو یاد رکھو جن کا تمہارے گھروں میں چرچا کا تاکیدی حکم حضرات امہات المومنین کو اسی بنا پر تھا تاکہ آگے چل کر یہ صنف نسواں کی تعلیم وتربیت کا حق پورے طور پر ادا کرسکیں۔

(۲) **تشریعی مصلحت** : کثرتِ ازواج کے مصالح میں سے ایک مصلحت تشریعی بھی ہے اس کے ذریعہ آپ نے تبنیت کے بت کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کردیا۔

متبنّیٰ (لے پالک) بنانے کا طریقہ عرب میں قدیم زمانہ سے چلا آرہا تھا، اور اہل عرب اس سلسلے میں اتنا غلو رکھتے تھے کہ متبنّیٰ (منہ بولا بیٹا) کو حقیقی و صلبی بیٹے کے درجہ میں سمجھتے، میراث، نکاح، طلاق، حرمت مصاہرت، حرمت مناکحت وغیرہ تمام احوال میں منہ بولے بیٹے کا معاملہ حقیقی بیٹے کی طرح کرتے تھے، طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی کسی کو اپنا متبنّیٰ بناتا تو اس سے کہتا انت ابني ارثك وترثني (تو میرا بیٹا ہے میں تمہارا وارث ہوں اور تم میرے وارث ہو)

اسلام جو اصلاح معاشرہ کا سب سے بڑا داعی اور مبلغ ہے وہ ان باطل رسوم اور خلافِ عقل وشرع امور کو کیونکر برقرار رکھ سکتا تھا اور پورے معاشرہ کو جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا ہوا کس طرح چھوڑ سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اوّلاً اپنے رسول کو متبنّیٰ بنانے کا الہام کیا اور آپ نے بعثت سے قبل زید بن حارثہ کو متبنّیٰ بنالیا اور لوگ اس دن سے زید بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد کہہ کر پکارنے لگے، امام بخاری و مسلم دونوں متفقہ طور پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

ان زید بن حارثة مولی رسول اللّٰہ ما کنّا ندعوہ الاّ زید بن محمد حتی نزل القرآن "ادعوھم لابائھم ھو اقسط عند اللّٰہ" فقال النبی انت زید بن حارثة.

متبنّیٰ بنانے کے بعد آپ نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب سے کردیا اگرچہ زینب اس رشتے کیلئے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پارہی تھیں مگر رسول اللہ...... کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کردیا پھر بھی حسب ونسب کے لحاظ سے وہ اپنے کو حضرت زید سے اعلیٰ و برتر سمجھتی رہیں جس کی بناء پر وہ توافق و یکسانیت جو شوہر اور بیوی کے درمیان ہونا چاہیئے پیدا نہ ہوسکی اور حالات بگڑتے بگڑتے اس حد کو پہنچ گئے کہ حضرت زید نے انھیں طلاق دیدی، زید کے طلاق دیدینے کے بعد حکم خداوندی پہنچا۔

فلما قضی زید منھا وطرا زوجنا کھا (جب زید نے زینب سے اپنی حاجت پوری کرلی اور ان کو طلاق دیدی تو اے نبی ہم نے ان کا نکاح آپ سے کردیا)

چنانچہ آپ نے حضرت زینب سے نکاح فرمالیا تاکہ عرب کی اس قدیم بدعت کا سلسلہ ٹوٹ جائے اور اسلامی طریقہ کی بنیاد قائم ہو۔ اس طرح اس مبارک نکاح کے ذریعہ عرب سے وہ رسم بد ختم ہوئی جس میں وہ صدیوں سے گرفتار چلا آرہا تھا۔

ساتھ ہی اس جدید تشریع الٰہی اور طریقۂ اسلامی کو مؤکد کرنے کے لئے یہ حکم نازل فرمایا گیا۔ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولٰکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیین وکان اللّٰہ بکل شیء علیماً الآیة محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ خاتم سلسلۂ نبوت ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شئی کا علم رکھنے والا ہے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ نکاح حکمِ خداوندی سے ایک باطل رسم کو مٹانے کیلئے عمل میں آیا تھا نہ کہ ہوائے نفس کی تکمیل کے لئے، جیسا کہ معاندین اسلام واعداء رسول......کا فاسد خیال ہے۔

(۳) **اجتماعی مصلحت** : یہ حکمت حضرت عائشہ صدیقہ اور سیّدہ صفیّہ رضی اللہ عنہما کے نکاحوں سے خوب ظاہر ہوتی ہے، ان نکاحوں کے ذریعہ آپ کے دونوں وزراء حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت فاروق اعظمؓ آپ کے سلسلۂ مصاہرت میں آ گئے جس سے ان حضرات کا مزید اعتبار بڑھا اور آگے چل کر اُن کی خلافتوں کو اس کے ذریعہ تقویت ومنفعت حاصل ہوئی۔

علاوہ ازیں اسلام کی سربلندی اور نشر واشاعت میں ان ہر دو بزرگوار نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اس کا بھی تقاضا تھا کہ انھیں دنیا میں بھی خصوصی مقام اور امتیازی شان حاصل ہو، اسی لئے آنحضرت...... نے ان دونوں حضرات کی صاحبزادیوں سے نکاح فرما کر ان کی عزت افزائی فرمائی، جس طرح حضرت عثمان اور علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما کے نکاح میں اپنی صاحبزادیوں کو دے کر ان کے مقام ومرتبہ کو بلند کیا۔ الحاصل یہ چاروں حضرات آپ کے اعظم صحابہ اور آپ کے بعد دین وملت اور اس کی دعوت وامامت میں آپ کے خلیفہ تھے، اس لئے ان سے رشتۂ مصاہرت قائم کرنا اجتماعی سیاست وحکمت کے لحاظ سے نہایت ضروری تھا۔

(۴) **سیاسی مصلحت** : بعض نکاحوں سے تالیف قلوب اور قبائل کو اپنی جانب مائل کرنے اور ان کے ظلم و جور اور بغض وعناد میں کمی کرنے کے مصالح پیش نظر تھے، مثلاً ام المومنین حضرت صفیہ کے نکاح پر غور کیا جائے اس نکاح سے پیشتر مشرکین سے جتنی جنگیں ہوئیں ان میں در پردہ یا کھلے طور پر یہود کا تعلق ضرور ہوتا تھا مگر تزوج صفیہ کے بعد یہود مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔

اسی طرح حضرت ام حبیبہ کے نکاح کا معاملہ ہے کہ ان کے والد ابوسفیان اس نکاح سے پہلے اسلام اور مسلمانوں کے بدترین مخالف اور دشمن تھے، اور حمراء الاسد، بدر صغریٰ اور

احزاب وغیرہ غزوات میں مشرکین کے قائد اور امیر لشکر یہی رہے تھے لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نکاح کے بعد انھوں نے مسلمانوں پر فوج کشی نہیں کی بلکہ نکاح کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خود بھی مسلمان ہو کر آنحضرت کے حلقہ بگوش ہو گئے علاوہ ازیں سارے بنوامیّہ اس رشتہ کا خیال کرنے لگے تھے جس کی بنا پر ان کی عداوت اور اسلام دشمنی میں بیحد کمی ہو گئی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے سیاسی فائدہ کے ساتھ دینی فائدہ بھی ہوا کہ اس نکاح کی خبر حضراتِ صحابہ کو ہوئی تو وہ بیک زبان پکار اٹھے اصھار رسول الله تحت ایدینا حضور...... کے سسرال کے لوگ ہماری قید غلامی میں رہیں؟ اور یک لخت سارے قیدیوں کو آزاد کر دیا قبیلہ بنو مصطلق پر اس سیر چشمی اور شرافت و مروّت کا یہ اثر ہوا کہ پورا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور اس نکاح کی برکت سے دنیا و آخرت دونوں کی ذلّت سے سب کے سب نجات پا گئے، اسی لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں ما رأینا امرأة کانت اعظم برکةً علٰی قومها منها میں نے کسی عورت کو نہیں دیکھا جس کی برکت و منفعت اپنی قوم پر حضرت جویریہ سے زیادہ ہو۔

غرضیکہ کثرتِ ازدواج کے ذریعہ مختلف خاندانوں سے آپ کے تعلقات قائم ہوئے جو آگے چل کر اسلام اور مسلمانوں کی ترقیات کے ذریعہ بنے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کے نکاح میں بنو ہاشم میں سے کوئی عورت نہیں آئی کیونکہ وہ تو اپنا خاندان تھا۔

ان جملہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نکاح کے سلسلہ میں آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لئے نہیں تھا بلکہ اس سے ملک وقوم، اسلام اور عالم انسانیت کے مصالح و مفاد وابستہ اور مربوط تھے جسے نظر انداز کرنا اس ہادی برحق اور مصلح اعظم کے لئے ممکن نہیں تھا جسے رب العالمین نے دنیا میں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔

یارب صل وسلم دائما ابـــدا

علی حبیبك خیر الخلق کلهم

☆ ☆ ☆

ہماری تاریخ کا ایک باب یہ بھی ہے!

(۱) خدام کے آرام وراحت کا خیال

سلطان التمش جس نے ۶۰۷ھ سے ۶۳۳ھ تک نہایت کرّ وفر کے ساتھ ہندوستان میں حکمرانی کی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی المتوفی ۶۳۳ھ اپنے ملفوظات ''فوائد السالکین'' میں اس کے اخلاق حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''التمش صحیح العقیدہ تھا، وہ راتوں کو جاگتا، اگر کبھی اتفاقاً نیند آجاتی تو فوراً بیدار ہوجاتا اور وضو کرتا، اپنے نوکروں چاکروں میں سے کسی کو نہ جگاتا اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو کیوں تکلیف دی جائے۔ رات کو فقیروں کے بھیس میں باہر نکل جاتا۔ اس کے ہاتھ میں اشرفیوں کا تھیلا ہوتا، لوگوں کے دروازوں پر جاتا، انھیں دستک دے کر باہر بلاتا ان کے حالات دریافت کرتا اور ان کی حسب ضرورت مدد کرتا اور قسمیں دے کر ان سے کہتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں نہ ہوں یا ان پر کوئی ظلم وزیادتی کرے تو وہ اس کے دربار کے پاس آکر لٹکی ہوئی زنجیر عدل کو ہلائیں تاکہ وہ حالات سے باخبر ہوکر انصاف کرسکے کیونکہ قیامت کے دن ان کی فریاد کے بار کو اٹھانے کی طاقت اس کے اندر نہیں ہے۔ (فوائد السالکین ص۲۹)

(۲) افشائے راز

شیخ قطب الدین بختیار کاکی نے اپنے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ میری نماز جنازہ ایسا شخص پڑھائے جس میں یہ تین وصف جمع ہوں: (۱) ہمیشہ عفیف رہا ہو کسی غیر محرم پر اس نے کبھی نظر نہ ڈالی ہو (۲) اس کی عصر کی سنتیں قضا نہ ہوئی ہوں (۳) اور ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولیٰ سے شریک رہا ہو۔ نماز جنازہ کے وقت جب اس

وصیت کا اعلان کیا گیا تو کوئی آگے نہیں بڑھا کچھ دیر انتظار کے بعد سلطان التمش یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا کہ میری خواہش تو یہی تھی کہ میرا حال لوگوں سے پوشیدہ رہے لیکن خواجہ نے آج اس راز کو فاش کر دیا۔ (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۷۵)

(۳) بیوی کو صبر کی تلقین

سلطان التمش کا لڑکا سلطان ناصر الدین محمود بھی باپ ہی کی طرح نہایت عابد و زاہد اور درویشانہ صفات کا حامل تھا۔ وہ ۶۴۴ میں تخت نشین ہوا اور بیس سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دیئے وہ اپنے ذاتی مصارف کا بار خزانہ پر بالکل نہیں ڈالتا تھا بلکہ کلام پاک کی کتابت سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا اس لئے اس کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزرتی تھی گھر گرہستی کے کاموں کو انجام دینے کے لئے اس کے محل میں کوئی خادمہ تک نہ تھی ایک روز اس کی ملکہ نے شکایت کے طور پر کہا کہ میں آپ کے لئے روٹی پکاتی ہوں تو میرے ہاتھ جل جاتے ہیں اور ان میں آبلے پڑ جاتے ہیں سلطان ملکہ کی یہ تکلیف سن کر رونے لگا۔ پھر بیوی کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ دنیا گذر جانے والی ہے یہاں اس تکلیف کو برداشت کر کے صبر کرو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کے اجر میں تم کو تمہاری خدمت کے لئے حور عطا فرمائے گا ابھی تو میں تمہارے لئے بیت المال سے کوئی کنیز و خادمہ نہیں خرید سکتا۔ سلطان کی نیک دل بیوی نے درویش شوہر کی رائے سے اتفاق کیا۔ (البدایونی، ج ۱ ص ۹۰)

(۴) احساس دیانت

شاہان بلبن کے بعد جلال الدین فیروز شاہ دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہوا رسم تاجپوشی کے موقع پر دو رکعت شکرانہ کی ادا کرنے کے بعد تخت شاہی پر بیٹھا اور اپنے امراء سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے بار سلطنت اٹھا تو لیا ہے لیکن متحیر ہوں کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر سلطان بلبن کے محل میں گیا جس کا نام ''کوشک لعل'' تھا اس وقت اس کے ساتھ ایک درباری ملک احمد حبیب تھا اس درباری نے سلطان فیروز شاہ سے

کہا کہ اب آپ کو اس دارالامارت میں سکونت اختیار کرنی چاہیے سلطان نے جواب دیا کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے اس کی تعمیر کی تھی اب یہ ان کی اولاد کی ملکیت ہے میرا اس پر حق نہیں ہے۔ ملک احمد حبیب نے کہا کہ امور حکمرانی میں اتنی پابندی کی گنجائش نہیں۔ سلطان نے برجستہ جواب دیا کہ دنیا کے چند روزہ مفاد کی خاطر اسلامی احکام کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور نفس کی پیروی میں کوئی کام انجام نہیں دوں گا۔

(۵) مکارم اخلاق

سلطان بہلول لودی ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ نیک دل سلطان اپنی بادشاہت کے زمانہ میں پانچوں وقت کی نماز جماعت سے ادا کرتا تھا، شریعت کی پابندی کا بے حد خیال رکھتا، لوگوں کی درخواستوں کو خود دیکھتا اور سب کے ساتھ عدل کرتا، دربار میں تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ امراء کو اپنے سامنے کھڑا ہونے دیتا۔ اس کے امیروں یا لشکریوں میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لئے ضرور جاتا۔ اگر کسی کو اس سے رنج پہنچ جاتا تو اس کے پاس جا کر معذرت خواہ ہوتا۔ میدان جنگ میں پہلے دو رکعت نماز پڑھتا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے فلاح کی دعائیں مانگتا پھر جا کر دشمنوں سے مقابلہ کرتا اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلی مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا تو خطیب نے خطبہ پڑھنے کے دوران افغانوں کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ سبحان اللہ! یہ بھی عجیب قوم پیدا ہوئی ہے، شاید یہ دجال کے پیش رو ہوں ان کی زبان یہ ہے کہ ماں کو مور، بھائی کو رور، گاؤں کو شور اور لشکر کو تور کہتے ہیں۔ اپنی قوم کی اس قدر تضحیک کے باوجود سلطان نے مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ خطیب صاحب بس کیجئے ہم لوگ بھی خدا کے بندے ہیں۔ (حکمرانوں کی تو خیر بڑی بات ہے علماء و صلحاء کی جماعت میں بھی حلم و بردباری کی ایسی مثال کم ملے گی) تاریخ داؤدی ص ۱۱۔

پاکبازی

احمد نظام الدین شاہ والیٔ احمد نگر المتوفی ۹۰۴ھ نہایت ہی پاک خصلت اور نیک طینت

فرماں روا تھا۔ وہ جب باہر نکلتا تو راستے میں دائیں بائیں دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں نیچے کئے رہتا۔ ایک بے تکلف امیر نے اسکی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ شہر سے گذرتے وقت میری سواری کا تماشا دیکھنے کیلئے مرد عورت آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ میری نگاہ کسی نامحرم پر پڑ جائے اور اس کا وبال مجھ پر نازل ہو۔ (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰۰)

حق بحق دار رسید

سکندر لودھی کے عہد حکومت میں سنبھل کے علاقہ میں ایک شخص کو پندرہ ہزار اشرفیوں کا ایک دفینہ دستیاب ہوگیا، سنبھل کے حاکم میاں قاسم نے اشرفیوں کو اس شخص سے وصول کر لیا اور سلطان سکندر کے پاس ایک درخواست بھیج کر پوچھا کہ اس دفینہ کے بارے میں کیا حکم ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ پانے والے کو واپس لوٹا دیا جائے حاکم سنبھل نے پھر لکھ کر بھیجا کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔ سلطان نے اس کو لکھا کہ اے احمق جس نے اس شخص کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں کون کس چیز کا مستحق ہے۔ (تاریخ داؤدی ص ۴۲)

خوف آخرت

والئ گجرات سلطان محمود بیگڑہ کا جانشین سلطان مظفر ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ قیامت کے ذکر پر مشتمل آیتوں کو پڑھ کر بے اختیار رونے لگا اور بولا معلوم نہیں اس وقت میرا کیا حال ہوگا۔ اس کے ایک ندیم شیخ جیو نے کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ سے کوئی گناہ کبیرہ نہیں ہوا ہے۔ کثرت عبادت آپ کا مشغلہ ہے، خلق خدا بھی آپ سے خوش ہے توقع ہے کہ آخرت میں آپ کو بلند ترین درجات ملیں گے۔ سلطان نے یہ سن کر کہا شیخ جیو میری گردن پر بار گراں ہے اسی لئے روتا ہوں کیا تم نے پیغمبر آخر الزماں...... کی یہ حدیث نہیں سنی "نجا المخففون وهلك المثقلون" ہلکے پھلکے لوگ نجات پالیں

گے اور جو گراں بار ہے وہ ہلاک ہوگا۔ (مرأۃ سکندری ص ۱۷۰)

انجام کی فکر

سلطان محمود بیگڑہ جس نے ۸۶۲ سے ۹۱۷ تک صوبۂ گجرات میں حکمرانی کی۔ اپنی آخر عمر میں عبادت میں مشغول رہتا اور اکثر روتا رہتا تھا اس کے ایک درباری امیر ملک سارنگ نے سلطان کو برابر روتے ہوئے دیکھ کر ایک دن عرض کیا کہ دولت بھی ہے شہنشاہی بھی ہے پھر رونے کی کیا وجہ ہے؟ سلطان نے کہا اے بے عقل! تم کو کیا بتاؤں مجھے کیا غم کھائے جارہا ہے۔ میرے مرشد شاہ عالم نے اگر چہ میرے لئے دعا فرمائی ہے کہ ”محمود کی عاقبت محمود ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری عاقبت محمود نہ ہو سکے گی۔ عمر کی نہر برابر جاری ہے اور اس سے جو حصہ بہہ جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔ اسی لئے روتا ہوں، افسوس اور حسرت تو اس پر ہے کہ اپنے ولیٔ نعمت کی قدر جتنی جانی چاہئے تھی اتنی نہ جان سکا اور جتنی جانی اس پر عمل نہ کر سکا۔ (مرأۃ سکندری ص ۷۹)

حسن خاتمہ

علاء الدین حسن گانگو المتوفی ۷۵۹ھ جس نے گلبرگہ، احمد آباد اور بیدر میں گیارہ سال تک بڑی کامیاب حکمرانی کی۔ اپنے مرض موت میں ایک دن اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ محمود کو پاس نہ دیکھ کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ بتایا گیا کہ مکتب میں پڑھ رہا ہے۔ حسن گانگو نے صاحبزادہ کو بلوا کر پاس بٹھایا اور پوچھا کہ کیا پڑھ رہے تھے شہزادے نے جواب دیا کہ شیخ سعدی شیرازی کی بوستاں پڑھ رہا تھا۔ گانگو نے پوچھا کون سی حکایت شہزادہ نے کہا وہ حکایت جس میں یہ ہے۔

شندیم کہ جمشید فرخ سرشت — بسر چشمۂ بر بسنگے نوشت
بدیں چشمہ ہو ماں بسے دم زدند — برفتند چوں چشم برہم زدند
گرفتند عالم بمردی وزور — ولیکن نبردند باخود بگور

جس وقت گانگو نے تیسرا شعر سنا تو اس پر بے اختیار گریہ وزاری ہو گیا۔ اور اسی وقت اپنے خزانچی کو بلایا، اور اپنے ذاتی خزانہ کے تمام اثاثے کو نکلوایا اور اپنے بیٹوں کے حوالے کیا کہ انھیں لے جا کر جامع مسجد میں علماء، فقراء، میں تقسیم کر دو۔ شہزادوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور جب تمام تقسیم کر کے باپ کو واپس آکر اس کی اطلاع دی تو حسن گانگو نے کہا ''الحمدللہ'' اور اسی وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (تاریخ فرشتہ ج ا ص ۲۸۱)

☆ ☆ ☆

تاریخ اسپین کا عبرت خیز ورق

''اسپین'' جس پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک اس آن بان کے ساتھ حکومت کی کہ ان کی قوت وعظمت سے پورا براعظم یورپ مبہوت ومتحیر تھا، جس کے شہرو قصبات، مدارس و جامعات کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں سے گہوارہ علم وفن بنے ہوئے تھے، جس کی مسجد ''جامع قرطبہ'' اپنی وسعت اور شان وشوکت کے لحاظ سے عالم اسلامی میں بے نظیر تھی، جس کا ایک چپہ بھی بنجر اور بن کھیتی کا نہ تھا، حتی کہ پہاڑوں پر بھی زراعت ہوتی تھی، جس کی تہذیب وثقافت نے تمام دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا، جس کے ہر شعبۂ زندگی میں آج بھی اسلام کی چھاپ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے، مگر آج وہی اسپین مسلمانوں کے وجود سے خالی ہے، جامع قرطبہ تسبیح وتہلیل کے ترنم سے محروم ہے، تکبیرو توحید کی آواز وادی البرتات سے ٹکرا کر خاموش ہوگئی ہے، اسپین کی المناک تاریخ آج ملت اسلامیہ کو خون کے آنسو رلا رہی ہے اور اسپینی مسلمانوں کی بے مثال تباہی کی داستان سن کر ان کے دل تڑپ اٹھتے ہیں۔

تاریخ اسلامی کے نامور مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی اسپین کی اس تباہی و بربادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں پر یہ مصائب اس لئے نازل ہوئے کہ انھوں نے کلام الٰہی کو پسِ پشت ڈالدیا تھا، جس کی وجہ سے ان میں خودغرضی اورنا اتفاقی پیدا ہوئی، پابندیٔ اسلام کے ترک ہونے کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان سردار اپنے بھائی مسلمان سرداروں کی مخالفت میں عیسائیوں کے پاس جاکر ان سے مدد طلب کرنے میں کوئی باک وتأمل نہ کرتے تھے، مسلمانوں نے خود عیسائیوں کے ہاتھوں خوشی خوشی مسلمانوں کو ذبح کرایا...اندلس کے مسلمانوں نے اپنی

بداعمالیوں سے اپنے آپ کو مغضوب بنالیا تھا، اس لئے ان کو دنیا کے کسی حصہ سے کوئی امداد نہ پہنچی اور کفار کے ہاتھوں سے فجار کو خدائے تعالیٰ نے سزا دلوائی، مسلمان جب کبھی اور جہاں کہیں دینِ اسلام سے غافل اورقرآن سے بے تعلق ہوئے ان پر ایسی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں۔'' (تاریخ اسلام ج ۳ ص ۲۷۴)

طوائف الملوکی اوراس کے منفی اثرات

اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اسپینی امراء رقابت وثروت میں مخمور ہوکر اسلامی تعلیمات کے علی الرغم عیش ونشاط، سرود ورباب کے دلدادہ ہوگئے، اسلامی اخوت ومحبت کے بجائے ان کے اندر خودغرضی اور اقتدار کی ہوس نے جڑ پکڑلی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۲۲ھ سے وہاں طوائف الملو کی شروع ہوگئی اور اسپین چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہوگیا، قرطبہ اشبیلیہ، غرناطہ، بلنشیہ، مالقا وغیرہ شہروں میں ان ریاستوں کے دارالحکومت قائم ہوگئے، ان ریاستوں میں آئے دن اقتدار کی جنگ ہونے لگی، عیسائی سلاطین نے مسلمانوں کی اس خانہ جنگی سے بھرپور فائدہ اٹھایا کبھی ایک ریاست کو مدد پہنچاکر اور کبھی دوسری ریاست کو کمک دے کر انھیں لڑالڑا کر بالکل بیدم کردیا تو پھر اپنا دست ستم بڑھایا۔ مسلمان چونکہ اپنی ساری توانائی باہمی جنگوں میں اپنے ہاتھوں برباد کرچکے تھے، اس لئے وہ عیسائی حملہ کا مقابلہ نہ کرسکے، وہ ایک ایک کرکے سارے شہروں پر قابض ومتصرف ہوگئے، مسلمانوں کا آخری سہارا صرف غرناطہ رہ گیا تھا جو اب تک عیسائیوں کے دست ستم سے محفوظ تھا، ۱۲/ جمادی الآخر ۸۹۶ھ کو قسطلہ کے عیسائی حکمراں فردی نند نے ایک مسلم امیر زغل کی ناعاقبت اندیشیوں سے فائدہ اٹھاکر ایک لاکھ فوج سے غرناطہ کا محاصرہ کرلیا، یہ محاصرہ تقریباً آٹھ ماہ تک جاری رہا، سپہ سالار اعظم موسیٰ غسّانی اور دیگر حکام میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے مگر سلطان ابوعبداللہ ہمت ہار چکا تھا اس لئے سپہ سالار کی رائے کے برعکس خفیہ طور پر اپنے وزیر کو فردی نند کے پاس بھیج کر صلح کی پیش کش کی، فردی نند اوراس کے سپاہی محاصرہ کی طوالت سے اکتا چکے تھے، اس غیر متوقع

پیش کش کو انھوں نے فوراً قبول کرلیا چنانچہ جانبین کی منظوری سے صلح نامہ تیار ہوا جس کی اہم دفعات یہ تھیں۔

(۱) کسی مسلمان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، مسلمانوں کو اختیار ہوگا چاہے غرناطہ میں رہیں یا اور کہیں چلے جائیں۔

(۲) مسلمانوں کے معاملات میں عیسائی مداخلت نہیں کریں گے۔

(۳) عیسائی مسجدوں میں داخل نہیں ہوں گے۔

(۴) مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے۔

(۵) مسلمانوں کے معاملات کا تصفیہ شریعت اسلامی کے موافق مسلم قاضی کریں گے۔

(۶) جو عیسائی مسلمان ہوگئے ہیں انھیں ترک اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۷) سلطان ابوعبداللہ کے سپرد البشرات کی حکومت کردی جائے گی۔

(۸) آج سے ساٹھ دن کے اندر قلعہ الحمراء توپ خانہ وغیرہ دیگر اسلحے جو اس وقت قلعہ میں موجود ہیں عیسائیوں کے حوالہ کردیا جائے گا۔

(۹) شہر غرناطہ ایک سال تک آزاد رہے گا، سال بھر کے بعد شرائط بالا ملحوظ رکھتے ہوئے عیسائی اس پر قابض ہوں گے۔

(۱۰) طرفین کے قیدی رہا کردیئے جائیں گے۔

اس صلح نامہ پر یکم ربیع الاوّل ۸۹۷ھ مطابق ۳ رجنوری ۱۴۹۲÷ کو فریقین کے دستخط ہوئے۔

قلعہ الحمراء پر قابض ہوتے ہی ''فردی ننڈ'' نے صلح نامہ کی ساری شرطیں یک لخت فراموش کردیں، شہر غرناطہ پر اپنا مکمل تسلط قائم کرلیا، ابوعبداللہ سلطان کو البشرات سے بیدخل ہونے پر مجبور کردیا۔

مختلف مسلم جماعتیں اور ان کا انجام

اسپین میں آباد مسلمانوں کی مختلف جماعتیں تھیں: (۱) خالص عربی النسل، جو عام

طور پر شام، یمن، حجاز اور حضر موت سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔(۲) خالص بربری، ان کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، (۳) مولدین یعنی وہ لوگ جن کے باپ عرب یا بربر تھے اور مائیں اسپینی تھیں (۴) نومسلم یعنی وہ عیسائی جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کی اولاد بھی نومسلم ہی کہلاتی تھی۔

سقوط غرناطہ کے وقت عام طور پر عربی النسل اور بربری مسلمان اسپین چھوڑ کر تیونس، مراکش وغیرہ ملکوں میں چلے گئے، جنھیں بس اتنی اجازت دی گئی کہ صرف اپنی جان لے کر چلے جائیں مال واسباب ساتھ لے جانے کی قطعی اجازت نہیں تھی، ان ہجرت کرنے والوں میں بھی بہت سارے عیسائی لٹیروں کے ہاتھوں راستے ہی میں شہید ہو گئے۔

کچھ بچے کھچے عربی جنھوں نے ترک وطن کو گوارہ نہیں کیا وہ اسپین ہی میں رہ گئے انھیں حملہ آور اور غیر ملکی جیسے نفرت آمیز ناموں سے یاد کیا جاتا تھا، تیسری اور چوتھی جماعت کے مسلمانوں نے عام طور پر اسپین ہی میں رہنے کو ترجیح دی، کیونکہ انھیں ''فردی نند'' کے اس اعلان پر اعتماد تھا کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔

غرناطہ پر تسلط مکمل ہو جانے کے بعد اسپین سے مسلمانوں کو تاخت وتاراج اور نیست ونابود کرنے کی غرض سے درج ذیل ظالمانہ ومنافقانہ طریقے اختیار کئے گئے:

(۱) مسلم عدالتیں توڑ کر عیسائی عدالتیں قائم کی گئیں جن میں ہر روز ہزاروں مسلمان پیش کئے جاتے اور ان پر جھوٹے جھوٹے الزامات عائد کر کے آگ میں جلا دیا جاتا۔

(۲) مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی کا سلسلہ شروع کیا گیا کہ یہ لوگ ہتھیار جمع کرتے ہیں اور خفیہ طور پر حکومت کے خلاف اسکیمیں بناتے ہیں۔

(۳) عیسائیوں کی جانب سے مسلمانوں پر حملے کئے جاتے جن میں قتل وغارت گری کے علاوہ ان کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا جاتا، حملوں کا یہ سلسلہ ختم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہا اور اسپین کا کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں کے مسلمانوں کی جان ومال تباہ نہ کی گئی ہو۔

(۴) عربی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی۔

(۵) پورے ملک میں یہ پابندی لگادی گئی کہ مسلمان اپنا کوئی بڑا تعلیمی ادارہ قائم نہیں کرسکتے۔

(۶) غلط تاریخیں مرتب کرائی گئیں جن میں مسلمانوں کو ظالم و غاصب اوران کے عہد حکومت کو دورغلامی سے تعبیر کیا گیا، مسلم حکمرانوں نے اسپین کی تہذیب وترقی سے متعلق جو گراں قدر کارنامے انجام دیئے تھے انھیں تاریخ کے صفحات سے یاتو خارج کردیا گیا یا اسے بے حیثیت کرکے بیان کیا گیا۔

(۷) خالص اسپینی مسلمانوں کو پھر سے عیسائی بنانے کی مہم شروع کی گئی، ان سے کہا جاتا کہ تمہارے آباؤ اجداد کو عربوں نے بجبر و اکراہ مسلمان بنالیا تھا، اب تم آزاد ہو، اس لئے اپنے اصلی مذہب کی طرف واپس آجاؤ۔

(۸) بعض مسلمانوں کو زبردستی بپتسمہ دیا جاتا اوران کے لڑکوں کو عیسائی بنالیا جاتا۔

(۹) بڑے بڑے اجتماعات کئے جاتے جن میں فرضی طور پر کچھ لوگوں کو اسٹیج پر پیش کیا جاتا کہ یہ مسلمان تھے مگر انھوں نے برضا ورغبت اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرلی ہے، پھران کا خوب اعزاز واعلان کیا جاتا۔

(۱۰) مختلف حیلوں وتدبیروں کے ذریعہ مسلم عوام کو علماء وشرفاء سے بدظن کرکے ان میں بعد اور تفریق پیدا کردی گئی۔

(۱۱) شرعی طریقہ کے برخلاف نکاح کے لئے سرکاری عدالتوں میں رجسٹرڈ کرانے کو لازم قرار دیدیا گیا۔

جبری عیسائی بنانے کا روح فرسا اقدام

ان ہمت شکن حالات میں بھی اسپینی مسلمان اپنے دین ومذہب کو سینے سے لگائے رہے اوراپنی نسلوں میں دین کو باقی وزندہ رکھنے کا یہ نظم کیا کہ گھروں اور مسجدوں میں بچوں کی دینی تعلیم کا نظم اپنے طور پر کیا، لیکن یہ سلسلہ تادیر قائم نہ رہ سکا، ۹۰۴ھ میں یہ اعلانِ عام کیا گیا کہ مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کرلیں، ورنہ انھیں قتل کردیا جائے گا،

اس اعلان پر مسلمانوں کا ایک طبقہ ملک بدر ہونے کے لئے تیار ہو گیا، فردی نند نے انھیں افریقہ چلے جانے کی اجازت دیدی اور ان کے ساتھ بظاہر یہ کرم کا معاملہ کیا کہ جہاز بھی فراہم کر دیئے گئے مگر عیسائیوں نے ان جہازوں کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی غرق کر دیا، اور سارے مہاجرین مع اہل وعیال اور قیمتی کتب خانوں کے ہمیشہ کے لئے تہہ آب آسودۂ خواب ہو گئے، اور بقیہ سارے مسلمانوں نے شہروں اور آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کو اپنا ملجا اور جائے پناہ بنالی، ہر نوع کی اذیتیں برداشت کیں مگر اسلام کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، ان پہاڑوں میں پناہ گزیں مجبوروں کو بھی عیسائی حکومت نے برداشت نہیں کیا، ان کی گرفتاری وقتل کا سلسلہ برابر جاری رہا، کبھی جب دس بیس پناہ گزیں اکٹھا ہوتے تو مقابلہ کی بھی نوبت آجاتی اور بہادرانہ لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے، بعض اندلس کے شمالی پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور بے سروسامانی کی حالت میں ہلاک ہو گئے، ان میں سے بعض بچ کر یورپ کے ملکوں کو طے کر کے ملک شام پہنچے، ان مرنے والوں کے بچوں کو عیسائیوں نے اپنے قبضہ میں لے کر عیسائی بنالیا، اس طرح ملک فرانس کے جنوبی اور ملک اسپین کے شمالی حصوں میں عربی النسل خاندانوں کے وجود کا امکان مؤرخین نے تسلیم کیا ہے، اسی بناء پر نپولین کو بعض لوگ عربی النسل لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اپنی کوئی تنظیم یا ادارہ موجود نہیں تھا جو ان حالات میں ان کی صحیح رہنمائی ودستگیری کرتا، باشعور، عزیمت پسند افراد بھی باقی نہ بچے تھے جو حالات کے رخ کو موڑنے کی فکر کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں کے عرصہ میں قسم کھانے کو بھی سرزمین اسپین میں خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہا، سب ہی کو مختلف ہلاکت خیز طریقوں سے موت کی نیند سلا دیا گیا، اگر کچھ ان ہلاکت خیزیوں سے کسی طرح محفوظ رہ گئے تو اپنی جان بچا کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

درس عبرت

واقعات ومشاہدات گواہ ہیں کہ سرزمین ہند میں بھی ہندو احیاء پرست طاقتیں اسپین

کی تاریخ دہرانا چاہتی ہیں۔

(۱) وہی فرقہ وارانہ فساد کی تکنیک ہے جس پر آزادی کے وقت ہی سے عملدرآمد ہورہا ہے اور کمی کے بجائے اس میں دن بدن ترقی ہوتی جارہی ہے اور چند سالوں سے حکومت کی صوبائی پولیس ان فسادیوں کے ہراول دستے کی خدمت انجام دینے لگی ہیں۔

(۲) مسلمانوں کو ظالم وغاصب ثابت کرنے کی غرض سے تاریخوں میں تحریف اور ردوبدل کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔

(۳) مسلمانوں کے دین و مذہب پر برابر حملے کئے جارہے ہیں، کبھی مسلم پرسنل لا کو تبدیل کردینے کی باتیں کی جاتی ہیں، اور کبھی مسلمانوں کی مقدس کتاب پر پابندی عائد کرانے کی سعی کی جاتی ہے۔

(۴) مسلمانوں کے مذہبی وتاریخی آثار کو سرزمین ہند سے مٹادینے کی تشدّد آمیز تحریک جاری ہے، بابری مسجد اور ملک کی سیکڑوں مساجد ومقابر اس جارحانہ تحریک کا نشانہ بن چکی ہیں۔

(۵) مسلم عوام اور ان کے دینی وملّی رہنماؤں کے درمیان تفریق قائم کردینے کی مؤثر جدوجہد ہورہی ہے، اور اپنی غفلت شعاری سے یا مفاد پرستی سے بعض مسلمان بھی اس خطرناک سازش کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور اس خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں اپنا زور قلم صرف کررہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی.

(۶) بعض علاقوں میں دین سے ناواقف مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔

ایک طرف تو اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہند سے مٹادینے کی یہ منظّم سازشیں اور مسلسل کوششیں ہیں کہ تمام ہندواحیاء پرست پارٹیاں متحد ہوکر ہمارے آثار وروایات کو محو کردینے پر تلی ہیں، دوسری طرف ہم ہیں کہ اپنی غفلت شعاریوں اور راحت کوشیوں کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، دشمن مجتمع ہوکر حملے پر حملے کئے جارہا ہے مگر ہماری صفوں میں انتشار وتفرقہ ہے اور خود اپنوں ہی کے دست و بازو کو ناکارہ بنانے میں ہم مصروف

ہیں، حوادث و مصائب کے طوفان بار بار آ کر ہمیں دستک دے رہے ہیں مگر ہم پر ایسی شدید نیند طاری ہے کہ آنکھ کھلتی ہی نہیں، غنیم ہر چہار طرف سے ہمیں نرغے میں لینے کی تیاریاں مکمل کر چکا ہے، لیکن ہم اپنے اپنے مخصوص دائروں میں اس طرح محصور ہیں کہ ملت کے وسیع تر مفاد کے متعلق غور و فکر کی ہمیں فرصت ہی نہیں، رہنمایان ملت اور علمائے دین، ولی اللّٰہی تحریک دعوت واصلاح کو چھوڑ کر اپنے زاویوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں حالانکہ طاغوتی طاقتیں منبر و محراب اور مدرسہ و خانقاہ پر کمندیں ڈال رہی ہیں، امداد و ضامن کے فرزندو اور قاسم و رشید کے درس حکمت و عزیمت کے پاسبانو! بابری مسجد کی زمیں بوس دیواریں تمھیں آواز دے رہی ہیں، شیخ الہند کی غیرت و حمیت اور حضرت مدنیؒ کی شجاعت و استقامت کے وارثو! مظلوم شہیدوں کا بہتا ہوا خون اور سلگتا ہوا جسم تمھیں دعوت حرکت و عمل دے رہا ہے حضرت مجدد الف ثانی کے اس ارشاد گرامی پر ذرا غور کرو تمھیں کیا سبق دے رہا ہے۔ ''ہر چند سلامتی درزاویہ است اما دولتِ شہادت درمعرکہ است، کنج زاویہ با اہل ستر و ارباب ضعف مناسب است، کارمرداں اقویا مبارزت و معرکۂ کبریٰ است'' کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دنیا کی اور قومیں ہمارے لئے وسیلۂ عبرت تھیں مگر آج خود ہمارے ادبار و زوال کی حکایت اوروں کے لئے مثال عبرت ہے۔

انسان کی تمام اندرونی قوتیں اور جذبات خارجی محرکات کے محتاج ہوتے ہیں، ان کی مثال سوئے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے جو اگرچہ زندہ ہے مگر حرکت کے لئے کسی بیدارکن صدا کا محتاج ہے، آج کے واقعات و حادثات ہماری تنبیہ اور غفلت شکنی کے لئے ہیں، وقت نے صدائے رحیل بلند کر دی ہے، اسے محسوس کیجئے اور حرکت و عمل کیلئے تیار ہو جایئے خدانخواستہ اگر ہم آج بھی خوابِ غفلت میں پڑے سوتے رہے، تو باور کیجئے زمانہ پھر اٹھنے کا موقع نہیں دے گا انقلاب و تغیر کی اہمیت و نزاکت کو خدارا نظر انداز نہ کیجئے، سوچنے اور غور و فکر کرنے کا وقت یہی ہے، ضرورت ہے کہ کمال حزم و احتیاط کے ساتھ آئندہ اقدامات کا ایک نقشہ مرتب ہو، اگر یہ وقت محض اخبار کی قلم فرسائیوں اور تقریر کی طلسم طرازیوں میں ضائع کر دیا گیا تو یاد رکھئے قدرت اپنی بخششوں میں جس قدر فیاض

ہے اتنی ہی غافلوں کی تعذیب میں شدید ہے۔

تنظیم ملت کے چند اصول

ابتدائی مراحل میں بغیر کسی تاخیر کے درج ذیل کاموں کو پورے ولولہ اور حوصلہ مندی کے ساتھ انجام دیا جائے۔

(۱) باہمی یگانگت اور اتحاد و بھائی چارگی کو ترقی دی جائے، تمام جھگڑوں اور اختلافوں کو دور کیا جائے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے درد وغم میں شریک ہو جائے۔ اور یہ حقیقت لوگوں کے دلوں میں نقش کر دی جائے کہ مسلمانوں کی کسی معصیت نے ان کو اس قدر نقصان نہیں پہنچایا ہے جس قدر باہم اختلاف اور تفرقہ نے اور کوئی چیز ان کو اس قدر نفع نہیں پہنچا سکتی جس قدر یہ چیز کہ سب مل کر ایک اور بھائی بھائی ہو جائیں۔

(۲) مسلمانوں کی عملی زندگی بالکل تباہ ہو چکی ہے اس لئے ضروری ہے کہ احکام شرع کے احترام و اتباع کا مردہ جذبہ پھر از سر نو زندہ کر دیا جائے، اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ لوگوں کے دل اللہ اور اس کی شریعت کے حکموں کے آگے سربسجود ہو جائیں۔

(۳) مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ بیکاری ایک شرعی و ملی معصیت ہے اس لئے کسی مسلمان کو اپنی زندگی بیکار نہیں کاٹنی چاہئے۔

(۴) تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جائے بالخصوص مذہبی تعلیم سے ایک مسلمان بچہ بھی محروم نہ رہنے پائے۔

(۵) تمام منہیات و منکرات مثلاً شراب، جوا، گانا، باجا، سنیما، ٹی وی، وی سی آر، جھوٹ، غیبت، فحش کاری سے مسلم معاشرہ کو پاک کیا جائے۔

(۶) نماز با جماعت کے قیام پر زور دیا جائے اور اس سرگرمی سے اس کا ولولہ پیدا کر دیا جائے کہ ایک مسلمان بھی بے نمازی نظر نہ آئے، اس کے لئے ہر گاؤں اور محلّہ میں

دو، دو، تین تین افراد پر مشتمل ایک ذمہ دار مجلس بنائی جائے جو پورے محلّہ کے اتفاق واتحاد کے ساتھ لوگوں کو نمازی بنانے کی جد وجہد کرے۔

(۷) مساجد کی حسب ضرورت اصلاح ومرمت، توسیع وتعمیر کی جائے اور انھیں خوب آباد رکھا جائے۔

(۸) حفاظت خود اختیاری کے لئے ہر گاؤں اور محلّہ میں ایک جماعت ہمیشہ موجود رہے۔

(۹) افواہوں اور اشتعال انگیزیوں پر صبر وسکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور فتنہ وفساد کو صلح وآشتی کے ساتھ دفع کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے بصورت دیگر اپنے جان ومال کی حفاظت کے لئے فسادیوں کی مدافعت ہمت وجرأت کے ساتھ کی جائے۔

(۱۰) اپنے ہم سایہ دیگر برادریوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے جائیں، ان کے ساتھ رواداری، حسن اخلاق، اچھے سلوک اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔

اگر ان اصول پر عمل کرتے ہوئے استقلال وپامردی کے ساتھ ہمارے قدم بڑھتے رہے تو انشاء اللہ مصائب کے بادل چھٹ جائیں گے، مشکلات دور ہوجائیں گی، حق وصداقت کا غلبہ اور عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا، ظلم پیشہ طاقتیں سرنگوں اور طاغوتی ظلمتیں کافور ہوجائیں گی۔

جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا.

☆ ☆ ☆

اجودھیا کی تاریخی حیثیت

اجودھیا ہندوستان کا ایک قدیم شہر ہے جو فیض آباد شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد ہے۔

اجودھیا کی قدامت

اجودھیا کا سب سے قدیم ذکر والمیک کی رزمیہ نظم رامائن میں ملتا ہے، والمیک کے اس تذکرہ کا خلاصہ یہ ہے۔

> ''قدیم زمانہ میں ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو (گھاگھرا) کے کنارے واقع تھی اس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منو نے آباد کیا تھا (منو انسان کے ابوالآباء کو کہتے ہیں) اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابلِ عبور خندق اس کی حفاظت کا سامان تھے، یہاں ایسے ایسے آلاتِ حرب موجود تھے جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل اور بہت سی منزل در منزل عمارتیں اس کی رونق تھیں، یہ تھا اجودھیا کا وہ شہر جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔(۱)

لیکن والمیک کے اس بیان کو عصر حاضر کے غیر مسلم دانشور بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے چنانچہ سروپلّی گوپال، رومیلا تھاپر، بپن چندر، ایس بھٹا چاریہ، سویرا جیسوال، ہربنس مکھیا، کے این پنیکر، اَرچمیک لکشمی، ستیش اگروال، بی ٹی چٹو اپادھیائے، آرین ورما، کے

(۱) رامائن از گرفتھ کتاب اباب ۵ ا شلوک ۵ بحوالہ معارف اعظم گڈھ ۳ جلد ۲۹ ص ۹ ۷ ا مقالہ بعنوان رامائن پر ایک نظر۔

میناکشی، دلباغ سنگھ، مردولا مکھر جی، مادھون پلات، آدتیہ مکر جی، ایس ایف رتنا گر، نیلادری بھٹاچاریہ، کے کے ترپویدی، یوکیس شرما، کنال چکرورتی، بھگوان سنگھ جوش، راجن گرو کل، ہیمان شوری۔ پورے دو درجن تاریخ کے اسکالروں نے متفقہ طور پر والمیک کے اس بیان پر درج ذیل تنقید کی ہے۔

''والمیکی رامائن کے مطابق ایودھیا کے ''راجہ رام'' کلیگ شروع ہونے سے ہزاروں سال پہلے ترتیا یگ میں پیدا ہوئے تھے، کلیگ ۳۱۰۲ ق م میں شروع ہوتا ہے اس زمانہ میں آثار قدیمہ کی رو سے ایودھیا آباد ہی نہیں تھا، یہاں سب سے پرانی ممکن بستی آٹھویں صدی قبل مسیح میں تھی، والمیکی رامائن میں بیان کئے گئے طرز زندگی کے برخلاف اس زمانے میں رہن سہن خاصا معمولی اور سادہ تھا، والمیکی میں اعلیٰ شہری زندگی، شاہی محلات اور عمارتوں کا ذکر ہے جن کیلئے آٹھویں صدی قبل مسیح کے آثار قدیمہ سے کسی طرح کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔'' (۱)

ایک اور ہندو محقق و مورخ ڈاکٹر آر ایل شکلا پروفیسر دہلی یونیورسٹی یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

''بعض مؤرخین رامائن میں بیان کئے گئے ''رام'' کو حقیقی کردار مانتے ہیں، یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مانتے ہیں....اگر ہم اس تحقیق کو مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئیں اسی مقصد کے تحت تین مقامات کی کھدائی ہوئی (۱) ضلع فیض آباد میں اجودھیا کی (۲) الہٰ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال میں واقع شرنگویر پور کی (۳) اور الہٰ آباد میں واقع بھاردواج آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پیشتر ہوئی تھی، اس وقت وہاں آبادی کی علامتیں عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ سو سال پہلے کی نہیں ملی تھی، اور اب سے

(۱) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال۔ روزنامہ قومی آواز دہلی ۶ نومبر ۱۹۹۰÷

تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (اجودھیا) کی کھدائی ہوئی، اس کھدائی سے بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے زیادہ سے زیادہ سات سو سال قبل کی آبادی کے آثار پائے گئے (اس سے پہلے کے نہیں) اب اگر یہ مان لیا جائے کہ موجودہ اجودھیا ہی رام جی کی نگری تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کی آبادی کے زمانے کی تطبیق کیوں نہیں ہوتی کیونکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے کم از کم ڈھائی ہزار سال پہلے کا بتایا جاتا ہے، اس تحقیق کے اعتبار سے موجودہ اجودھیا رام جی کی بھومی نہیں ہوسکتا۔'' (۱)

ڈاکٹر شکلا اسی مقالہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''والمیکی رامائن کے مطابق کوسل کا پایہ تخت اجودھیا سرجوندی (دریائے گھاگھرا) کے داہنی سمت ڈیڑھ یوجن (ساڑھے تیرہ میل) کے فاصلے پر سرجو سے پورب میں تھا جب کہ آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پچھّم طرف واقع ہے، والمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا کا تعلق رام جی کے اجودھیا سے قائم نہیں ہوتا۔''

والمیک کی اس روایت کے بالمقابل بعض مسلم تاریخ نویسوں نے شہر اجودھیا کا تعلق ابوالبشر آدم علیہ السلام کے حقیقی وصلبی بیٹے حضرت شیث علیہ السلام سے جوڑا ہے اور لکھتے ہیں کہ اجودھیا کے اولین بانی حضرت شیث علیہ السلام ہیں، اور بہت سے مؤرخین نے حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن اجودھیا ہی کو قرار دیا ہے، چنانچہ آپ کے نام سے منسوب ایک قبر اجودھیا میں آج بھی موجود ہے جس کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں ذکر کی گئی ہے، لیکن آثار قدیمہ کی اس جدید تحقیق کی رو سے یہ روایت بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

اجودھیا کے متعلق ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ ترتیا یگ کے بعد اجودھیا گم ہوگیا تھا جس کو وکرمادتیہ نے دوبارہ دریافت کیا، اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) مقالہ رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ، شائع شدہ ایٹک سنواد ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ص ۱۲

''وکرما دتیہ کو جب اجودھیا کی جستجو ہوئی تو انھیں کسی ذریعہ سے پتہ چلا کہ تیرتھوں کے حکمراں پریاگ کو اجودھیا کے جائے وقوع کا علم ہے چنانچہ وکرما ان کی خدمت میں پہنچے اوران سے اجودھیا کے جائے وقوع کے بارے میں معلومات چاہی، پریاگ نے انھیں اس مقام کی نشاندہی کردی جہاں پہلے اجودھیا واقع تھا، لیکن پریاگ سے صحیح پتہ معلوم کرلینے کے باوجود وکرما اجودھیا کو پا نہیں سکے تو انھوں نے ایک یوگی سے رجوع کیا، یوگی نے ان سے کہا کہ وہ ایک گائے اور ایک بچھڑی کو کھلے مہار آزاد چھوڑ دیں جس جگہ پہنچ کر بچھڑی کے تھن سے دودھ ٹپکنے لگے وہی اجودھیا ہوگا، وکرما نے یوگی کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا اور اجودھیا کے پالینے میں کامیاب ہوگیا۔(۱)

اس روایت کی تمام تر بنیاد مذہبی خوش اعتقادی پر ہے، جس کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ عصر جدید کے ہندو مؤرخین جنھوں نے مذہبی خوش عقیدگی کے بجائے تاریخی دلائل وشواہد پر اپنی تحقیق و بحث کی بنیاد رکھی ہے وہ والمیکی میں مذکور اجودھیا کو ایک شاعرانہ تخیل سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیتے۔

اجودھیا کی شناخت

موجودہ اجودھیا کی شناخت تاریخی لحاظ سے پانچویں صدی عیسوی سے ہوئی ہے، اس سلسلے میں تاریخ نے اپنے صفحات میں جو تفصیلات محفوظ کی ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان کے راجہ سکند گپت جس کی راجدھانی سکیٹہ یا ساکا (موجودہ ساکیت) تھی اپنے بعض سیاسی مصالح کے پیش نظر اس کا نام تبدیل کر کے اسے اجودھیا سے موسوم کردیا تھا، اجودھیا سے ملحق ساکیت نام کی ایک آبادی آج بھی موجود ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سکیٹہ اجودھیا بن جانے کے باوجود ایک حد تک باقی رہا، اسی کے ساتھ سکّوں میں اپنا اصلی نام کندہ کرانے کے بجائے جدید نام وکرماجیت کندہ کرایا، بہت سے مؤرخین کا خیال

(۱) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز ۶/نومبر ۱۹۹۰ء

ہے کہ ان جذبات طرازیوں سے اس کا مقصد سور یہ ونسی راجوں کا وقار حاصل کرنا تھا کیونکہ راجہ رام چندر جی کے بارے میں یہی روایت ہے کہ وہ سور یہ ونسی (سورج بنسی) تھے، یہ سکند گپت (الملقب بہ وکر ماجیت) خود سانکیہ دھرم کا پیرو تھا اور بعد میں بدھ مت کا معتقد ہو گیا تھا، رام جی سے اسے کوئی مذہبی عقیدت نہیں تھی۔

سکند گپت (وکر ماجیت) کے بارے میں کیننگھم نے لکھا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مت کے پیروؤں کا دشمن تھا، لیکن کیننگھم کی یہ سنی سنائی بات درست نہیں ہے کیونکہ ونسنٹ اے اسمتھ نے اپنی مختصر تاریخ ہند میں تاریخی حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ اولاً سانکیہ دھرم کا پیرو تھا، بعد میں ایک بدھسٹ عالم کی تبلیغ سے بودھ مت کا معتقد ہو گیا، اسمتھ لکھتا ہے۔

> ''۵۵۰÷ کے قریبی زمانہ میں بودھ مذہب کے ایک زبردست عالم ''بسو بندھو'' کی سوانح عمری ''پرمارتھ'' نامی عالم نے لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ اجودھیا کا راجہ بکر ماجیت (سکند گپت) جو سانکیہ کے فلسفہ کا پیرو تھا اس کو ''بسو بندھو'' نے بودھ مت کا معتقد بنالیا تھا، یہ سوانح عمری چینی زبان میں محفوظ رہ گئی ہے''۔(۱)

عہدِ وسطیٰ کی تاریخی تصنیفات میں اجودھیا کا ذکر

مسلم دورِ حکومت میں لکھی گئی تاریخوں میں اجودھیا کا قدرے مفصل ذکر شہنشاہ اکبر کے درباری فاضل علامہ ابوالفضل متوفی ۱۰۱۱÷ نے اپنی فاضلانہ تصنیف آئین اکبری میں کیا ہے ابوالفضل نے بھی عوامی روایتوں ہی کے بیان پر اکتفاء کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> اودھ از بزرگ شہر ہائے ہند طول صد و ہژدہ درجہ و شش دقیقہ عرض بست و ہفت درجہ و بیست دو دقیقہ پیش زماں دراز صد و چہل دہشت کردہ و پہنا سی و شش آباد بود از گزیں معابد باستان برشمارند بسواد شہر خاک بیزی کنند وطلا

(۱) مقدمہ تاریخ ہند، اکبر شاہ نجیب آبادی ج ا ص ۱۷۸۔

برگیرند بنگاہ راجہ رام چندر بود در دور تر تیا فرماں روائی معنوی باتخت نشینی صوری فراہم داشت یک کروے شہر دریائے گھگھر بدریائے سرو پیوستہ پایاں قلعہ بگذرد، نزد ایں شہر دو قبر بزرگ ساختہ اند شش و ہفت گزی عامہ خوابگاہ شیث و ایوب پیغمبر پندارند و بوئے افسانہا برخوانند۔(۱)

اودھ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہے اس کا طول البلد ایک سو اٹھارہ درجہ چھ دقیقہ اور عرض البلد ۲۷ درجہ بائیس دقیقہ ہے، قدیم زمانہ میں اس کی آبادی ایک سو اڑتالیس کوس لمبائی میں اور چھتیس کوس چوڑائی میں تھی، یہ ہندوستان کی بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے، اطراف شہر میں زمین کھودنے سے سونا نکلتا ہے یہ شہر راجہ رام چندر کا مسکن تھا جو تر تیا دور میں ظاہری و باطنی ریاست کے حامل تھے، شہر سے ایک کوس کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا دریائے سرجو سے مل گیا ہے، اور قلعہ (سلطان سکندر لودھی کا تعمیر کردہ قلعہ جو اب دریا برد ہو چکا ہے) کے پاس سے گذرتا ہے، شہر کے نزدیک چھ سات گز لمبی دو قبریں ہیں جنھیں عوام شیثؑ اور ایوبؑ پیغمبر کا مدفن بتاتے ہیں، اور ان کے متعلق عجیب و غریب قصے سناتے ہیں۔

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ اجودھیا کے متعلق یہ درج کیا ہے۔

اجودھیا (بفتح ہمزہ وضم مجہول جیم وسکون واؤ وکسر دال وہائے خفی ویائے تحتانی والف) بہ اودھ مشہور از مشرق تا چہل کردہ معبد شمرند واز شمال تا جنوب بیست کردہ درنہم شکل پچھ ماہ چیت ہنگامہ پرستش فراہم آید۔‘‘(۲)

اجودھیا جو اودھ سے مشہور ہے پورب جانب سے چالیس کوس اور دکھن سے اتر بیس کوس کے علاقہ کو متبرک شمار کرتے ہیں، چیت کی نویں تاریخ کو یہاں مذہبی میلہ ہوتا ہے۔

(۱) آئین اکبری ج۲ص۷۸۔

(۲) آئین اکبری ج۲ص۷۸۔

الگزنڈر کیننگھم کی رپورٹ

اجودھیا سے متعلق سب سے مفصل وہ رپورٹ ہے جو الگزنڈر کیننگھم نے ۱۸۷۱÷ میں مرتب کی تھی، اس میں مندرج بعض باتیں قطعی طور پر غلط اور فسادانگیزی پر مبنی ہیں، پھر بھی اجودھیا کے بارے میں اب تک اس سے زیادہ معلومات افزا تحریر نہیں لکھی گئی ہے، ۱۸۵۷÷ میں جب ہندوستان پر انگریزی حکومت کا تسلط مستحکم ہوگیا تو اپنے سامراجی مقاصد کے تحت حکومت نے جہاں بہت سے کام انجام دیئے وہاں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم کر کے ان پر کتابیں لکھوانی شروع کیں اور ہر ضلع کے گزیٹر بھی مرتب کرائے، بظاہر یہ کام بہت مفید دکھائی دیا مگر ان میں جو زہر بھرا گیا اس سے عام طور پر لوگ بے خبر رہے، الگزنڈر کننگھم ہندوستانی آثار قدیمہ کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، اس کی رپورٹیں آج تک تحقیقی و تاریخی کاموں کے لئے ناگزیر سمجھی جاتی ہیں، کیننگھم نے اپنی رپورٹ کی جلد اوّل میں اجودھیا پر جو باب لکھا ہے اس موقع پر اس کے کچھ ضروری اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں۔

’’چینی سیاح ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ گوتم بدھ وساکا میں چھ سال رہے یہ سرسوتی کے جنوب میں کچھ فاصلہ پر تھا، میرے خیال میں وساکا اور ساکیت دونوں ایک ہی جگہیں ہیں۔‘‘

اس کے بعد وہ اجودھیا کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

’’اجودھیا کا موجودہ شہر پرانے شہر کے اتر پورب میں واقع ہے، لمبائی میں دو میل ہے اور پون میل چوڑا ہے، لیکن اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر میں زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتی ہیں، منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے ہیں جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں میں پائے جاتے ہیں، کوڑے کرکٹ کے تودے تو ضرور ہیں جن سے اینٹیں

نکال کر پڑوسی شہر فیض آباد کے مکانات بنائے گئے ہیں، یہ مسلمانوں کا شہر ڈھائی میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے یہ شہر ملبوں سے بنا ہوا ہے جو اجودھیا میں کھود کر نکالے گئے ہیں دونوں شہر چھ مربع میل میں واقع ہیں، یہ گویا رام کی قدیم راجدھانی اجودھیا کا نصف ہے۔"

کیننگھم آگے لکھتا ہے:

رامائن کے بیان کے مطابق اجودھیا کو "منو" نے آباد کیا، منو انسان کے ابوالآباء سمجھے جاتے ہیں، رام چندر کے پتا دسرتھ کے زمانہ میں اس میں قلعہ بند شہر تھے، پھاٹک بھی تھے اور اس کے چاروں طرف خندقیں تھیں، لیکن ان کا نام و نشان اب دکھای نہیں دیتا، اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں، کہا جاتا ہے کہ "رام" کا اجودھیا دری ہاد بالا کی موت کے بعد ایک بڑی لڑائی میں ۱۴۲۶ ق م میں برباد ہو گیا اس وقت سے وکرماجیت کے زمانہ تک یہ ویران رہا، مشہور روایت یہ ہے کہ وکرماجیت اجین کا مشہور شکاری راجہ تھا، موجودہ دور کے ہندو وکرما کے سارے اعمال اسی سے منسوب کرتے ہیں، اس سلسلے میں ان کی رائے مہمل ہے، ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ اس نام کا ایک طاقتور راجہ سرسوتی کے پڑوس میں کنشک سے بعد کا تھا اور تقریباً ۷۸ ق م کا زمانہ تھا، (۱) اور یہی سالی واہانہ کے شروع سا کا سنگ کا زمانہ تھا اس وکرماجیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مذہب کے پیرووں کا دشمن تھا وہ بڑا سرگرم برہمن تھا، میری رائے ہے کہ اسی نے اجودھیا کی از سر نو تعمیر کی اور رام چندر کی تاریخ میں جو مقدس جگہ ان کے نام سے موسوم تھی ان کو تلاش کرایا روایتہً یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب وہ اجودھیا آیا تو یہ بالکل

(۱) گپت خاندان کے راجاؤں نے اودھ اور شمالی ہند میں ابتدائے ۳۱۹ء تا ۴۷۰ء سلطنت کی البتہ شالباہن کا زمانہ ۷۸ء ہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان راجہ شالباہن کے ۲۴۱ سال بعد مسند آرائے سلطنت ہوئے ہیں، کیننگھم کا بیان اس سلسلے میں مجمل ہے تفصیل کیلئے دیکھئے مختصر تاریخ ہند ص ۱۳۸، از ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر۔

کچھ آگے چل کر لکھتا ہے۔

کھنڈر تھا اور جنگلوں سے بھرا تھا، اس نے رام چندر کی مشہور جگہ کی کھوج لگائی سرجو کے گھاٹ سے اس نے پیمائش شروع کی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین سو ساٹھ مندر، رام چندر، ان کی بیوی سیتا، لکشمن اور شتروگھن، ہنومان اور دوسرے ناموں پر بنوائے، تین سو ساٹھ کی تعداد کا تعلق سالی واہانہ سے بھی ہے کیونکہ راجہ کے قبیلہ کے دیس راجپوت کہتے ہیں کہ راجہ کی تین سو ساٹھ بیویاں تھیں یعنی ہر بیوی کی خاطر اس نے ایک مندر بنوایا۔

اجودھیا میں بہت سے برہمنوں کے مندر ہیں لیکن وہ جدید زمانہ کے ہیں ان میں اثری خوبیاں نہیں ہیں، اوراس میں شک نہیں کہ یہ مندر زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جن کو مسلمانوں نے مسمار کر دیا تھا۔(۱) رام کوٹ کا ہنومان گڑھی شہر کے پورب جانب ہے یہ چھوٹا سا قلعہ ہے جو دیواروں سے گھرا ہے یہ ایک جدید مندر کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے جو ایک ٹیلہ کے اوپر ہے، رام کوٹ یقیناً پرانا ہے اس کا تعلق منی پربت سے ہے، ہنومان کا مندر زیادہ پرانا نہیں ہے، اورنگ زیب کے عہد سے پہلے کا نہیں ہے۔(۲)، شہر کے پوربی کونے پر رام گھاٹ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رام چندر نے اشنان کیا تھا، سرگ دواری یا سورگ دوار، سورگ کا پھاٹک ہے، اتر پورب میں اس کا تعین کیا جاتا ہے،

(۱) کیننگھم اسی رپورٹ میں آگے کی سطروں میں لکھتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکر ماجیت کے بنوائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا - اور اجودھیا پر مسلمانوں کا اقتدار گیارہویں صدی عیسوی کے آخر یا بارہویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں قائم ہوا ہے اس لئے جو مندر ساتویں صدی یعنی مسلمانوں کے آنے کے چار سو سال پہلے ہی تباہ اور ختم ہو چکے تھے انھیں مسلمانوں نے کس طرح مسمار کر دیا؟ دراصل کیننگھم نے اس یکسر خلاف عقل افسانہ کو لکھ کر ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کرنا چاہا جو اس کا اور ہر انگریز کا مقصد اولین تھا جس کے حصول کیلئے یہ لوگ خلافِ عقل بعید از قیاس اور صد فی صد غلط اور جھوٹی باتوں کے کہنے اور لکھنے سے قطعاً نہیں گھبراتے۔

(۲) ہنومان گڑھی کے اس مندر کی ابتدائی تعمیر نواب شجاع الدولہ متوفی ۱۷۷۵ء/ ۱۱۸۸ھ کے عہد میں ہوئی ہے اور ہنومان گڑھی کی تعمیر اس کے بھی بعد میں ہوئی، تفصیل کتاب میں ملاحظہ کریں۔

جہاں رام چندر جلائے گئے، کچھ سال پہلے یہاں برگد کا درخت تھا، جو اشوک بڑ کہلاتا تھا یعنی یہ وہ برگد ہے جس کے پاس غم نہیں پھٹکتا۔ شاید یہ نام سورگ وغیرہ کے تعلق سے رکھا گیا ہو جس کے بارے میں لوگوں کو یقین ہے کہ جو لوگ یہاں آ کر مر جاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں وہ دوسرے جنم سے آزاد ہو جاتے ہیں، اسی کے پاس لکشمن گھاٹ ہے، جہاں رام چندر کے بھائی لکشمن نے اشنان کیا تھا، اور یہاں سے ¼ میل کے فاصلے پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، یہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے، پھر پچھّم کی طرف پانچ میل کے فاصلے پر گپتار گھاٹ ہے، یہاں کئی سفید مندر ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہاں سے لکشمن غائب ہو گئے تھے اسی لئے اس کا نام گپتار ہے جس کے معنی چھپا ہوا ڈھکا ہوا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے لکشمن نہیں بلکہ رام غائب ہوئے، سورگ دواری میں ان کے جلائے جانے کے قصہ سے اس کی تطبیق نہیں ہوتی۔

کینگھم یہ بھی لکھتا ہے۔

پرانے شہر میں بودھ کے بیس مندر تھے(۱) وہاں تین ہزار بھکشو رہتے تھے اسی کے ساتھ برہمنوں کے پچاس مندر تھے اور برہمنوں کی آبادی تھی اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرماجیت کے بنائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا۔(۲)

اجودھیا کی مذہبی حیثیت

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجودھیا رام بھگتی کے مرکزی حیثیت سے بہت بعد میں متعارف ہوا ہے اس سے پہلے وہ بودھ مت، جین مت، شیومت اور اسلامی

(۱) ہیونگ شیانگ کے بیان کے مطابق اس وقت اجودھیا میں بودھوں کے بیس نہیں بلکہ سو مندر تھے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) بابری مسجد، تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں۔ از سید صباح الدین، ص ۴۰ تا ۴۳۔

تہذیب وثقافت کا مرکز رہ چکا ہے، چنانچہ جن بارہ غیر مسلم دانش وروں کا حوالہ گذشتہ سطور میں گذر چکا ہے وہ مشترکہ طور پر لکھتے ہیں۔

''ایودھیا رام بھگتی کے مرکز کی حیثیت سے بہت بعد میں سامنے آتا ہے، پرانے زمانے میں یہ کئی مذاہب کے لئے مقدس مقام رہ چکا ہے، پانچویں صدی سے آٹھویں صدی بلکہ بعد کے کتبوں میں بھی ایودھیا کے باشندوں کے حوالوں میں کہیں بھی اس کا تعلق رام بھگتی سے نہیں ملتا ہے۔''(۱)

(اپی گرافیکا انڈیکا ۱۰اص ۲۷، ۱۵اص ۱۴۳-اص ۱۴)

پٹنہ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق صدر، قدیم ہندوستانی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر رام سرن شرما اپنی کتاب کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا میں لکھتے ہیں۔

''جب ہم ہندو عقائد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اجودھیا کو ازمنۂ وسطیٰ میں تیرتھ استھان کی حیثیت حاصل ہوئی ہے اس سے قبل اجودھیا کو یہ مقام حاصل نہیں تھا، وشنوسمرتی کے باب پچاسی میں باون تیرتھ استھانوں کی ایک فہرست ہے جس میں شہروں تالابوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے نام موجود ہیں لیکن اس فہرست میں اجودھیا کا نام موجود نہیں ہے، اس سمرتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی کے قریب کی ہے اور اس میں درج تیرتھ گاہوں کی فہرست قدیم ترین فہرست ہے۔''(۲)

چین کا مشہور بدھسٹ عالم اور سیاح ہیون سیانگ راجہ ہرش (مشہور بہ راجہ سلاوت) کے زمانہ ۶۳۰÷ میں ہندوستان آیا اور تقریباً پندرہ سولہ سال اور بقول مولوی ذکاءاللہ صاحب تیس سال یہاں رہ کر ملک کا چپہ چپہ چھان مارا جس کی مکمل تفصیل اس نے اپنے سفرنامہ میں درج کی ہے اس کا یہ سفرنامہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کے لئے ایک

(۱) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز دہلی ۶رنومبر ۱۹۹۰÷

(۲) کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ص ۲۰ ہندی ایڈیشن، مطبوعہ مئی ۱۹۹۰÷

دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا انگریزی اردو وغیرہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ہیونگ شیا نگ نے اپنی تحریر کے مطابق کشمیر، پنجاب، سندھ، گجرات، مالوہ، متھرا، تھانیسر، قنوج، بنارس، پٹنہ، بہار، بنگال، آسام، اڑیسہ، مدراس، آندھرا، مما لک متوسط، مہاراشٹر، کوکن، ٹرانکور وغیرہ اہم مقامات کی سیاحت کی، وہ ان جگہوں کے باشندوں، حاکموں اور عالموں کے حالات پوری بصیرت و قابلیت کے ساتھ لکھتا ہے وہ جب قنوج پہنچتا ہے تو اسے وہاں بودھ مذہب کی سو عبادت گاہیں اور دس ہزار پجاری ملتے ہیں اس وقت وہاں کا راجہ ویش ذات کا راجپوت ہرشا وردھن (راجہ ہرش یعنی راجہ سلادت) تھا جس کے والد کا نام ہیونگ شیا نگ پرا کروردھن بتا تا ہے یہ راجہ بدھ مت کا پیرو تھا اور بدھ کی تعلیمات کے مطابق پانچویں سال مہاموکش (کفارۂ گناہ کیلئے دان کا عظیم میلہ) کرتا تھا، ہیونگ شیا نگ نے قنوج میں دریائے گنگا کے کنارے دوسوفٹ بلند اشوک کی لاٹ بھی دیکھی، شہر قنوج کے ایک ویہار (بودھ عبادت گاہ) میں اس نے ڈیرسبن نامی ایک عالم کی مدد سے بودھ مت کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی کیا، قنوج کی سیاحت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہاں سے میں اجودھیا کے لئے روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اس نے جو کچھ دیکھا اس کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے۔

> ''یہاں (اجودھیا میں) ایک سو عبادت گاہیں (ویہار) اور کئی ہزار پجاری ہیں، وہ لکھتا ہے کہ میں نے اجودھیا میں بودھ مذہب کے قدامت پسند و جدت پسند دونوں فرقوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔'' (۱)

بدھ مت کے مرکز کی حیثیت سے

ہیونگ شیا نگ کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی میں اجودھیا بدھوں کا مرکز تھا، بودھ دھرم والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ گوتم بدھ نے اجودھیا میں کچھ دن قیام کیا ہے لیکن جب بہار کے ایک عظیم برہمن رہنما کمارل نے شیو کی پوجا کی ترویج و اشاعت اور

(۱) مقدمہ تاریخ ہند ج ۱ ص ۱۸۰۔ از اکبر شاہ نجیب آبادی۔

بودھ مذہب کی مخالفت میں ایک زبردست تشدّد آمیز تحریک شروع کی اور خوش قسمتی سے انھیں دکن کے ایک طاقتور راجہ کی مکمل ہم نوائی بھی حاصل ہوگئی تو بدھسٹ جو پہلے ہی مذہبی تحزّب اور باہمی فرقہ بندیوں کی وجہ سے اپنی طاقت کھو چکے تھے اس پر تشدد تحریک کا مقابلہ نہ کر سکے، برہمن رہنما کمارل کے بعد ان کے مشہور چیلے شنکراچاریہ (جن کا زمانہ آٹھویں صدی کا آخر یا نویں صدی کا ابتدائی متعین کیا جاتا ہے) نے اپنی بے پناہ اور انتھک جدوجہد سے اس تحریک کو ارتقاء کی آخری حدوں تک پہنچا دیا، جس کے نتیجے میں بودھوں کے بڑے بڑے ویہار اور قدیم عبادت گاہیں یا تو مسمار کر دی گئیں یا انھیں شیو کے مندر میں تبدیل کر لیا گیا۔

مہاراشٹر کے ایک مؤرخ ڈاکٹر جمنا داس نے انگریزی زبان میں شائع شدہ اپنی کتاب ''تروپتی بالاجی مندر بدھوں کی عبادت گاہ تھی'' کی تلخیص پندرہ روزہ اخبار 'دلت وائس'' انگریزی مورخہ یکم تا ۱۵ جنوری ۱۹۹۰÷ میں شائع کرائی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میری کتاب میں بودھ مت کے زوال کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جس میں بودھ مت کی عبادت گاہوں کو برہمن دھرم کے لئے استعمال کرنے کا جائزہ لیا گیا ہے، ماہرین و محققین یہ بات پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ پوری کا گناتھ مندر، بندھاپور کا وشوبھا مندر اور بدری ناتھ مندر ابتدا میں بودھ عبادت گاہیں تھیں آندھرا پردیش کا مشہور تروپتی مندر بھی ایک ایسا ہی مندر ہے جو ابتدا میں بودھ ویہار تھا۔

آگے چل کر ڈاکٹر جمنا داس نے کتاب کی جلدوں اور اس کے ابواب کی تفصیل پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جلد اول کے باب دوم میں بودھ عبادت گاہوں پر برہمنوں کے قبضہ کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، جن میں امراوتی، تیر، چیز ولا، ایہول، انداولی، ایلورا، پوری، اور سرنگیری کے مندروں کا ذکر ہے کہ یہ ابتدا میں بودھ ویہار تھے۔ باب سوم میں اس دعویٰ کے ثبوت فراہم کئے گئے ہیں کہ جگناتھ پوری کا مندر بودھ عبادت گاہ تھی، باب چہارم میں ثابت کیا گیا ہے کہ وٹھالہ پندھارپور کا مندر بودھ خانقاہ تھی، باب پنجم میں اس بات کے ثبوت ہیں کہ ورک شرم مندر بودھ عبادت گاہ تھی، اور کس طرح بدھ ''ایا کا''

کولنگ پوجا کے لئے استعمال کیا گیا، باب ہفتم میں اس دعویٰ کو مدلل کیا گیا ہے کہ نیلا ملائی میں سری سیلم مندر ابتداء میں بودھ عبادت گاہ تھی۔(۱)

یہ ساری تفصیلات تقریباً ایک خاص خطے سے تعلق رکھتی ہیں، جس سے ہندوستان کے دوسرے مقامات کی بودھ خانقاہوں کے متعلق نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل اور دشوار امر نہیں ہے، غالب گمان یہی ہے کہ شیومت کے احیاء اور بودھ مخالف تحریک کے اسی دور میں اجودھیا کی وہ یک صد خانقاہیں جن کی ہیونگ شیانگ سیاح نے زیارت کی تھی شیو مندروں میں تبدیل کرلی گئیں اور اجودھیا سے بودھ پجاریوں کو دیس نکالا دے کر وہاں سے بودھ مت کی مرکزیت ختم کردی گئی۔

شیومت کا غلبہ اور وشنومت کا آغاز

اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی تک دیگر ہندو فرقوں کے مقابلے میں شیومت کا ہی اجودھیا میں غلبہ اور بول بالا رہا۔

مذکورہ بالا غیر مسلم دانشوران لکھتے ہیں:

”تیرہویں صدی عیسوی سے رام بھگتی عوام میں پھیلنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ رام نندی فرقہ کی ترقی اور ہندی میں رام کہانی کی ترتیب کے ساتھ اس کا زور پکڑتا ہے لیکن پندرہویں سولہویں صدی تک بھی رام نندی ایودھیا میں کسی بڑی تعداد میں نہیں بسے تھے شیو بھگتی کی یہاں رام بھگتی سے کہیں زیادہ اہمیت تھی۔“(۲)

نامور مؤرخ ڈاکٹر رام سرن شرما تو یہاں تک دعوی کرتے ہیں کہ صرف اجودھیا ہی نہیں بلکہ پورے اتر پردیش میں کسی ایک جگہ بھی سولہویں صدی سے پہلے کوئی رام مندر نہیں پایا گیا ہے کیونکہ اس وقت تک رام بھگتی کا وجود ہی نہیں تھا۔(۳)

(۱) ہفت روزہ نئی دنیا دہلی، ۱۳ تا ۱۹ر جنوری ۱۹۹۰÷

(۲) تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز ۶ر نومبر ۱۹۹۰÷۔

(۳) کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ہندی ایڈیشن ص ۲۰ مطبوعہ مئی ۱۹۹۰÷۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رامانج (جو ۱۱۱۶÷ میں مدراس کے ایک گاؤں پر میر میں پیدا ہوئے) نامی ایک ہندو مصلح نے شیومت کی مخالفت پر کمر باندھی اور شیو بھگتی کے مقابلہ میں وشنومت کا پرچار شروع کیا، بعد ازاں رامانج کے پانچویں جانشین رامانند (۱۲۹۹÷ میں الہ آباد کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے) نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے پورے شمالی ہند میں اس تحریک کو عام کردیا، وشنومت کے نامور اور مشہور بھگتوں میں ناواجی، سورداس، تلسی داس (جنھوں نے ہندی زبان میں رامائن مرتب کی) جے دیو اور کبیر داس وغیرہ کی مشترکہ کوششوں سے سولہویں صدی آتے آتے رامانندی فرقہ (وشنومت) کو شیومت پر غلبہ ہوگیا اور شیو پوجا کے بجائے وشنو کے اوتار کی حیثیت سے رام کی پوجا عام ہوگئی اور اسی زمانہ سے رام کے نام پر مندروں کی تعمیر شروع ہوئی۔(۱)

جین مت کے استھان کی حیثیت سے

بودھ مت، شیومت، وشنومت (رامانندی فرقہ) کے علاوہ اجودھیا جین مت کی بھی اہم ترین زیارت گاہ رہ چکا ہے، جینی اپنے پہلے اور تیسرے تیرتھنکر کی جنم بھومی اجودھیا ہی کو بتاتے ہیں، چوتھی، تیسری صدی ق م کا ایک پکی مٹی کا جینی پتلا اجودھیا میں پایا گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اجودھیا جین مت کا استھان رہ چکا ہے مگر آج وہاں اس مذہب کی کوئی علامت اور نشانی نہیں پائی جاتی۔

مسلمانوں کی آمد اور اسلامی آثار کا فروغ

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے درمیانی عہد سے اجودھیا میں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی قائم ہوگئی تھی اور ہندوستان کے دیگر مقامات کی طرح اجودھیا کا علاقہ بھی مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا تھا اور حکومت کی جانب سے اس علاقے کے نظم وضبط کو قائم

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، چودھری غلام رسول ایم اے ص ۱۹۷/اور مختصر تاریخ ہند ڈبلو ڈبلو ہنٹر اردو ایڈیشن نول کشور ۱۸۹۴÷ ص ۱۵۹، اور ۱۶۱۔

رکھنے کے لئے امیر وقاضی مقرر تھے، ہماری تحقیق کے مطابق اجودھیا کے اولین قاضی شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے خواجہ تاش اور پیر بھائی قاضی قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی ہیں جن کی وفات اجودھیا ہی میں ۶۰۵ھ/ ۱۲۰۸ء میں ہوئی، کتاب کے پہلے باب میں ان کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی تک اجودھیا پر اسلامی تہذیب وثقافت چھائی رہی اس مدت میں اجودھیا کے افق سے علم وفضل کے ایسے ایسے آفتاب وماہتاب چمکے جن کی تابانیوں کے سامنے خود دارالخلافہ دہلی کے علمائے نامدار کے چراغ مدھم پڑ گئے جن کے تذکرے اس کتاب میں آپ پڑھیں گے اسی سرزمین میں عام روایت کے مطابق حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کے صلبی صاحبزادے اور جانشیں حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن ہے جس کی زیارت کو مسلمان اپنے لے سرمایۂ سعادت سمجھتے ہیں اور آج بھی پچاسوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے قبرستان اور خانقاہوں ومزارات کے کھنڈرات زبان حال سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ اس ارض متبرک پر اسلامی قافلہ کبھی آکر ٹھہرا تھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ☆ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

یہ تفصیلات بتا رہی ہیں کہ پچھلی صدیوں میں ایک مقدس مرکز ہونے کی حیثیت سے اجودھیا کے احوال بدلتے رہے ہیں کبھی یہ بودھوں کا مرکز توجہ رہا ہے تو کبھی جینیوں نے اپنی عقیدت کے نذرانے اس پر نچھاور کئے ہیں کبھی علماء اسلام اور مشائخ تصوف نے اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں کا اسے محور بنایا تو کبھی شیومت اور وشنومت کے پجاریوں کا یہ مقصود نظر رہا، غرضیکہ اس کا رشتہ مختلف مذہبوں کی تاریخ سے پیوستہ رہا ہے اور مختلف ادوار میں مختلف مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر اسے عزت وعظمت کا مقام عطا کیا ہے اس لئے اس شہر پر کسی ایک مذہب کا دعویٰ تاریخی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

☆ ☆ ☆

بابری مسجد حقائق اورافسانے

یکم فروری ۱۹۸۶ء (۲۱/جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ) سنیچر کے دن ''بابری مسجد'' واقع اجودھیا ضلع فیض آباد، ناجائز اور غیر منصفانہ طور پر نہایت ڈرامائی انداز سے ''رام جنم استھان مندر'' میں تبدیل کردی گئی، اس حادثہ فاجعہ پر مسلمانوں کو جس قدر غم ہو کم ہے۔

''آسماں را حق بود گر خوں ببارد برزمین''

یہ ظالمانہ اقدام محض جبر وتشدد اور کثرت وطاقت کے نشہ میں کیا گیا ہے، لیکن دنیا کو فریب دینے کے لئے اس پر عدالت کے فیصلے کی چادر ڈال دی گئی ہے حالانکہ اس غیر قانونی عمل کو عدالت کا فیصلہ کہنا خود عدلیہ کی توہین ہے اور اب اس نام نہاد فیصلہ کو حق بجانب اور درست ثابت کرنے کی غرض سے ''بابر'' اور اس کی جانب منسوب ''بابری مسجد'' کی تاریخ مسخ کرنے کی ملک گیر تحریک چلائی جارہی ہے، اس رسوائے زمانہ تحریک کا سلسلہ اگرچہ عرصۂ دراز سے جاری تھا مگر اسے آج کل تیز تر کردیا گیا ہے اور وشو ہندو پریشد، آریہ پرتی ندھی سبھا، بھارتیہ جنتا پارٹی، وغیرہ فرقہ پرست تنظیمیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ ''بابری مسجد کو بابر شاہ نے رام جنم استھان مندر توڑ کر اس کے کھنڈر پر تعمیر کرایا تھا، اس لئے اس مسجد کو ہندو فرقہ کے حوالہ کرنے کا فیصلہ حق وانصاف پر مبنی ہے۔''

اس بے بنیاد اور من گھڑت افسانے کو ایک صحیح اور سچا واقعہ باور کرانے کے لئے علم و تحقیق کی آبرو کو بالائے طاق رکھ کر پوری جسارت کے ساتھ تزک بابری، آئین اکبری اور عالم گیری نامہ جیسی اہم تاریخی کتابوں کا بالکل غلط طور پر حوالہ بھی دیا جارہا ہے۔

اس لئے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ منعقدہ ۲۲/۲۱/فروری ۱۹۸۶ء نے ضرورت محسوس کی کہ بابری مسجد کی صحیح تاریخ عوام کے سامنے پیش کی جائے تاکہ سرکاری

وغیر سرکاری ذرائع ابلاغ کی مدد سے پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا یہ بادل چھٹے جس نے ملک کی فضاء کو خطرناک حد تک مسموم بنادیا ہے،اور ملک کا انصاف پسند طبقہ کذب و افتراء کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس انتہائی حساس اور نازک معاملہ میں علم و تحقیق کی روشنی میں غور کرسکے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے یہ خدمت احقر کے سپرد کی،مظلوم بابری مسجد کے سلسلہ میں یہ تحریر اسی حکم کی تعمیل میں سپرد قلم کی گئی ہےاور قارئین ماہنامہ دارالعلوم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

کیا بابر اجودھیا آیا تھا؟

چونکہ یہ مظلوم مسجد بابر کی جانب منسوب ہے،اس لئے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے بابر نے تعمیر کرایا تھا، پھر اس مفروضہ کی بنیاد پر یہ افسانہ گھڑ لیا گیا کہ بابر نے اجودھیا آکر ''رام جنم استھان مندر کو گرایا''اور پھر اس کی جگہ پر یہ مسجد بنوائی چنانچہ حکومت یوپی کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''اتر پردیش'' میں بعینہٖ یہی بات کہی گئی ہے۔

''۱۹۲۸÷ میں بابر یہاں (اجودھیا) آیا تھا اس نے ایک ہفتہ قیام کیا اور جنم استھان مندر کو گرا کر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اس مندر کے ملبہ پر تعمیر کی تھی''۔(ماہنامہ اتر پردیش شمارہ اپریل ۱۹۸۴÷ص:۲۷)

اس لئے پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ ''بابر'' اجودھیا آیا تھا! کیونکہ (جنم استھان مندر) گرانے کی داستان اسی دعویٰ کی بنیاد پر گھڑی گئی ہے۔

مؤرخین ہند خواہ مسلم دور حکومت سے تعلق رکھتے ہوں یا اس عہد کے بعد کے ہوں سب اس پر متفق ہیں کہ ''بابر'' کے حالات میں مستند ترین مآخذ خود اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ سوانحی روزنامچہ ہے جو علمی حلقوں میں ''تزک بابری'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، ''بابر'' نے ۸۹۲ سے جبکہ اس کی عمر صرف بارہ سال تھی،اسے لکھنا شروع کردیا تھا اور اپنے مرضِ وفات میں مبتلا ہونے سے چھ ماہ قبل یعنی ۹۳۶ھ تک اس سلسلہ کو جاری رکھا تزک

میں اس کی آخری تحریر ۳ر محرم ۹۳۶ھ کی ہے اور اسی سال رجب کے مہینہ میں بیمار ہوا اور اسی بیماری میں ۵ر جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو انتقال کر گیا اس طرح یہ روزنامچہ آخری ایک سال کے علاوہ اس کے پورے سوانح حیات کو حاوی ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو تفصیل سے قلم بند کر دیا ہے حتیٰ کہ وہ جن مقامات پر گیا ہے وہاں کے عوام کی حالت، جانوروں کی قسمیں، آب و ہوا، باغات اور عمارتوں کا تذکرہ بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے، اصل کتاب ترکی زبان میں ہے، اس کا سب سے پہلا ترجمہ ''اکبر'' کے حکم سے خانخاناں عبدالرحیم نے فارسی میں کیا تھا، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس کے بعد انگریز مؤرخ ''اے، ایس بیورج'' نے دی بابر نامہ ان انگلش کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو دو جلدوں میں ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، یونیورسٹیوں اور دیگر علمی حلقوں میں عام طور پر یہی ترجمہ رائج ہے، مسز بیورج نے ترجمہ کے ساتھ تفصیلی فٹ نوٹ بھی لکھا ہے، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے ''بابر نامہ'' کے نام سے اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے، اب یہی انگریزی اور اردو کے دونوں ترجمے تذکرہ نویسوں کے لئے مآخذ و مرجع کا کام دیتے ہیں، کوئی بھی شخص ان ترجموں کو اول سے آخر تک پڑھ جائے اسے ان میں کہیں بھی ''بابر'' کے ''اجودھیا'' آنے کا ذکر نہیں ملے گا، البتہ ۹۳۵ھ کے واقعات کے ضمن میں اس کی یہ تحریر ضرور ملتی ہے۔

''ہفتہ ۷ر رجب کو ہم نے ''اودھ'' سے دو تین کوس (چھ میل) پر ''گھاگھرا'' اور ''سردا'' (ساردا) کے سنگم پر قیام کیا (یہ سنگم بہرائچ میں ہے) اس وقت تک ''شیخ بایزید'' سردا (ساردا) کی دوسری جانب تھا اور سلطان (حسین تیمور) سے خط و کتابت کر رہا تھا اس کی دھوکہ بازیوں سے واقفیت کی بناء پر ہم نے بوقت ظہر ''سلطان کو حکم دیا کہ وہ دریا پار کرنے کے لئے تیار ہو جائے، قباچہ کے پہنچنے پر انھوں نے فوراً دریا پار کیا وہاں پچاس گھوڑے اور تین چار ہاتھی موجود تھے وہ مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور فرار کی راہ اختیار کی چند لوگ جو گھوڑے سے اتر گئے تھے ان کے سر کاٹ کر حاضر کئے گئے'' (بابر نامہ اردو ۳۳۹)

''بابر'' کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ وہ ''شیخ بایزید'' کی بغاوت فرو کرنے کے

لئے رجب ۹۳۵ھ میں اس دیار میں آیا تھا مگر بقول خود اس کا قیام اجودھیا سے ۶ میل دور سار دا کے سنگم پر ہوا، شیخ بایزید کی شکست کے بعد اپنے ایک امیر سید ''میر باقی اصفہانی'' کو اس علاقے کا حاکم مقرر کر کے یہیں سے براہ الٰہ آباد و کٹرہ بہار چلا گیا جہاں سلطان محمود بن سکندر لودھی نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ تقریباً ایک ماہ بہار کے علاقے میں گذار کر واپس لوٹا اور واپسی کے موقع پر بھی وہ اجودھیا سے کافی فاصلے سے گذرا، جیسا کہ تزک کی درج ذیل تحریر سے ظاہر ہے۔

''بروز دوشنبہ ۲۲؍ رمضان کو ہم چوپادہ میں پہنچے چتر مکھ کے راستے دریائے سرجو کے کنارے ہوتے ہوئے بہار اور سردا (ساردا) کے قضیوں سے فارغ ہو کر اور دس کوس (۲۰ میل) چلنے کے بعد دریائے سرجو کے کنارے کیلرہ نامی گاؤں میں جو فتح پور کے علاقے میں ہے قیام کیا، ہم نے کئی دن اس مقام پر گذارے، یہاں آب رواں ہے، اچھی عمارتیں ہیں اشجار خاص طور پر آم کے درخت اور رنگ برنگ کی چڑیاں ہیں، پھر ہم نے غازی پور کی طرف کوچ کا حکم دیا'' (بابرنامہ اردو)

ان دونوں تحریروں کے علاوہ ''تزک بابری'' میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملتی جس سے ''بابر'' کے اس دیار میں آنے کا سراغ لگایا جا سکے۔

تزک بابری کے علاوہ طبقات اکبری تالیف خواجہ نظام الدین احمد، اکبرنامہ ابوالفضل، منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی خلاصۃ التاریخ منشی سبحان رائے، تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ، منتخب اللباب محمد ہاشم خانی خان، غرضیکہ کسی بھی معاصر یا غیر معاصر مستند و معتبر تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں ملتا، اس لئے جس بنیاد پر مندر توڑ کر مسجد بنانے کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، جب اس بنیاد ہی کا وجود نہیں تو عمارت کا جو حال ہوگا اہل نظر سے مخفی نہیں۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

''بابر'' کے حالات میں اس وقت جتنی بھی کتابیں دستیاب ہیں ان میں ''بابر'' کے

نہ صرف اجودھیا بلکہ کسی بھی مقام پر مندر توڑنے کا ذکر نہیں ہے، حتیٰ کہ جدوناتھ سرکار، ایسٹ اور ڈاوسن نے بھی ''بابر'' کی مندر شکنی کا کوئی واقعہ نقل نہیں کیا ہے، جبکہ یہ مؤرخین مسلم حکمرانوں کی مندر شکنی کے واقعات میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

بابر کی ایک وصیت

ان تاریخی شواہد کے علاوہ خود ''بابر'' جس ذہن و مزاج کا حکمراں ہے اس کے پیش نظر یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی بھی مذہبی عبادت گاہ پر غلط نگاہ ڈالے گا، اس کے اس مزاج کو سمجھنے کیلئے وہ وصیت نامہ کافی ہے جو اس نے اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کے لئے قلم بند کیا تھا وہ اس میں ہمایوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصّبات کو مٹادو، اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرسکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہوسکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف سے چشم پوشی کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ جس طرح کہ انسانی جسم ملاتا ہے، تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ'' (انڈیا ڈی ڈائڈ ڈص ۱۳۹ از ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند)

ان دلائل وشواہد کی روشنی میں ایک دیانت دار مؤرخ اور حقیقت پسند مبصر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ ''بابر'' مندر شکنی کے الزام سے قطعا بری ہے، چنانچہ پروفیسر ''شری رام شرما'' اپنی مشہور کتاب ''مغل امپائران انڈیا'' میں پوری صفائی سے لکھتے ہیں:

''ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ ''بابر'' نے کسی مندر کو منہدم کیا یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض اس لئے کی کہ وہ ہندو ہے۔'' (ص ۵۵ ایڈیشن ۱۹۴۵ء بحوالہ معارف فروری ۸۶ء)

تلاش حقیقت

جب یقینی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ ''بابر'' اجودھیا آیا ہی نہیں تو اس کے بابری مسجد تعمیر کرانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، لہٰذا اب ہمیں تاریخ ہی کی روشنی میں یہ پتہ لگانا چاہئے کہ اس مسجد کا بانی حقیقتاً کون اور اس نے اسے کب تعمیر کرایا ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ بابری مسجد اجودھیا ہندوستان میں موجود لاکھوں مسجدوں کے مقابلے میں کسی خصوصی امتیاز کی حامل نہیں ہے، اسی لئے مؤرخین جس طرح عام مسجدوں کی تاریخ بیان کرنے کا عام طور پر اہتمام نہیں کرتے بعینہٖ ''بابری مسجد اجودھیا'' کے بارے میں بھی ان کا یہی رویہ ہے، بالفرض اگر یہ مسجد کسی خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی یا اس کی تعمیر کے ساتھ کوئی جذباتی واقعہ وابستہ ہوتا یا کم از کم اسے کسی بادشاہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوتا تو مؤرخین اس طرح سے اس کے بارے میں خاموش نہ رہتے بلکہ اس کی تفصیلات ضرور لکھتے لیکن مؤرخین کے اس مکمل سکوت کے باوجود ''بابری مسجد'' کی تاریخ تاریکی میں نہیں ہے بلکہ اس میں نصب کتبوں کی بناء پر آئینہ کی طرح روشن ہے۔

آج کی دنیا میں کتبات کی جو اہمیت ہے، وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، آج حکومتیں ان کی فراہمی اور حفاظت پر کڑوڑوں روپئے خرچ کر رہی ہیں، اور ان سے صرف عمارتوں ہی کی تاریخ معلوم نہیں کی جاتی بلکہ قوموں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں انہیں مستند ترین مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بابری مسجد اجودھیا کے کتبے

اسے اتفاق ہی کہئے کہ ''بابری مسجد'' میں ایک کے بجائے تین کتبے نصب کئے گئے تھے جن میں دو تاریخی حیثیت سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں مسجد کی تعمیر کا سن اور بانی کے نام کی تصریح موجود ہے۔

(ا) یہ کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے جو مسجد کے مسقّف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر نصب ہے، جس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم		
بنام آنکہ او داناست اکبر	کہ خالق جملہ عالم لامکانے	درود مصطفیٰ بعد از ستائش
کہ سرور انبیاء زبدہ جہانے	فسانہ درجہاں بابر قلندر	کہ شد در دور گیتی کامرانے
چناں کہ مطلع کشور گرفتہ	زمیں راچوں مبارز آسمانے	دراں حضرت یکے سید معظم
کہ نامش میر باقی اصفہانے	مشیر سلطنت تدبیر ملکش	کہ زیں مسجد حصار مہستانے
خدایا درجہاں تابندہ ماند	کہ خیرو بخت وتخت وزندہ گانے	دریں عہد ودریں تاریخ میموں
کہ نہ صد پنج وسی بودہ نشانے	(ان دوسطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جاسکا) (حبیب الرحمٰن)	

اس کتبے کے اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا پھر نبی کریم ...... پر درود ہے اور آپ ......کو تمام انبیاء کا سردار اور خلاصۂ کائنات کہا گیا ہے، پھر دو شعروں میں ''بابر'' کی تعریف اور اس کی فتح وکامرانی کو نہایت لطیف اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے، کہ اس موقعہ پر بابر کو بادشاہ کے بجائے قلندر کہا گیا ہے، یہ لفظ صوفیوں کی اصطلاح میں مرنجاں مرنج اور ہر قسم کی مذہبی تعصب سے بے نیاز شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پھر بیان کیا گیا ہے کہ ''بابر'' کے درباریوں میں ایک صاحب عظمت سید ہیں جن کا اسم گرامی ''میر باقی اصفہانی'' ہے پھر ''میر باقی'' کے انتظام ملکی کی تعریف ہے اس کے بعد کے شعر میں بتایا گیا ہے کہ ان ہی ''میر باقی'' کی بدولت یہ مسجد روشن ضمیروں کے لئے حصار بنائی گئی ہے اس کے بعد کے چار شعروں میں ان کے لئے دعاء ہے کہ خدایا دنیا میں ان کے اس خیر یعنی مسجد اوران کے مقام و مرتبے اور زندگی کو تابندہ رکھ تا کہ ۹۳۵ھ کی یہ یادگار باقی اور پائیدار رہے۔

''مسز بیورج'' نے اپنے ترجمہ ''دی بابر نامہ ان انگلش'' کی دوسری جلد کے ضمیمہ میں ''بابری مسجد اجودھیا'' کے کتبات کے عنوان کے تحت منبر کے بائیں سمت والے کتبہ کے علاوہ، مندرجہ بالا کتبے کو بھی درج کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کے آٹھ شعروں میں سے شروع کے صرف تین اشعار نقل کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ اشعار کو وہ پڑھ نہ سکیں اس لئے انہیں چھوڑ دیا۔

۲،۳ یہ دونوں کتبے مسجد کے اندرونی حصہ میں ''منبر'' کے داہنی اور بائیں جانب تھے۔

(داہنی سمت کا کتبہ)(۲)

بمنشائے بابر خدیوں جہاں بسائیکہ با کاخ گردوں عناں
بناکرد ایں خانۂ پائیدار امیر سعادت نشاں میر خان
بماند ہمیشہ چنیں بانیش چناں شہریار زمیں وزماں

(بائیں جانب کا کتبہ)(۳)

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش بنائیست با کاخ کردوں ملاقی
بناکردہ ایں مہبط قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی وسال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۹۳۵ھ

معمولی سے فرق کے علاوہ ان دونوں کتبوں کے مفہوم میں یکسانیت ہے البتہ دوسرے کتبہ کا آخری شعر دعائیہ ہے اور تیسرے کے آخری جملہ سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے اس

آخری کتبہ کو مسز بیورج نے بھی نقل کیا ہے لیکن ان سے اس کے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے، جس سے تعمیر کی معنویت متاثر ہوتی ہے وہ آخری شعر کو اس طرح لکھتی ہیں۔

بود خیر باقی چو سال بنائش عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی

جبکہ صحیح اس طرح ہے۔

بود خیر باقی وسال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۲۷/ مارچ ۱۹۳۴÷ مطابق ۱۱/ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ کو اجودھیا میں ایک زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس موقع پر فسادیوں نے ''بابری مسجد'' میں گھس کر توڑ پھوڑ کیا تھا اسی وقت ان دونوں کتبوں کو بھی اکھاڑ لے گئے، لیکن بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبے کی ایک نقل تیار کرا کے تہور خان ٹھیکیدار نے نصب کرا دیا البتہ دائیں جانب کی نقل وہ بھی نہ کرا سکے۔

سید بدر الحسن فیض آبادی کے پاس اس ضائع شدہ کتبے کی ایک نقل موجود تھی اسی نقل کے حوالہ سے یہ کتبہ یہاں درج کیا گیا ہے۔

ان تینوں کتبوں کی فلم اور اس کا فوٹو (ضمیمہ فارسی وعربی ہندوستانی کتبات ۱۹۶۵÷ ناگپور میں موجود ہے) جسے حاصل کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

مسجد کی مرکزی دروالا اصلی کتبہ اور منبر کی بائیں جانب والا نقل شدہ کتبہ یہ دونوں کتبے ۱۹۴۹÷ سے پہلے تک مسجد میں موجود تھے، اب موجود ہیں یا وہ بھی بیراگیوں کے دست کرم کے شکار ہو گئے خدا ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ تقریباً ۳۷ سال کی طویل مدت سے مسلمانوں کا اپنی اس قدیم عبادت گاہ کے پاس سے گذرنا بھی ممنوع ہے اس کے اندر جانا تو بہت دور کی بات ہے اس لئے اس وقت ان کتبوں کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔

لیکن ان کتبوں کے اب مسجد میں ہونے یا نہ ہونے سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ان کی مستند نقلیں حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ کتبے آج بھی شہادت دے رہے ہیں کہ ''بابری مسجد'' اجودھیا کا بانی ''شاہ بابر''

نہیں بلکہ اس کا ایک امیر ''میر باقی اصفہانی'' تھا جسے بابر نے ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ء میں علاقہ اودھ کا حاکم مقرر کیا تھا ''میر باقی'' نے اسی تقرری کی یادگار کے طور پر اس مسجد کی تعمیر کرائی تھی، جیسا کہ پہلے کتبہ کے آخری مصرعہ ''کہ نہ صد پنج وسی بودہ نشانی'' سے واضح ہے۔

اور تیسرے کتبہ کے دوسرے شعر ''بنا کرد ایں مہبط قدسیاں'' سے اشارہ ملتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر عدل وانصاف کے مطابق ہوئی ہے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرشتوں کی درودگاہ وہ مقام کبھی بھی نہیں ہوسکتا جس کی بنیاد ظلم وجور پر رکھی گئی ہو، اور اسلامی قوانین کی رو سے کسی مذہب کی عبادت گاہ کو منہدم کرنا ظلم وزیادتی ہے، اور اس غیر منصفانہ حرکت سے آنحضرت...... نے سختی سے منع فرمایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسز بیورج نے ان کے ترجمہ اور تشریح میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ ''مسجد'' جنم استھان کو توڑ کر بنائی گئی ہے، اسی طرح ولیم ارسکن، آزبروک ولیم جنھوں نے بابر کے عہد کی تاریخ لکھی ہے بابر کے کسی مندر توڑنے کا ذکر نہیں کرتے۔

ان مستند تاریخی شواہد کے علاوہ مسجد کا جائے وقوع بھی یہی کہتا ہے کہ یہاں مسجد سے پہلے مندر نہیں ہوسکتا، کیونکہ مسجد کے احاطے کی چہاردیواری سے متصل پورب اور دکھن سمت ''گنج شہیداں'' ہے یعنی ان شہیدوں کے مزارات ہیں جو سپہ سالار مسعود غازی کے رفقاء میں سے تھے اور دو قدم فاصلے پر ''قاضی قدوہ'' کی قبر ہے جو خاندان قدوائی کے مورث اعلیٰ تھے۔

مسعود غازی پانچویں صدی ہجری میں اس دیار میں آئے تھے،...اس لئے اس مقام پر ان کے رفقاء کے مزارات کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس حصۂ زمین پر اس وقت کوئی مندر وغیرہ نہیں تھا کیونکہ کسی مندر کے متصل شہیدوں کے مزارات نہیں بنائے جاتے ان مزارات کے بعد محلّہ قضیانہ اور ایک اور مسلم محلّہ کی آبادی شروع ہوجاتی تھی جس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا آبائی مکان تھا، اور مسجد کے پورب سمت ذرا سے فاصلے پر محلّہ بیگم پورہ تھا، جو نوابان اودھ کے دور تک خالص مسلم آبادی پر مشتمل تھا، اور مسجد کے اتر جانب احاطہ مسجد سے بالکل متصل تقریباً پندرہ میٹر چوڑی قدیم سڑک ہے اسی سڑک کے متصل اتر

پورب سمت میں جنم استھان کا احاطہ ہے۔الحاصل اس قدیم سڑک سے دکھن جانب خالص مسلمانوں کی آبادی اوران کے قدیم مزارات ہیں اس جانب نوابان اودھ کے دور سے پہلے نہ ہندوآبادی تھی اورنہ کوئی مندروغیرہ ان کے سارے مندرسڑک کے اتری سمت میں تھے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی جگہ پہلے ہی سے مسلمانوں کی ملکیت میں تھی اس لئے یہاں کسی مندر کے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چنانچہ آج سے تقریباً آٹھ،نوسال قبل حکومت نے محکمہ آثارقدیمہ کے ذریعہ ’’بابری مسجد‘‘ کی مغربی دیوار سے بالکل متصل بڑے پیمانے پرکھدائی کرائی تھی اس کھدائی سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ یہاں مسجد سے پہلے کسی قسم کی کوئی عمارت نہیں تھی کیونکہ کھدائی کے بعد کسی عمارت کے کوئی آثاراس جگہ نہیں پائے گئے اس کھدائی کی رپورٹ حکومت کے پاس محفوظ ہے ان دلائل وقرائن کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک ہندومحقق کی تحقیق بھی پیش کردیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح روشن ہوکر سامنے آجائے۔

جنم استھان کے بارے میں ایک ہندومحقق کی تحقیق

ڈاکٹر آر،ایل شکلا استاذ دہلی یونیورسٹی دہلی نے ۱۹۸۴÷ میں ایک مقالہ بعنوان (jkedhuxjh iz;/;; ;feFkd) (رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ) لکھا تھا، یہ اقتباس اسی مقالہ سے ماخوذ ہے یہ مقالہ اگرچہ اس قابل ہے کہ اسے پورا نقل کردیا جائے لیکن طوالت کے خوف سے اس کے ضروری اقتباسات اس موقع پر نقل کئے جارہے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ

’’بعض مؤرخین ’’مہابھارت‘‘ میں بیان کئے گئے ’’رام‘‘ کو حقیقی کردار مانتے ہیں یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار قبل مسیح مانتے ہیں،اورمہابھارت کا زمانہ عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک ہزار پہلے کا بتایا جاتا ہے،اگرہم اس تحقیق کو صحیح مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے،ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزارسال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئے اسی مقصد کے پیش نظر تین مقامات کی

کھدائی ہوئی ہے: (۱) فیض آباد ضلع میں ''اجودھیا کی (۲) الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال کی سمت واقع موضع ''شرنگویر پور'' کی (۳) اور الہ آباد میں واقع ''بھاردواج'' آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے بھی ہوئی تھی اس وقت بھی وہاں آبادی کے نشان عیسیٰ (علیہ السلام) سے ۶۰۰ سال پہلے کے نہیں ملے تھے اور اب سے تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (اجودھیا) کھدائی ہوئی، (اس کھدائی سے) بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسی (علیہ السلام) سے (زیادہ سے زیادہ) ۷۰۰ سال قبل کی آبادی کے نشان پائے گئے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی (موجودہ) اجودھیا ''رام جی'' کی نگری تھی جو ان کی جنم بھومی مانی جاتی ہے تو (سوال پیدا ہوتا ہے) کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کے زمانے کا تعلق اور جوڑ کیوں نہیں قائم ہوتا، اجودھیا کی آبادی عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے سے ۶۰۰ یا ۷۰۰ سال پہلے کی ہے جبکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰؑ سے ۲۵۰۰ سال قبل یا بعض مؤرخین کی تحقیق کے اعتبار سے اس سے بھی پہلے کا ہے تو پھر اجودھیا رام کی بھومی کیسے ہوسکتی ہے اور اس کا کیا ثبوت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مشرقی یوپی، شمالی بہار اور مگدھ کے علاقوں میں پہلے جنگل ہی جنگل تھے ان علاقوں میں تقریباً ۵۰ سے ۶۰ انچ تک بارش ہوتی ہے جس کی بناء پر میدانوں میں جنگل کا پیدا ہوجانا فطری امر ہے، جب تک ان جنگلوں کو کاٹ کر صاف نہیں کیا گیا وہاں بستیوں کا آباد ہونا ممکن نہ تھا ان جنگلوں کی صفائی کا کام انہیں جلا کر یا لوہے کے کلہاڑوں سے کاٹ کر کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات سے یہ طے ہوچکا ہے کہ لوہے کا استعمال ان علاقوں میں ۷۰۰ سال قبل از مسیح نہیں تھا۔

قدیم پالی ادب میں بڑی بڑی حکومتوں کا ذکر ہے جنہیں ''مہاجن پد'' کہا جاتا تھا، نیز پالی ادب میں ''اجودھیا'' کا بھی ذکر ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''بدھ'' کے عہد میں اس علاقہ میں حکومت کا قیام ہوگیا تھا، لیکن اس سے پہلے کسی حکومت کے قیام کا ثبوت نہ تو قدیم ادب سے ملتا ہے اور نہ آثار قدیمہ ہی سے، اس لئے جو لوگ اجودھیا کو رام کی جنم بھومی کہتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

بالمیکی رامائن (کے مطابق) ''کوشل'' کا پایۂ تخت ''اجودھیا'' سرجوندی کے داہنی سمت سرجو سے ڈیڑھ یوجن (۱۳½ میل) کے فاصلے پر تھا اور سرجو اس سے پچھّم سمت تھی، اور آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پر ہے پھر آج سرجو اجودھیا سے پورب سمت ہے نہ کہ پچھّم میں (بالمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا رام کی جنم بھومی نہیں ہوسکتا ہے) (ایٹک سنواد، ماہ نومبر ۱۹۸۴÷ص:۱۲،۱۳)

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہندو مذہب کی اہم ترین کتاب ''اتھرو وید'' سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ ''ایودھیا'' اسم علم (نام) کے طور پر نہیں بلکہ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے ''انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ'' کے فیلو پروفیسر ''بی، بی لال'' جو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں، انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ

> ''کسی ایک جگہ بھی لفظ اجودھیا اسم معرفہ (نام) کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے اس لئے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ کسی شہر کا نام ہے'' (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی شمارہ ۱۸ و ۲۰ مارچ ۱۹۸۶÷ص:۱۳،۱۵)

کیا رام کرشن کوشل کے راجہ تھے؟

ان تحقیقات کے علاوہ بعض محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ رام کرشن کا ''جن کی راجدھانی (اجودھیا) بتائی جاتی ہے'' وہ کوشل کے راجہ تھے ہی نہیں بلکہ وہ بنارس کے حکمراں تھے۔

چنانچہ اے، ایل باشم لکھتے ہیں:

> ''یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ ''رام'' کوشل کا بادشاہ تھا کیونکہ اس افسانے ''رامائن'' کا قدیم ترین نسخہ جو ہمارے پاس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنارس کا بادشاہ تھا جو تھوڑے زمانے کے لئے ایک اہم حکومت تھی''
>
> (ہندوستان کا شاندار ماضی ص:۶۷،۶۸ ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲÷)

الحاصل قدیم ہندوادب اور جدید تحقیقات دونوں کے اعتبار سے موجودہ ’’اجودھیا‘‘ کا تعلق رامائن کے کردار (ہیرو) ’’رام‘‘ سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ اجودھیا کی آبادی رام کے اٹھارہ سو (۱۸۰۰) سال بعد وجود میں آئی ہے، اس لئے علم و تحقیق کی رو سے اجودھیا کو رام جنم بھومی کہنا انتہائی مضحکہ خیز ہے جس کی حیثیت دیومالائی افسانے سے زیادہ نہیں۔

غالباً اسی بناء پر غیر ملکی سیاح جب ہندوستان کے قدیم آثار کی سیر کے لئے آتے ہیں تو انہیں بنارس، سارناتھ، مگدھ، نالندہ، کھجراہو ، اجنتا وغیرہ کی سرکاری و غیر سرکاری طور پر سیر کرائی جاتی ہے اور ’’اجودھیا‘‘ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے جب خود ’’اجودھیا‘‘ کا رام جنم بھومی ہونا تاریخی و تحقیقی شواہد سے غلط ہے تو اس میں واقع ایک مسجد کو تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بعد متعین کر کے یہ کہنا کہ اسی جگہ رام جی پیدا ہوئے تھے، ایک من گھڑت افسانہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

اس افسانہ کی ابتدا اور اس کے مقاصد

رام جی کے زمانہ سے تقریباً سوا چار ہزار سال کے بعد بابری مسجد اجودھیا کی تعمیر ہوئی اگر واقعتاً اس جگہ کوئی مندر ہوتا اور اس اہمیت کا جسے آج ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کے اوپر ملک کی سالمیت اور یگانگت کو قربان کرنے کا قصد کر لیا گیا ہے تو اس کا ذکر مذہبی اور تاریخی کتابوں میں ضرور ہوتا یا کم از کم محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے موقع پر اس کے کچھ آثار و نشانات ہی ملتے لیکن اوپر کی سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ’’اجودھیا‘‘ کی آبادی کا وجود ’’رام جی‘‘ کے زمانے سے تقریباً اٹھارہ سو سال بعد ہوا ہے تو پھر ’’رام جی‘‘ کی وہاں پیدائش کیسے ہو سکتی ہے کہ ان کی پیدائش کی یادگار میں اس جگہ مندر بنایا جاتا۔

دراصل ’’رام جنم استھان‘‘ کا یہ قضیہ انگریزوں کی منحوس ڈپلومیسی ’’لڑاؤ اور حکومت کرو‘‘ کی پیداوار ہے واجد علی شاہ کے ابتدائی دور میں انگریزوں نے اس افسانہ کے پلاٹ کو تیار کیا، وہ اس طرح کہ ایک بدھشٹ نجومی کو پہلے سے تیار کیا چنانچہ اس نے

انگریزوں کی منشاء کے مطابق زائچہ کھینچ کر ''جنم استھان'' اور سیتا رسوئی گھر کو'' بابری مسجد'' کے احاطہ کے اندر ہونا متعین کیا، پھر ہندو طبقہ کے بعض مفاد پرست افراد کو آمادہ کیا گیا کہ وہ ان دونوں مقامات کے حاصل کرنے کی کوشش کریں چونکہ ''نواب واجد علی شاہ کا وزیر'' نقی علی خان رشوت خور ہونے کے ساتھ انگریزوں کا وفادار تھا اس لئے اس نے بھی اس افسانے کے خاکے میں رنگ بھرنے کی خدمت انجام دی اور'' واجد علی شاہ'' کو اس پر راضی کرلیا کہ حدود مسجد سے باہر لیکن اس کے احاطہ کے اندر'' رام استھان'' اور سیتا رسوئی گھر کے لئے جگہ دیدی جائے چنانچہ مسجد کے مسقّف حصہ کے بالمقابل داہنی سمت احاطہ کی دیوار سے متصل سیتا رسوئی کیلئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں اور پورب کی طرف ''جنم استھان'' کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۱۷ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی جس پر ایک بالشت بلند چبوترہ بنانے کی اجازت تھی ...اسی موقع پر مسجد کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا، جواب تک بالکل کھلا ہوا تھا، یہ ہے سیتا رسوئی اور جنم استھان کی اصل حقیقت سچ کہا ہے حافظ شیرازی نے:

چوں نہ یابند حقیقت در افسانہ زدند

جنم استھان کو جس دیومالائی حیثیت سے ثابت کیا گیا تھا وہ عوام کو تو کسی حد تک متاثر کرسکتا تھا، لیکن پڑھا لکھا طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہوسکتا تھا اس لئے اس دیومالائی کارروائی کے ایک عرصہ بعد جب فیض آباد کا نیا گزیٹیر مرتب کیا گیا تو پہلی بار اس میں یہ افسانہ بھی گھڑ کر لکھا گیا کہ ۱۵۲۸÷ میں'' بابر'' اجودھیا آیا اور ایک ہفتہ یہاں قیام کیا اس قدیم مندر (رام جنم استھان) کو ڈھادیا اور اسی مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جواب تک ''بابری مسجد'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ حکومت اترپردیش نے ۱۹۶۰÷ میں ضلع فیض آباد کا جو گزیٹیر شائع کیا اسی میں اس انگریزی افسانہ کو بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے درج کردیا، حکومت یوپی کا یہ رویہ بتارہا ہے کہ ہماری حکومت ذہنی طور پر آج بھی انگریزوں کی غلام ہے جو آزاد قوم کے لئے انتہائی ننگ و عار کی بات ہے۔

اختلاف کا آغاز

بہر حال انگریزوں کی یہ چال کامیاب ہوگئی اور اجودھیا میں آباد ہندو مسلم دونوں فرقوں میں اس مسئلہ کو لے کر کشیدگی شروع ہوگئی چنانچہ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں رکھوبیر داس نامی مہنت نے سب جج کی عدالت میں ایک دعویٰ دائر کیا کہ ''جنم بھومی استھان پر کوئی عمارت نہیں ہے اور پوجاریوں کو جاڑا گرمی اور برسات میں تکلیف ہوتی ہے لہٰذا اس پر عمارت بنانے کی اجازت دی جائے اس نے اپنے دعویٰ میں یہ بھی ظاہر کیا کہ مسلمانوں کے اعتراض پر ڈسٹرکٹ جج نے رام جنم بھومی چبوترہ پر عمارت تعمیر کرنے سے روک دیا ہے۔

سب جج ہری کشن پنڈت نے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا وہ اپنے فیصلے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے، اس احاطہ میں جس پھاٹک سے داخلہ ہوتا ہے اس پر لفظ ''اللہ'' کندہ ہے اس کے فوراً بعد بائیں جانب چبوترہ ہے جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اس چبوترہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رام جنم استھان ہے چبوترہ کے چاروں طرف مسجد کی دیوار ہے چبوترہ اور مسجد کے درمیان علیحدہ علیحدہ حد بندی ہے، اگر اس چبوترہ پر مندر تعمیر ہوا اور اس میں گھنٹیاں اور سنکھ بجائے گئے اور مسلمانوں کا گذر ہوتا رہا تو مستقبل میں بہت زیادہ خون خرابہ کا اندیشہ ہے اور ہزاروں جانیں تلف ہوسکتی ہیں اس لئے مندر کی تعمیر کی اجازت دینے کا مطلب بلوا، قتل اور فساد کو دعوت دینا ہے اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی جائے اس مقدمہ کے دعویٰ اور فیصلہ دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنم استھان کا چبوترہ مسجد سے باہر تھا۔

اس فیصلہ کے خلاف اپیل بھی ضلع مجسٹریٹ فیض آباد نے ۲۶/مارچ ۱۸۸۵ء کو خارج کر دی دیکھئے سول اپیل (۲۷) ۱۸۸۶ء اگرچہ اس مقدمہ کے وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان عملی طور پر کشیدگی پیدا ہوگئی جو دن بدن بڑھتی رہی لیکن مسلمان معمول کے مطابق مسجد میں پنج وقتہ نماز پڑھتے رہے چنانچہ تعمیر کے وقت یعنی ۱۵۲۸ء/ ۹۳۵ھ

سے۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک بغیر کسی رکاوٹ کے پنج وقتہ باجماعت نماز ہوتی رہی اور مستقل طور پر اس مسجد کے مؤذن اور امام مغلیہ عہد سے برابر متعین ہوتے رہے مسجد کے مصارف کے لئے مغلیہ عہد میں ساٹھ روپے سالانہ سرکاری خزانہ سے مقرر تھا نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپئے تین آنہ ٦ پائی کر دی گئی برٹش حکومت نے بھی اس رقم کو جاری رکھا پھر بندوبست اول کے وقت رقم کی بجائے دو گاؤں ''بھورن پور'' اور ''شولا پور'' متصل اجودھیا بطور معافی .... دیئے گئے، جن کی آمدنی برابر مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹر زیر دفعہ (۳۰) میں اس وقت کے متولی، جواد حسین ساکن موضع شہنواں ڈاکخانہ درشن نگر ضلع فیض آباد اور جائداد کی تفصیل، عمارت مسجد بابری مع اراضی واقع موضع بہورن پور اور شولا پور تحصیل و ضلع فیض آباد درج ہے، پھر سنی وقف ایکٹ ۱۳/ ۱۹۲۰ کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معائنہ کر کے اس کا با قاعدہ رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔

غرضے کہ ۱۹۴۹ء تک تاریخی اور قانونی ہر اعتبار سے ''بابری مسجد'' بغیر کسی اختلاف اور نزاع کے مسجد کی حیثیت سے مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور مسلمان بغیر کسی مزاحمت اور روک ٹوک کے اس میں پنج وقتہ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

بابری مسجد میں مجرمانہ طور پر مورتی کی تنصیب

۴۹-۱۹۴۸ء میں ملک کے اندر بالخصوص یوپی، دہلی، میوات، پنجاب وغیرہ صوبوں میں اس بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وخوں ریزی کے حادثات ہوئے کہ اس نے ملک کے سارے نظام کو کچھ دنوں کے لئے معطل کر کے رکھ دیا، اسی اتھل پتھل اور افراتفری کے زمانہ میں ۲۲، ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ''ابھے رام داس'' نے ضلع مجسٹریٹ ''کے، کے، نائر'' کی سازش اور اپنے چیلوں کی مدد سے مسجد کی دیوار پھاند کر مسجد میں گھس گئے اور مسجد کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر ''رام کی مورتی'' رکھ دی صبح کو جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے گئے تو مورتی کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے اور اسی وقت مورتی کو نکالنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۲۳ر کی صبح کو ڈیوٹی پر

متعین پولیس ''ماتو پرشاد'' نے اس وقت کے تھانہ انچارج ''شری رام دیو'' کو جو تحریری رپورٹ درج کرائی اس میں لکھا ہے کہ ''ابھے رام داس، شکل داس، سدرشن داس، اور پچاس، ساٹھ آدمی نامعلوم نے مسجد میں مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا ہے جس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اسی رپورٹ کی بنیاد پر سٹی مجسٹریٹ ضلع فیض آباد نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر لیا اور پریہ دت رام چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو ریسیور مقرر کر کے مسجد پر تالا ڈال دیا اور فریقین کے نام نوٹس جاری کر دی کہ وہ اپنے اپنے دعویٰ کے سلسلے میں ثبوت پیش کریں۔

اس انتہائی مجرمانہ اور غیر مذہبی حرکت پر پورے ملک کے مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی چنانچہ جمعیۃ علماء کے اکابر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی وغیرہ نے صورت حال کی نزاکت سے اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی ''جواہر لال نہرو'' کو مطلع کیا پنڈت جواہر لال جی نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری پنتھ کو لکھا کہ وہ ضلع مجسٹریٹ کو حکم دیں کہ مسجد سے مورتی فوراً نکال دی جائے چنانچہ پنتھ نے وزیر اعظم کے حکم کے مطابق ضلع مجسٹریٹ کو یہ آرڈ بھیج دیا چونکہ ضلع مجسٹریٹ اس سازش میں خود ملوث تھا اس لئے اس آرڈر پر عمل کرنے کے بجائے اس نے ابھے رام داس وغیرہ کو نئی صورت حال کی اطلاع دیدی اور ان سے کہا کہ میں اس آرڈر کے نفاذ میں کچھ تاخیر کر دوں گا تم لوگ اس درمیان میں عدالت سے اسٹے حاصل کر لو ان لوگوں نے اس کے کہنے کے مطابق اس حکم کے خلاف عدالت سے اسٹے حاصل کر لیا اس طرح مورتی مسجد سے ہٹائی نہ جا سکی، چنانچہ ضلع مجسٹریٹ، کے، کے نائر سے پنتھ جی نے اسی بنیاد پر استعفا لے لیا، لیکن اس کے بعد پنتھ جی نے اس معاملہ میں دلچسپی نہیں لی اور مورتی اسی جگہ باقی رہی۔

مقدمات کا سلسلہ

مسجد میں مورتی کو غیر قانونی طور پر رکھنے کے تقریباً ۲۳-۲۴ دن بعد ۱۶/جنوری

۱۹۵۰÷ کو ہندو فرقہ کے ایک شخص گوپال سنگھ نامی کی طرف سے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسین عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی ایم، سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کیا گیا کہ یہ جنم بھومی ہے ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مسلمانوں اور ضلع انتظامیہ نے اس میں رکاوٹ ڈال دی ہے لہٰذا اس رکاوٹ کو ختم کر کے ہمیں پوجا پاٹ کی اجازت دی جائے۔ یاد رہے کہ ۱۸۸۵÷ کے دعویٰ میں جو رگھوناتھ داس کی طرف سے دائر کیا گیا تھا، اس میں مسجد کے باہر چبوترہ کو جنم استھان بتایا گیا تھا اور اسی پر عمارت بنانے کی اجازت چاہی گئی تھی اور اس دعویٰ میں جو نظری نقشہ پیش کیا گیا تھا اس میں مسجد کو ''بابری مسجد'' ہی کی حیثیت سے دکھایا گیا تھا۔

یکم جولائی ۱۹۵۶÷ کو ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے عدالت میں جواب دعویٰ داخل کرتے ہوئے اپنے بیان کے پیراگراف ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، اور ۱۸ میں لکھا ہے:

یہ جائداد نزاعی ''بابری مسجد'' کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمانوں کے ذریعہ عبادت کیلئے استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے اس کا استعمال رام چندر جی کے مندر کے روپ میں کبھی نہیں ہوا ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹÷ کی رات میں رام چندر جی کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا، اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بیچینی پیدا ہوگئی اور علاقے میں نقض امن کا خطرہ پیدا ہوگیا اس لئے سٹی مجسٹریٹ گرودت سنگھ نے ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹÷ کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی اور اسی تاریخ کو ایڈیشنل مجسٹریٹ ''شری مارکھنڈے سنگھ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اس مسجد کو قرق کر کے ریسیور مقرر کر دیا۔''

ڈپٹی کمشنر کے جواب دعویٰ سے ایک ماہ پہلے یعنی یکم جون ۱۹۵۰÷ کو ایس، پی ضلع فیض آباد کرپال سنگھ نے بھی جواب دعویٰ داخل کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ

''یہ زمانۂ قدیم سے ''بابری مسجد'' ہے اور اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔''

اس مقدمہ کے بعد ہندوؤں کی جانب سے دو مقدمات اور دائر کئے گئے ایک پریم ہنس رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑا کی طرف سے، اسکے بعد ۱۹۶۸ء میں یوپی سنٹرل وقف بورڈ اور مسلمانوں کی جانب سے ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں جمعیۃ علماء کی طرف سے مولانا نصیر احمد صاحب فیض آبادی بھی مدعی تھے، اس دعویٰ میں کہا گیا تھا کہ یہ ''بابری مسجد'' مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ء سے برابر عبادت کرتے چلے آرہے ہیں یہ مسجد ان کو واپس دی جائے اور نماز میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

اب تک ان تمام مقدموں کی فائل الگ الگ تھیں بغرض سہولت عدالت کے حکم سے انہیں یکجا کر دیا گیا اور سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۶۱/۱۲ کو رہنما کیس قرار دیدیا گیا۔

اسی اثناء میں ریسیور پریہ دت کا انتقال ہو گیا، تو عدالت نے ان کی جگہ ''شری کے کے رام ورما'' آنریری مجسٹریٹ کو ریسیور مقرر کیا اسی درمیان مسلمانوں کو اطلاع ملی کی مسجد میں تبدیلی کی جارہی ہے، اس لئے انھوں نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے الگ کرنے کی درخواست دی مسلمانوں کی شکایت کو صحیح مانتے ہوئے سول جج نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے ہٹانے کا حکم دیدیا اس حکم کے خلاف ہندوؤں نے ہائی کورٹ لکھنؤ بینچ میں ''رویژن'' دائر کر کے اسٹے لے لیا اس موقع پر رہنما کیس اور جملہ مقدمات کی فائل، ہائی کورٹ میں طلب کر لی گئی اور فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے اور تقریباً پندرہ سال کی طویل مدت گذر گئی مگر فیض آباد کی عدالت میں اس مقدمہ کے سلسلے میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی حالانکہ اس مدت میں مسلمانوں کی جانب سے بار بار درخواست پیش کی گئی کہ اس کا فیصلہ جلد کر دیا جائے اور ہائی کورٹ کی طرف سے بھی عدالت فیض آباد کو ہدایت دی گئی کہ اس مقدمہ کا جلد فیصلہ کر دیا جائے مگر اس کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔

دوران مقدمہ خلاف قانون مسجد میں تبدیلیاں

گذشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ ''بابری مسجد'' کے چاروں سمت چہار دیواری ہے، مسجد کا صدر دروازہ اتری سمت ہے اس دروازے پر موٹے خط میں لفظ اللہ کندہ تھا مگر

ریسیوراور پولیس کی نگرانی کے ہوتے ہوئے اسے کھرچ کرمٹادیا گیااوردروازے پر''جنم استھان مندر'' کا ایک بورڈ لگادیا گیا،احاطہ کی اتری چہاردیواری اورصحن مسجد کے درمیانی خالی جگہ پرسفید وسیاہ سنگ مرمر کا فرش بنالیا گیا ہے جسے''پری کرما'' (مطاف) کا نام دیا گیا ہے،صحن مسجد میں اتری جانب ہینڈ پائپ گاڑلیا گیا ہے،صحن مسجد سے باہر پوربی سمت ایک سفالہ پوس مندرتعمیر کرلیا گیا ہے،اسی کے متصل مہنتوں کی قیام گاہ بھی بنالی گئی ہے،دکھن سمت اس چبوترہ پر جسے شروع میں رام جنم استھان کا نام دیا گیا ہے،مندرتعمیر کرلیا گیا ہے اوراسی کے متصل دومندراور بھی بنالئے گئے ہیں،مسجد کے درمیانی گنبد پرایک جھنڈالگادیا گیا ہے، یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷÷ سے ۱۹۸۶÷ کی درمیانی مدت میں کی گئی ہیں جبکہ ریسیور کا تقرر قانونی طور پراس لئے ہوتا ہے کہ متنازع عمارت میں فریقین کی جانب سے کوئی ترمیم واضافہ نہ کیا جاسکے لیکن یہ تمام تبدیلیاں ہوتی رہیں نہ مقرر ریسیور رام ورمانے اس کا کوئی نوٹس لیااورنہ وہاں متعین نگراں پولیس نے اس لئے کہ جذباتی طور پر یہ سب لوگ ان غیرقانونی تبدیلیوں میں باہم شریک کارتھے۔

مسجد مندر بنادی گئی

ہائی کورٹ بنچ لکھنؤ میں ریسیور ورما کے سلسلہ میں داخل رٹ زیرسماعت ہے اور قانونی طور پرابھی اس کے خلاف اپیل نہیں کی جاسکتی لیکن ۲۵رجنوری۱۹۸۶÷ رمیش چندر پانڈے نامی ایک غیرمتعلق شخص نے جواب تک کے کسی مقدمہ میں فریق نہیں ہے منصف صدرفیض آباد کی عدالت میں مقدمہ (۲) ۱۹۵۰÷ میں ایک نئی درخواست دی کہ جنم استھان میں پوجاپاٹ کرنے کی چھوٹ ہونی چاہئے لہٰذا عدالت ضلع انتظامیہ کوحکم دے کہ جنم بھومی یا بابری مسجد کا تالاکھول دے تاکہ ہم اور ہندولوگ بغیرکسی روک ٹوک کے پوجا کرسکیں اس پرمنصف صدرنے.... یہ کہتے ہوئے درخواست خارج کردی کہ اس مقدمہ کی رہنمافائل ہائی کورٹ میں زیرسماعت ہے اس لئے اس درخواست پرکوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا اس فیصلہ کے خلاف ڈسٹرکٹ جج مسٹرکے،ایم پانڈے کی عدالت میں سول اپیل

نمبر (٦) ١٩٨٢ء ٣٠ رجنوری کو داخل کی گئی اور ٣١ رجنوری کو دیوانی کے سرکاری وکیل نرائن دت کھتری پیش ہو گئے ضلع مجسٹریٹ نے ڈی، ایم اور ایس، پی کا بیان لینا چاہا چنانچہ یکم فروری ١٩٨٦ء کو یہ دونوں حکام بھی حاضر ہو گئے جن سے ضلع مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ اگر مسجد یا جنم بھومی کا تالا کھول دیا جائے تو کیا آپ لا اینڈ آرڈر بحال کر سکیں گے جس پر انھوں نے کہا کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے اور ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ اس فرضی کارروائی کے بعد اسی دن یعنی سنیچر کو پونے پانچ بجے جج نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ ضلع انتظامیہ اس جگہ کا تالا کھول دے اور رمیش چندر پانڈے اور دیگر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کیلئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔

مسلمانوں کی طرف سے اس مقدمہ کے سلسلے میں تین درخواستیں دی گئیں لیکن جج نے یہ کہتے ہوئے کہ معاملہ ضلع انتظامیہ سے متعلق ہے اس میں مسلمانوں کو فریق بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تینوں درخواستیں رد کر دیں اور فیصلہ کے فوراً بعد ۵ ربج کر ١٩ رمنٹ پر بابری مسجد کا دروازہ کھول دیا گیا اور ہزاروں ہندو پوجا پاٹ کیلئے اس وقت مسجد میں پہنچ گئے اس طرح سے ۴۵۸ سال کی قدیم مسجد بیک جنبش قلم مندر میں تبدیل کر دی گئی۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؕ

اس مقدمہ کا یہ پہلو کس قدر ڈرامائی ہے کہ اس میں مدعی رمیش پانڈے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اندر کمار پانڈے، ڈسٹرکٹ جج کے، ایم پانڈے اور وکیل ویریشور دودیدی سب کے سب پنڈٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اس میں جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہی سے ظاہر تھا۔

اسی کا شہر وہی مدعی، وہی منصف ہمیں یقین تھا ہمارا قصور نکلے گا

فیصلہ پر ایک نظر

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ پونے پانچ بجے ہوتا ہے لیکن اجودھیا اور

فیض آباد میں پی، اے، سی اضافی طور پر دن کے دو بجے ہی لگادی گئی اور مسلمانوں کے محلوں میں ان کا زبردست گشت شروع ہوگیا اور فیصلے سے پہلے ہی عدالت کو پولیس اور پی، اے سی نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

فیصلہ سے قبل یہ تیاریاں صاف بتلا رہی ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت ہوا ہے، یہ بات بھی کم حیرت کی نہیں ہے کہ صرف پانچ دن کے اندر منصف عدالت سے لے کر ضلع جج کی عدالت تک مقدمہ کی ساری کارروائی عمل میں آگئی اور فیصلہ بھی کر دیا گیا ہندوستان کی عدالتوں میں کیا مقدمات اتنی ہی سرعت کے ساتھ نمٹائے جاتے ہیں، کیا ہندوستانی عدلیہ اس کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟

پھر جو مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہو اس کی اپیل اور وہ بھی ماتحت عدالت میں کس قانونی دفعہ کے تحت کی گئی ہے؟۔

کیا کسی مقدمہ میں فریق ثانی کو نوٹس دیئے بغیر فیصلہ کر دینا قانونی رو سے درست کہا جاسکتا ہے؟

آخری بات

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر اس طرح کے بلکہ اس سے بھی سنگین تر حالات پیش آئے ہیں لیکن مسلمانوں نے اپنے استقلال و استقامت، صبر و تحمل اور حکمت و جرأت سے ہر موقع پر حالات کے رخ کو موڑ دیا ہے اس لئے آج بھی ہمیں تاریخ سے سبق لینا چاہئے غم و غصہ، مایوسی و نامرادی، جھنجھلاہٹ اور چیخ و پکار کے بجائے صبر و استقامت اور جرأت سے خدا کے سہارے آگے بڑھنا چاہئے ظلم و جبر کی کشتی زیادہ دنوں تک نہیں چلتی، کامیابی و کامرانی ہمیشہ حق و انصاف کے قدم چومتی ہے۔

وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین.

☆ ☆ ☆

بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں

﴿۱﴾

مسجد کی تعمیر اور اس کی تاریخی حیثیت

تین گنبدوں والی یہ قدیم مسجد شہنشاہ ''بابر'' کے دور میں اودھ کے حاکم ''میر باقی اصفہانی'' نے ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرائی تھی، مسجد کے مسقّف حصہ میں تین صفیں تھیں اور ہر صف میں ایک سو بیس نمازی کھڑے ہو سکتے تھے، صحن میں چار صفوں کی وسعت تھی، اس طرح بیک وقت ساڑھے آٹھ سو مصلی نماز ادا کر سکتے تھے۔

مسجد کے درمیانی مرکزی در کے اوپر دو میٹر لمبی اور پچپن سینٹی میٹر چوڑی پتھر کی تختی کا ایک کتبہ نصب تھا، جس کی پہلی اوپر سطر میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و بہ ثقتی'' خوشنما بیلوں کے درمیان لکھا ہوا تھا، اور نیچے کی تین سطروں میں یہ اشعار تھے۔

بنام آنکہ او دانائے اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفٰی بعد از ستائش — کہ سرور انبیاء زبدہ جہانی
فسانہ درجہاں بابر قلندر — کہ شد در دور گیتی کامرانی
چنانکہ ہفت کشور در گرفتہ — زمیں را چوں مثالے آسمانی
درآں حضرت یکے میر معظم — کہ نامش میر باقی اصفہانی
مشیرِ سلطنت تدبیر ملکش — کہ ایں مسجد حصار ہست بانی
خدایا درجہاں تابندہ ماند — کہ چتر و تخت و بخت و زندگانی
دریں عہد و دریں تاریخ میموں — کہ نہ صد پنج و سی بودہ نشانی

تمت ہذا التوحید ونعت ومدح وصفت نور اللہ برہانہ بخط عبد الضعیف نحیف فتح اللہ محمد غوری۔

اس بڑے کتبہ کے علاوہ اندرونِ مسجد منبر کی دونوں جانب ایک ایک کتبہ نصب تھا، ۲۷/مارچ ۱۹۳۴÷ کے ہنگامہ کے موقع پر جوگاؤکشی کے عنوان کا بہانہ بنا کر برپا کیا گیا تھا، مسجد میں گھس کر بلوائیوں نے توڑ پھوڑ کی تھی، جس میں یہ دونوں کتبے بھی اٹھالے گئے تھے، بعد میں ''تہور خاں ٹھیکیدار'' نے منبر کی بائیں سمت والے کتبہ کی نقل تیار کرا کے اسی پہلی جگہ پر اسے نصب کرادیا، داہنی جانب کے کتبہ کی ایک نقل سید بدرالحسن فیض آبادی کے پاس محفوظ تھی، اس لئے اس کتبہ کی عبارت بھی دستیاب ہوگئی۔

بائیں سمت کا کتبہ حسب ذیل اشعار پر مشتمل تھا۔

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش بنائیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں مہبط قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

داہنی جانب والے کتبہ کے اشعار یہ تھے۔

بمنشائے بابر خدیو جہاں بنائے کہ با کاخ گردو عناں
بنا کرد ایں خانۂ پائیدار امیر سعادت نشاں میر خاں
بماند ہمیشہ چنیں بانیش چناں شہر یارِ زمیں و زماں

ابتدائے تعمیر سے بابری مسجد میں نماز پنج گانہ اور جمعہ ہوتا رہا ہے، عدالتی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قریب یعنی ۱۸۵۸÷ سے ۱۸۷۰÷ تک اس مسجد کے امام و خطیب ''محمد اصغر'' تھے، ۱۸۷۰÷ تا ۱۹۰۰÷ کی درمیانی مدت میں مولوی ''عبدالرشید'' نے امامت کے فرائض انجام دیئے، ۱۹۰۱÷ سے ۱۹۳۰÷ کے عرصہ میں یہ خدمت مولوی عبدالقادر کے سپرد رہی، اور ۱۹۳۰÷ سے ۱۹۴۹÷ مسجد کے قرق ہونے کی تاریخ تک مولوی عبدالغفار کی اقتداء میں مسلمان اس مسجد میں نماز پنج وقتہ اور جمعہ ادا کرتے تھے، یہ آخری امام ابھی حیات ہیں۔

بابری مسجد کے مصارف کے واسطے عہد مغلیہ میں مبلغ ساٹھ روپے سالانہ شاہی خزانے سے ملتے تھے،نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپے تین آنہ چھ پائی کردی گئی تھی، برطانوی اقتدار میں بھی یہ رقم بحال رہی، پھر بندوبست اول کے وقت نقد کی بجائے دو گاؤں بھورن پور اور شولا پور متصل اجودھیا اس کے مصارف کے لئے دیئے گئے،غرض کہ اپنی ابتداء تعمیر ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ء سے ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء تک یہ مسجد بغیر کسی نزاع واختلاف کے مسجد ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک مقدس ومحترم عبادت گاہ رہی اور مسلمان امن وسکون کے ساتھ اس میں اپنی مذہبی عبادت ادا کرتے تھے۔

﴿۲﴾

مسجد،مندر قضیہ کا آغاز

مستند تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے صدیوں پہلے مسلمان اجودھیا میں آباد تھے،اور یہاں کے ہندو مسلم پوری یک جہتی اور یگانگت کے ساتھ رہتے سہتے تھے، ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ سے پہلے کسی مذہبی معاملہ میں یہاں کے باشندوں کے درمیان کوئی تنازعہ رونما ہوا یا باہمی ٹکراؤ کی نوبت آئی ہو صحیح تاریخوں اور مذہبی نوشتوں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا،لیکن جب اس ملک پر انگریزوں کا منحوس سایہ پڑا اور ان کا یہاں عمل دخل شروع ہوا تو انھوں نے اپنی بدنام زمانہ پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تحت یہاں کے لوگوں میں باہمی منافرت اور تصادم پیدا کرنے کی غرض سے مسجد، مندر، جنم استھان وغیرہ کا خود ساختہ قضیہ چھیڑ دیا جس کے نتیجہ میں ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں اجودھیا کے اندر زبردست خونریزی ہوئی،جس کی تفصیل احقر کی تالیف ''اجودھیا کے اسلامی آثار'' میں ملاحظہ کی جائے،اسی وقت سے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی،اور نوبت بایں جارسید۔

شاطر انگریزوں نے سب سے پہلے ''جنم استھان'' اور ''سیتا کی رسوئی'' کا افسانہ ترتیب دیا اور ایک بدھسٹ نجومی کو پہلے سے سکھا پڑھا کر ان دونوں مقامات کی جگہ معلوم

کی،اس نے طے شدہ سازش کے مطابق زائچہ کھینچ کر بتادیا کہ ''جنم استھان'' اور ''سیتا کی رسوئی'' بابری مسجد سے متصل احاطہ کے اندر ہے، پھراپنے زیر اثر ہندوؤں کو اکسایا کہ ان دونوں ''پوترا استھانوں'' کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، ''نقی علی خاں'' جو نواب واجد علی کا خسر اور وزیر تھا، انگریزوں کی اس سازش میں ان کا مؤید اور طرف دار تھا،اس نے اپنے اثر ورسوخ کے ذریعہ ناعاقبت اندیش نواب کو اس بات پر راضی کرلیا کہ بابری مسجد سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر جنم استھان و سیتا رسوئی کے لئے جگہ دیدی جائے، چنانچہ مسجد کے مسقّف حصہ کے بالمقابل احاطہ مسجد کی دیوار سے متصل داہنی سمت ''سیتا رسوئی'' کے لئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی جانب جنم استھان کے نام سے ۲۱/فٹ لمبی اور ۱۷/فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی، جس پر اسی وقت سے پوجاپاٹ کا سلسلہ بھی شروع کردیا گیا، حالانکہ جس وقت یہ افسانہ ایجاد کیا گیا اس سے برسہا برس پہلے سے قلب شہر میں جنم استھان کا مندر موجود تھا اور آج بھی موجود ہے، اس وقت مسجد اور جنم استھان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کی غرض سے صحن مسجد کے اردگرد آہنی سلاخوں کی باڑھ کھڑی کردی گئی، اسی منحوس تاریخ سے اجودھیا میں مذہبی کش مکش شروع ہوگئی اور یہاں کے ہندو مسلم، مندر مسجد کے نام پر آپس میں دست بگریباں ہوگئے۔

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے
گریباں کو لڑایا آستیں سے

۱۸۵۷÷ میں جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے متحد ہوکر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا بگل بجایا، ضلع فیض آباد کے گزیٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت باہمی اتفاق و یگانگت کو مستحکم کرنے کی غرض سے اجودھیا کے مسلم رہنما امیر علی اور ہندو رہنما بابا چرن داس نے رام جنم استھان اور بابری مسجد کے تنازعہ کو ہمیشہ کے واسطے ختم کرنے کی غرض سے ایک معاہدہ کیا کہ رام جنم استھان کی مخصوص متنازعہ اراضی ہندوؤں کے حوالہ کردی جائے اور ہندو بابری مسجد کی عمارت سے دست کش ہوجائیں، چنانچہ اس معاہدہ پر فریقین خوشی خوشی راضی ہوگئے اور دو سال سے اختلاف کی

جو آگ بھڑک رہی تھی وہ ٹھنڈی ہوگئی، مگر انگریزوں کو یہ ہندو مسلم اتحاد گوارہ نہ ہوا، انھوں نے بابا رام چرن داس اور امیر علی دونوں کو ایک ساتھ املی کے پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دیدی اور مندر مسجد کے نزاع کو از سر نو زندہ کرنے کی غرض سے متنازعہ رام جنم استھان اور بابری مسجد کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی، دونوں کے راستے بھی الگ الگ بنا دیئے اور مسجد کے شمالی دروازہ سے مسجد میں داخلہ پر پابندی عائد کردی، اور —— جذباتی ہندؤں کو اکسایا کہ وہ اس تقسیم کو مسترد کرکے پوری مسجد پر دعویٰ کریں، اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بھی برانگیختہ کیا کہ وہ مسجد کی اراضی کے اس بٹوارہ کو تسلیم نہ کریں چنانچہ یہ کشاکش پھر شروع ہوگئی جس کا ایک طویل سلسلہ ہے، تفصیل کے لئے ''اجودھیا کے اسلامی آثار'' کا مطالعہ کیجئے۔

﴿۳﴾

مسجد کو مندر بنانے کی شرمناک سازش

۴۹/ ۱۹۴۸÷ میں جب کہ ملک فرقہ وارانہ تشدّد کی آگ میں جل رہا تھا، اور پورے ہندوستان میں افراتفری مچی ہوئی تھی ۲۲، ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹÷ کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ''ابھے رام داس'' نے اپنے کچھ چیلوں کے ساتھ مسجد میں گھس کر عین محراب کے اندر ایک مورتی رکھ دی جس کے خلاف اس وقت ڈیوٹی پر مقرر کانسٹبل ''ماتو پرشاد'' نے صبح کو تھانہ میں حسب ذیل رپورٹ درج کرائی۔

> ''ابھے رام داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم لوگوں نے مسجد کے اندر مورتی استھاپت (نصب) کرکے مسجد کو ناپاک کردیا ہے۔ جس سے نقص امن کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔''

اس رپورٹ کو بنیاد بنا کر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کرکے مقفل کردیا اور پر یہ دت رام چیرمین کو اس کی حفاظت کے لئے رسیور مقرر کردیا، نیز فریقین کے نام نوٹس جاری کیا کہ اپنے اپنے دعویٰ پر ثبوت پیش کریں، سٹی مجسٹریٹ کا یہ غیر منصفانہ عمل زبان حال سے بتا رہا ہے کہ مسجد میں

بت رکھنے کی کارروائی گہری سازش کے تحت عمل میں لائی گئی تھی، ورنہ ایک قدیم جمعہ وجماعت سے آباد مسجد کے بارے میں ثبوت طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سیدھی بات یہ تھی کہ ماتو پرشاد کانسٹبل کی رپورٹ کے مطابق مجرمین کو قرار واقعی سزا دی جاتی اور مسجد سے مورتی نکال کر اس مسئلہ کو ختم کر دیا جاتا، مگر حیرت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سنگین معاملہ پر توجہ دلائی اور انھوں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت کو لکھا کہ اس مسئلہ کو فی الفور حل کریں، پھر بھی اس سلسلے میں کوئی مثبت کارروائی نہیں کی گئی، اور مذہبی جانبداری واقتدار سیکولرزم اور قانون وانصاف پر غالب رہا، گویا ملک کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کا اولین صلہ آزاد ہونے کے بعد یہ دیا گیا کہ ان کی قدیم متبرک عبادت گاہ میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور اس کے منبر ومحراب جواب تک رکوع وسجود سے آباد تھے مقفل کر دیئے گئے۔

دیکھیں اس آغاز کا ہوتا ہے کیا انجام کار

اس حادثہ کے وقت مولانا آزاد نے کہا تھا کہ ’’میرے ذہن میں یہ سوال گونج رہا ہے کہ مستقبل میں مسلمانوں کو ایک ملت کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا یا نہیں، اگر اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو بابری مسجد سے بت ہٹا دیئے جائیں گے، اور اگر آئندہ چل کر اس کی نفی ہوتی ہے تو انتظار کیجئے دوسری مسجدوں میں بھی اس طرح کے حادثات پیش آسکتے ہیں۔‘‘ آج کے واقعات سے مولانا آزاد کے خدشات صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

اس حادثہ کے بعد ۱۶؍جنوری ۱۹۵۰ء کو گوپال سنگھ نامی ایک شخص نے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسن عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی، ایم سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کر دیا کہ مسجد جنم استھان ہے، ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مگر مسلمان اور ضلع حکام اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، لہٰذا اس رکاوٹ کو ختم کر کے ہندوؤں کو اس میں پوجا پاٹ کی باضابطہ اجازت دی جائے، اس مقدمہ کے دائر ہونے کے تیسرے دن یعنی ۱۹؍جنوری ۱۹۵۰ء کو عدالت نے ایک حکم امتناعی کے ذریعہ

ہندو مسلمان دونوں کا داخلہ مسجد میں ممنوع قرار دے دیا پھر ۱۳؍ مارچ ۱۹۵۱ء میں عدالت نے پجاری کو مسجد کے اندر جا کر پوجا اور بھوگ کرنے کی اجازت دیدی، مگر مسلمان اپنی عبادت گاہ میں خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کا نام لینے سے محروم رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب ظلم و ناانصافی کو طاقت و حکومت کی پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے تو آئین و قانون اور عدالت سب اس کے آگے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔

دعویٔ مذکورہ کی جواب دہی کرتے ہوئے فیض آباد کے ایس پی کرنا سنگھ نے یکم جون ۱۹۵۰ء کو جو جواب دعویٰ عدالت میں داخل کیا اس میں لکھا تھا کہ

"زمانہ قدیم سے بابری مسجد ہے اس میں مسلمان ہمیشہ سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔"

ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اسی مقدمہ سے متعلق یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو جو حلف نامہ داخل کیا تھا اس میں بھی "بابری مسجد" کی مسجدیت کا اعتراف و اقرار موجود ہے، مذکورہ بالا مقدمہ کے علاوہ ۱۹۶۱ء میں دو مزید مقدمات دائر کئے گئے ایک رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑہ کی طرف سے، جس کے جواب میں جمعیۃ علماء ہند اور یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی طرف سے بھی مقدمات قائم کئے گئے جن میں کہا گیا تھا کہ یہ بابری مسجد مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ء سے برابر عبادت کرتے رہے ہیں لہٰذا یہ مسجد انھیں واپس دی جائے اور نماز وغیرہ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

تقریباً ۳۵؍ سال کے طویل عرصہ تک یہ مقدمات عدالت میں معطل پڑے رہے، ....ان سے متعلق کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی گئی، اس دوران پولیس اور رسیور کی نگرانی کے باوجود مسجد کے اندر اور باہر خلاف قانون بہت سی تبدیلیاں کر دی گئیں، مثلاً مسجد کے صدر دروازہ پر جلی حرفوں میں "اللہ" کندہ تھا جسے کھرچ دیا گیا، دروازہ پر جنم استھان مندر کا بورڈ لگا دیا گیا، احاطہ کی شمالی چہار دیواری اور مسجد کی درمیانی جگہ میں سفید و سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنایا گیا جسے پری کرما کا نام دیا گیا، صحن مسجد میں اتر جانب ایک ہینڈ پائپ نصب کر لیا گیا، مسجد سے باہر پورب سمت ایک سفالہ پوش مندر اور مندر کے پجاری کے لئے ایک کمرہ تعمیر

کرلیا گیا دکھن جانب نام نہاد جنم استھان کے چبوترہ پر بھی ایک مندر بنالیا گیا اور مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک بھگوا جھنڈا لگا دیا گیا یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷÷ اور ۱۹۸۶÷ کے درمیانی عرصہ میں کی گئیں مگر رسیور، انتظامیہ اور عدالت کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

﴿۴﴾

عدالت نے اقتدار کے دباؤ میں مسجد کے اندر مورتی پوجا کی غیر منصفانہ اجازت دیدی

مسلمانوں کو کسی حد تک اطمینان تھا کہ مسجد مقفل ہے اور ہائی کورٹ میں اس کے مقدمات کی سماعت ہورہی ہے، عدلیہ اس بارے میں جو فیصلہ کرے گی اسے تسلیم کرلیا جائے گا، کیونکہ عدلیہ پر ان کا اعتماد ابھی مجروح نہیں ہوا تھا، اسی پرامن ماحول میں ۲۵/جنوری ۱۹۸۶÷ کو ''رمیش پانڈے'' ایک غیر متعلق شخص نے جو بابری مسجد سے متعلق کسی بھی مقدمہ میں فریق نہیں تھا صدر منصف فیض آباد کی عدالت میں یہ درخواست گذاری کہ

> ''جنم استھان میں پوجا پاٹ کی اجازت ہونی چاہئے اس لئے عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ میں اور دوسرے ہندو بغیر کسی رکاوٹ کے پوجا کرسکیں۔''

صدر منصف نے یہ کہہ کر درخواست مسترد کردی کہ ''اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا'' منصف کے اس فیصلہ کے خلاف مسٹر کے، ایم، پانڈے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ۳۰/جنوری ۱۹۸۶÷ کو اپیل دائر کی گئی ڈسٹرکٹ جج نے یکم فروری ۱۹۸۶÷ کو پونے بارہ بجے یہ یکطرفہ فیصلہ سنا دیا کہ ''ضلع انتظامیہ تالا کھول دے اور رمیش پانڈے و دیگر پجاریوں کو پوجا پاٹ کی عام اجازت دی جائے، اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کے لئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔''

اس غیر عادلانہ فیصلے کے بعد بغیر کسی تاخیر کے ۵ر بجکر ۱۹ر منٹ پر بابری مسجد کا تالا کھول دیا گیا جو ۱۹۵۰؁ میں حکم امتناعی کے نفاذ میں لگایا گیا تھا اور ہزاروں ہندو جو وہاں جمع کئے گئے تھے پوجا پاٹ کے لئے مسجد میں داخل ہوگئے، تالا کھولنے کی اس شرمناک تقریب کو ہمارے سیکولر ملک کے نشریاتی ادارہ ''دوردرشن'' نے بڑے اہتمام سے نشر کیا تاکہ مسلمانوں کے زخمی دلوں پر اچھی طرح سے نمک پاشی ہوجائے، علاوہ ازیں پورے ملک میں اس کا جشن منایا گیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو شکست دیدی گئی، اس کھلی ہوئی بے انصافی پر مسلمانوں کی طرف سے احتجاج کیا گیا تو رائفل کی گولیوں سے احتجاج کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا گیا، خاص طور پر بارہ بنکی، بنارس، بنگلور وغیرہ شہروں میں سرکاری پولیس نے مسلمانوں کے خلاف دردناک بہیمیت کا برتاؤ کیا، بعد میں یہ بات عام طور پر مشہور ہوگئی کہ سیکولرزم کی علمبردار کانگریس حکومت کے وزیراعلیٰ اترپردیش اور ایک مرکزی وزیر کے اشارے پر تالا کھولا گیا تھا، آئندہ کے واقعات ومشاہدات نے واضح کردیا کہ یہ شہرت بے بنیاد نہیں تھی۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ بغیر مضبوط سیاسی پشت پناہی کے عدالت کو اس طرح سے قانون وانصاف کی دھجیاں اڑانے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔

﴿۵﴾

مسجد کو مسمار کرکے اسکی جگہ پر رام مندر بنانے کا مجرمانہ اعلان وسرگرمیاں

مسجد میں عام پوجا پاٹ کی اجازت حاصل ہوجانے سے ہندو احیاء پرستوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور اب ایک قدم آگے بڑھا کر مسجد کو منہدم کرکے اس کی جگہ نیا مندر بنانے کی تشدد آمیز جدوجہد شروع کردی گئی، حکومتوں کے تجاہل اور دورخی پالیسی کی بنا پر انھیں مزید حوصلہ ملا، چنانچہ وشوہندو پریشد کے سربراہ سنگھل نے دھمکی کی زبان میں یہ کھلا اعلان کیا کہ ۹ر نومبر ۱۹۸۹؁ کو مندر کا شلانیاس (سنگِ بنیاد) ہوگا، اور ملک کی کسی سیاسی پارٹی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ ہمارے اس پروگرام کو روک دے عام ہندؤں کو ہم نوا بنانے

کی غرض سے پروگرام یوں ترتیب دیا گیا کہ ۳۰/ستمبر ۱۹۸۹÷ سے ملک گیر شلا پوجن مہم شروع کی جائے جس کے تحت ملک بھر کے پانچ لاکھ پچھتّر ہزار گاؤں میں ایک ایک شلا (اینٹ) بھیج کر اس کا پوجن کرایا جائے اور دیواستھان اکادشی (۹/نومبر) کے دن یہ ساری اینٹیں اجودھیا پہنچادی جائیں اور اسی دن رام مندر کا شلا نیاس کیا جائے، وشو ہندو پریشد وغیرہ جارحیت پسند تنظیمیں اپنے سربراہ کے اعلان کے مطابق شلا پوجن کے نام پر گاؤں گاؤں گھوم کر نفرت وتشدد کا زہر پھیلاتی رہیں اور ہماری سیکولر حکومتیں اپنی خاموشی سے ان کا تعاون کرتی رہیں تا آنکہ کانگریسی حکومت کے وزیر داخلہ نے متعینہ تاریخ یعنی ۹/نومبر کو وشو ہندو پریشد کے ہاتھوں متنازعہ اراضی پر شلا نیاس کی اجازت دے کر مسلمانوں کو آگاہ کردیا کہ بابری مسجد کے انہدام اور مندر کی تعمیر کا وقت قریب آگیا ہے، وزیر داخلہ نے اس سلسلہ میں حیرت ناک حد تک گمراہ کن رویہ اختیار کیا، ایک طرف تو وہ اعلان کرتے رہے کہ متنازعہ جگہ پر شلا نیاس کی اجازت نہیں دی جائے گی اور دوسری طرف اندر اندر وشو ہندو پریشد سے ساز باز بھی کرتے رہے، حکومت کی اس منافقانہ پالیسی نے فرقہ پرست تنظیموں کو اس قدر جری بنادیا کہ ۲۳/جون ۱۹۹۰÷ کو ہری دوار میں ہندو مذہبی لیڈروں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر طے کیا کہ اگست سے اکتوبر تک پورے ملک میں جگہ جگہ جلوس نکالے جائیں، گاؤں گاؤں سے مندر کی تعمیر کے لئے والنٹیر جمع کئے جائیں، اور ۳۰/اکتوبر کو مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کا کام شروع کردیا جائے، اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آر، ایس ایس، بی، جے، پی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور ان کی ہم نوا تمام فرقہ پرست پارٹیاں میدان میں نکل پڑیں، بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی نے سومناتھ سے اجودھیا تک کی رتھ یاترا شروع کی، اس رتھ یاترا میں انتہائی اشتعال انگیز اور دل خراش تقریریں کی گئیں، جس کے نتیجہ میں بڑودہ، بنگلور، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور یوپی کے بعض اضلاع میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی، لیکن حکومت وقت جس کی اولین واہم ترین ذمہ داری اپنے شہریوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت ہے خود اپنی حفاظت کے بندوبست اور اپنی جان بچانے کی فکر میں مصروف رہی

اور جارحیت کا عفریت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم کر آگ وخون کا طوفان برپا کرتا رہا بہرحال اعلان کے مطابق بھاری تعداد میں کارسیوک ۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو اجودھیا پہنچ گئے، اور بابری مسجد کو مسمار کرنے کی اپنی جیسی کوششیں بھی کیں، حتی کہ مسجد کے گنبدوں اور دیواروں کو مجروح بھی کر دیا، مگر وزیر اعلیٰ یوپی کے سخت رویہ کی وجہ سے انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے قابل تعریف ہمت وجرأت کا ثبوت دیا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر نہ صرف بابری مسجد کو بچالیا بلکہ سیکولر اور جمہوری قدروں کی آبرو رکھ لی رام بھگت اور کارسیوک کے نام سے اجودھیا میں اکٹھا بلوائی جب بابری مسجد کے انہدام میں ناکام ہوگئے تو انھوں نے اپنا غصہ مسلمانوں پر اتارا، اور پی، اے، سی کے تعاون سے ملک گیر فساد برپا کر دیا جس میں سینکڑوں مسلمان شہید کئے گئے اور ان کی کروڑوں کی جائیدادیں لوٹ لیں، یا نذر آتش کر دی گئیں، وی، پی سنگھ جنھوں نے بھاجپا کے اشتراک سے حکومت بنائی تھی اپنے اقتدار کو بچانے کی غرض سے منافقانہ پالیسی پر عمل پیرا رہے، لیکن ان کا یہ بزدلانہ رویہ ان کی کرسیٔ اقتدار کو نہ بچا سکا، نفرت کی آگ نے ملک کے امن کے ساتھ اسے بھی بھسم کر دیا۔

وی، پی سنگھ سرکار کے خاتمہ کے بعد چندر سیکھر نے زمام اقتدار سنبھالی انھوں نے اپنے عہد حکومت میں یہ کام کیا کہ وشو ہندو پریشد اور اس کی حلیف پارٹیوں کو (جنھوں نے روز اول سے تشدد کی راہ اختیار کر کے نہ صرف مصالحانہ گفت وشنید کا دروازہ بند کر رکھا تھا بلکہ عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھیں) بات چیت پر راضی کر لیا، چنانچہ ان کے اور ایکشن کمیٹی بابری مسجد کے لیڈروں کے درمیان براہ راست گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، فریقین نے اپنے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحریری دلائل بھی فراہم کئے، گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ چندر سیکھر حکومت ہی ختم ہوگئی، بالآخر ملک میں الیکشن ہوا جس کے نتیجہ میں کلیان سنگھ کی زیر سرکردگی یوپی میں بھاجپا کی حکومت قائم ہوئی اور مرکز میں کانگریس نے سیکولرزم کی علامت نرسمہاراؤ کی قیادت میں حکومت بنائی۔

﴿۶﴾

بابری مسجد کی المناک شہادت

بھارتیہ جنتا پارٹی اپنی فرقہ پرست ذہنیت کی بناپر ہمیشہ ہی سے بابری مسجد کونفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اوراسے غلامی کی علامت قرار دیتی تھی، اب ریاست میں اس کی حکومت تھی اس لئے وہ اس مسجد کو کیونکر برداشت کرسکتی تھی، چنانچہ بھاجپائی وزیراعلیٰ کلیان سنگھ نے وزارت سازی کے بعد جواولین کام کیاوہ یہ تھا کہ اپنے وزیروں کوساتھ لے کراجودھیا آئے اور بابری مسجد میں نصب مورتی کے پاس کھڑے ہوکر یہ عہد کیا کہ ''رام للّٰہ ہم آئیں گے مندریہیں بنائیں گے'' اس عہدوپیمان کے بعد کلیان سنگھ حکومت نے قانون وانصاف کونظرانداز کر کے رام مندر کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کی مہم شروع کردی، بابری مسجد سے ملحق موقوفہ متنازعہ اراضی کو اپنی تحویل میں لے لیا، پھر اسے وشوہندو پرشید کے حوالہ کردیا، جس پر مستحکم بنیادوں کے ساتھ پختہ چبوترہ کی تعمیر کا کام نہایت زور وشور کے ساتھ جاری ہوگیا، جبکہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے احکامات تھے کہ متنازعہ جگہ پر کسی قسم کی تعمیر نہ کی جائے، توہین عدالت کا ارتکاب کرتے ہوئے تعمیر ہوتی رہی اور مسلم لیڈران اس غیر قانونی اقدام پر مرکزی سرکار سے احتجاج کرتے رہے، لیکن مرکزی حکومت نے اس وقت تک کوئی مؤثر حرکت نہیں کی جب تک کہ وشوہندو پریشد نے اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کرلی۔

چبوترہ کی تعمیر کے بعد وزیراعظم نے فریقین کے درمیان ازسرنو مذاکرات کا سلسلہ شروع کرایا جس کے دو دور حکومت کے ترجمان کے بقول اطمینان بخش اور امید افزا رہے، تیسرے دور کا آغاز ہونے والا ہی تھا کہ اچانک حیرتناک انداز میں وشوہندو پریشد نے یکطرفہ اعلان کردیا کہ ۶؍دسمبر ۱۹۹۱ء کو کارسیوا ہوگی، ظاہر ہے کہ اس اعلان کے بعد گفت وشنید کی کیا گنجائش تھی، اس لئے یہ سلسلہ ختم ہوگیا، کارسیوا کے اعلان ہوتے ہی ساری فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آگئیں۔ بھاجپا کے سابق اور موجودہ صدر اڈوانی اور جوشی یاترا

پر نکل پڑے، تخریب کار عناصر کار سیوک کے نام پر اجودھیا میں جمع ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک کا ماحول کشیدہ وسراسیمہ ہوگیا۔

یوپی کے وزیراعلیٰ کلیان سنگھ نے عدالت اور مرکزی حکومت کو حلفیہ اطمینان دلایا کہ کارسیوا صرف علامتی ہوگی، عدالت اور مرکزی حکومت کے حکم کی سرمو خلاف ورزی نہیں ہوگی، مرکزی وزیر داخلہ قوم کو اطمینان دلاتے رہے کہ بابری مسجد کی حفاظت کا پورا منصوبہ مرتب کرلیا گیا ہے، سیکولر نواز وزیراعظم ہند بھی اعلان پر اعلان کرتے رہے کہ بابری مسجد کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے مرکز سے - اچھی خاصی تعداد میں فوج بھی اجودھیا پہنچ گئی مگر اسے نامعلوم مصالح کی بنیاد پر بابری مسجد سے دوڈھائی کلومیٹر دور رکھا گیا، صوبہ اور مرکز کے نیم فوجی دستے مسجد کی حفاظت کے لئے اس کے چاروں سمت میں متعین کئے گئے مگر انھیں وزیراعظم کی سخت ہدایت تھی کہ رام بھگتوں پر کسی حال میں بھی گولی نہ چلائی جائے۔

بہرحال ان سارے اعلانات و انتظامات کے سائے میں ۶ر دسمبر کی وحشتناک تاریخ آگئی، ایڈوانی، سنگھل، ونے کٹیار، اوما بھارتی وغیرہ دولاکھ کارسیوکوں کی فوج لئے اجودھیا کے میدان میں پہلے ہی سے موجود تھے، ان لیڈروں کی رہنمائی میں کارسیوا شروع ہوئی اور تشدد پر آمادہ تربیت یافتہ کارسیوکوں نے گیارہ بج کر پچپن منٹ پر بابری مسجد پر دھاوا بول دیا اور بغیر کسی مزاحمت کے پورے اطمینان سے چار بجے تک اسے توڑتے اور ملبہ کو دور پھینکتے رہے یہاں تک کہ صفحۂ زمین سے بابری مسجد کا نام ونشان ختم کردیا گیا۔

وزیر داخلہ اور وزیراعظم کو ایک ایک منٹ کی خبر پہنچتی رہی مگر نہ مسجد کی حفاظت کا مرتبہ منصوبہ روبہ عمل آیا اور نہ ہی اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا فریضہ ادا کیا گیا، اس طرح ۲۲ر۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو بابری مسجد کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی تھی، ۶ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو سیکولرزم وجمہوریت کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

وزیراعلیٰ کلیان سنگھ کا منصوبہ چونکہ پورا ہوچکا تھا اس لئے وہ حکومت سے دست بردار ہوگئے، نظم ونسق کی ذمہ داری مرکز کے سرآگئی، صدر راج کا نفاذ ہوگیا، اس کے

باوجود تقریباً ۴۸ گھنٹے تک اجودھیا مکمل طور پر کارسیوکوں کے تصرف میں رہا جنھوں نے اجودھیا کی دیگر بہت ساری مسجدوں کو بھی بالکل مسمار کردیا یا توڑ پھوڑ کر اپنے خیال میں ناقابل استعمال بنادیا، اوراجودھیا میں آباد مسلم گھرانوں کو تہس نہس کرڈالا، اسی وقفہ میں بابری مسجد کی جگہ پر ایک گھروندا بنا کر مورتی نصب کردی جس کی پوجا پاٹ بھی شروع کردی گئی، رام بھگت جب اپنی رام بھگتی کے سارے کاموں سے باطمینان فارغ ہوگئے تو مرکزی سرکار کے انتظام میں سرکاری سواریوں کے ذریعہ باعزت طور پر انھیں ان کے ٹھکانوں تک پہنچا دیا گیا۔

مسلمانوں کے مذہبی ناموس پر یہ ایسا حملہ تھا جس کی کرب ناکی سے بے چین اور مضطرب ہوکروہ چیخ اٹھے تو مظلوموں کی یہ بیتابانہ آہ بھی ہماری سیکولرحکومتوں کو گوارہ نہیں ہوئی جس کی سزا میں ہزاروں مسلمانوں کو خون کی موجوں اور آگ کی لہروں میں غرق کردیا گیا، آج وہ کون سی ریاست ہے جو مظلوم مسلمانوں کے خون سے لہولہان نہیں ہے، وہ کون سا شہر ہے جس کی فضا یتیموں کی گریہ وزاری، بیواؤں کے نالۂ وشیون اورغمزدہ ماؤں کی آہ سرد سے کربناک نہیں ہے، جمہوریت اور سیکولرزم کے دعویدار ملک اور ایک سیکولر پارٹی کی حکومت میں اس جماعت پر یہ انسانیت سوز مظالم جس نے ملک کی آزادی میں بے لوث قربانیاں دی ہیں کس قدر شرمناک بات ہے، آخر مسلمان اس ملک کی قربان گاہ پر کب تک بھینٹ چڑھتا رہے گا۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیۓ اے ارض وطن　　جو ترے عارض بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا　　کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

سب کچھ لٹ جانے کے بعد وزیر داخلہ ہند صاحب بیان دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انھیں مکمل انصاف ملے گا، وزیر اعظم نے بھی اعلان کیا کہ بابری مسجد دوبارہ تعمیر کرائی جائے گی، مگر اس اعلان پر ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ بمبئ میں مسلمانوں پر شیوسینا کے خونخوار درندے ٹوٹ پڑے، سیکڑوں مسلمان ان کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے، اربوں کھربوں کی ان کی املاک لوٹ لی گئیں یا نذرِ آتش کردی گئیں، شیوسینا

کے یہ درندے عروس البلاد میں درندگی مچاتے گھومتے رہے اور ہماری حکومت دم سادھے بیٹھی رہی، جب مسلمانوں کا خون پیتے پیتے ان درندوں کا جی بھر گیا تب جا کر بہیمیت کا یہ رقص ختم ہوا، رہا بابری مسجد کی تعمیر کا مسئلہ، تو جو حکومت قدیم عمارت کی حفاظت نہ کرسکی اس سے جدید تعمیر کی توقع رکھنی خود اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔

اس وقت تو حکومت تذبذب کا شکار ہے ایک طرف قانون وانصاف کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف ووٹ اور کرسیٔ اقتدار کا مسئلہ ہے، اس لئے گھبراہٹ میں کبھی آرڈی نَنس کا سہارا لے رہی ہے تو کبھی عدالت کی پناہ تلاش کرتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے نینی سنٹرل جیل میں بغاوت کے مقدمہ میں اپنا جو تحریری بیان دیا تھا اس کے درج ذیل اقتباس کو تاریخ کے حوالہ کے بغیر پڑھئے، اس کی ایک ایک سطر میں حالات حاضرہ کی عکاسی نظر آئے گی، مولانا آزاد اپنے بیان کے ایک پیراگراف میں لکھتے ہیں:

> ''یہ پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آرہی ہے ایک طرف وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر وتشدد کرے، دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائش قانون وعدالت کی آڑ بھی قائم رہے، یہ دونوں باتیں متضاد ہیں، ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی ودرماندگی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔
>
> میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے اس لئے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کرلیں گے، شریف آدمیوں نے سچ مچ آنکھیں بند کرلی ہیں لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں، فی الحقیقت ''لا'' اور ''آرڈر'' کا ایک ڈرامہ کھیلا جارہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں وہ تماشا کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح دردانگیز بھی، لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔''

بابری مسجد کی تاریخ کے ساتویں مرحلے کا انتظار کیجئے دیکھئے یہ کب معرض وجود میں آتا ہے۔ ''لعلّ اللہ یحدث بعد ذلك امرًا''

نظامِ امارت فی الہند کی مختصر تاریخ

احیاء دین، اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام وفرمان کے نفاذ واجراء کے لئے نظام امارت وتنظیم جماعت کی ضرورت واہمیت کو ہمارے اسلاف نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ بلکہ حالات نے جب بھی اجازت دی حسب استطاعت اس اہم ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ جدوجہد کی ہے۔ اور احوال وظروف کے مطابق بتوفیق ایزدی مکی ومدنی دونوں عہد کی سنتوں کو زندہ کردکھایا ہے۔ آئندہ صفحات میں اکابر رحمہم اللہ کی اسی انقلابی جدوجہد کی مختصر تاریخ پیش کی جارہی ہے۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے شبہات کے پردے ہٹیں گے۔ خدشات کے زخم مندمل ہوں گے مسافران منزل کو حوصلہ ملے گا۔ اور اس راہ کی صعوبتوں کے تصور نے جن کی ہمتیں پست کردی ہیں۔ ان میں بھی قدم سے قدم ملاکر چلنے کی ہمت پیدا ہوگی۔

(۱) امارتِ شرعیہ کی تاسیس

قیام امارت کی ضرورت علمائے اسلام نے اسی وقت محسوس کرلی تھی جبکہ ہندوستان کی مسلم حکومت کا چراغ مفلس کے دیئے کی طرح ٹمٹمانے لگا تھا۔ چنانچہ اس عہد کے جماعتِ علماء کے سربراہ اور خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم وچراغ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ دارالحرب وقیامِ امارت اسی احساس کا جرأت مندانہ اظہار تھا۔ اور اس فتویٰ کو غیر منقسم ہندوستان میں پہلی بار جس جماعت نے عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا وہ بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی ساختہ پرداختہ تھی۔ یعنی حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور آپ کے رفقاء کار۔ اس اجمال کی تفصیل جناب غلام رسول مہر کی زبانی سنئے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں۔

''سید صاحب سرحد تشریف لائے تھے تو آپ کو یقین ہوگا کہ شرع شریف کے احکام کی پابندی اور اسلامیت پر فداکاری میں اہل سرحد مسلمانان ہند سے فائق و برتر ہونگے ،لیکن یہاں پہنچ کر دو برس تک ایک ایک طبقے کے احوال ومراسم دیکھ چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام بھی رسمی ہے اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اس وقت اہل سرحد کی زندگی جاہلیت کے الواث سے آلودہ تھی لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ سروسامان جہاد کے ساتھ ساتھ انھیں اسلامیت کا پابند بنایا جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ جہاد کی بیعت کے ساتھ ساتھ سب سے اقامتِ شریعت کی بیعت بھی لی جائے پٹھانوں کی اصلاح وتنظیم کے سلسلے میں یہ دوسرا قدم تھا۔

چنانچہ فیصلہ کے مطابق کام کا آغاز کردیا گیا اور منفرد ہزاروں آدمیوں نے سید صاحب کی اس دعوت کو قبول کرلیا لیکن اصل غرض انفرادی قبول و پزیرائی سے پوری نہیں ہوسکتی تھی ضروری تھا کہ ایک ہمہ گیر نظام پیدا کیا جائے۔اس مقصد کیلئے علماء واکابر کا اجتماع ضروری تھا۔اس اجتماع کیلئے موزوں مقام پنجتار سمجھا گیا۔چنانچہ سید صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رئیس پنجتار فتح خاں کی دعوت پر وہاں پہنچے اور پہنچتے ہی بیعت شریعت کیلئے دعوت عام کا سلسلہ شروع کردیا اس سلسلے میں آپ مختلف بستیوں اور قبیلوں میں دورے فرماتے اور علماء واکابر کو جمع کر کے پابندئ احکام اسلام کی ہدایت کرتے ،دوروں اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ سے قبول عام کا جذبہ بیدار ہوگیا تو فیصلہ ہوا کہ پنجتار میں اجتماع عظیم منعقد کیا جائے۔ جس میں سرحد کے ہر حصے سے علماء وخوانین شریک ہوں یکم شعبان ۱۲۴۴ھ (۶رفروری ۱۸۲۹÷) کی تاریخ اور جمعہ کا دن اس اجتماع کیلئے تجویز ہوا۔خوانین واکابر کے علاوہ دو ہزار کے قریب علماء اس موقع پر آئے۔ اتنے ہی ان کے تلامذہ تھے (بعض مکاتیب میں ہے قریب ہزار علماء وطلبہ)اس اجتماع میں سید صاحب نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی۔جس کے آخر میں پنجتار کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر آپ ہماری بات ماننا چاہتے ہیں تو اسی مجمع میں مان لیجئے ورنہ اتحاد کا رشتہ کٹ جائے گا میں خدائے عز وجل کا ایک عاجز بندہ ہوں۔میری خواہش اس کے سوا کچھ نہیں۔کہ سب لوگ احکام الٰہی کے فرمانبردار بن جائیں۔

تقریر پوری کر کے سید صاحب خود مجمع میں سے اٹھ گئے۔ علماء آپس میں مشورے کرتے رہے آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ ''نظام شرعی کا قیام'' لازم ہے۔ نماز جمعہ کے بعد سب نے سید صاحب کے ہاتھ پر ''اقامت شریعت'' کے لئے بیعت کی۔

استفتاء اور اس کا جواب

بیعت کے بعد ایک استفتاء علماء کی خدمت میں پیش کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ''اگر کوئی شخص امام کی بیعت کرنے اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لینے کے بعد خدمت دین اور اجرائے شرع مبین کے سلسلے میں امام کے کسی حکم کو رد کر دے اور مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے؛ بلکہ جدال و قتال میں بھی شامل نہ ہو تو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے؟

علماء نے غور و فکر کے بعد اس کا مفصل جواب مرتب کیا اسکے مطالب کا خلاصہ یہ تھا۔

١- اثباتِ امامت کے بعد حکم امام سے سرتابی سخت گناہ اور قبیح جرم ہے۔

٢- مخالفوں کی سرکشی اگر اس پیمانے پر پہنچ جائے کہ قتال کے بغیر اس کا استیصال ممکن نہ رہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان مخالفوں کی تادیب کے لئے تلواریں نکالیں اور امام کے حکم کو بزور مخالفوں پر نافذ کریں۔

٣- اس معرکے میں لشکر امام سے جو شخص قتل ہوگا وہ شہید سمجھا جائے گا اور لشکر مخالف کے مقتولین مردود و ناری متصور ہوں گے۔

اس فتوے پر علماء سرحد میں سے پچیس افراد کے دستخط تھے۔ (جن کے نام سیرت احمد شہید میں مرقوم ہیں)

اصلاح عام

غالباً ١٥ر شعبان ١٢٤٤ھ کو جمعہ کے دن (٢٠ر فروری ١٨٢٩÷) پھر ایک اجتماع ہوا جو فتح خاں رئیس پنجتار کے قبیلے کے افراد پر مشتمل تھا۔ خان نے ان سب کو بیعت کی ترغیب دی

اور انھوں نے بطیب خاطر نظام اسلامی کی پابندی قبول کر لی پھر مختلف علاقوں کیلئے سید صاحب نے قاضی مقرر فرما دیئے۔ مولوی سید محمد حیان کو قاضی القضاۃ بنایا گیا۔ ملا قطب الدین ننگر ہاری کو احتساب کا کام سونپا گیا۔ اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر کئے گئے وہ قریہ قریہ اور دیہ دیہ دورہ کرتے رہے۔ جہاں کوئی امر خلاف شرع پاتے اس کا انسداد کرتے۔

نظامِ امارت کا اثر

راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ تمام لوگوں نے شریعت کی پابندی اختیار کر لی پٹہ داریاں ٹوٹ گئیں۔ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔ اگر ملا قطب الدین کے آدمی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کسی گاؤں میں جاتے تو گاؤں والے دوڑے ہوئے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں رہا۔

ایک سوال

کیا بیعت اقامتِ شریعت کے بعد سید صاحب کے اختیارات فرمانروائی میں کوئی اضافہ ہوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بیعت اقامت نے سید صاحب کو نظم قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا۔ بیعت اقامت شریعت کی رُو سے وہ اجرائے احکام شرعی کا مرکز بن گئے۔ رؤسا و خوانین پر صرف اس حد تک پابندیاں عائد ہوئیں جو از روئے شریعت حقہ ضروری تھیں لیکن ان کی ریاستیں اور سرداریاں بدستور قائم رہیں (سیرت احمد شہید ج ۲ ص ۸۳ تا ۸۷ و سید احمد شہید ج ۲ ص از ۵۵ تا ۶۵)

ضروری تنبیہ

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ بیعت شریعت، بیعت جہاد سے الگ ہے۔ چنانچہ غلام رسول مہر صاحب نے بھی اس پر تنبیہ کی ہے۔ وہ بیعت جہاد کی بحث کو ختم کر کے حاشیہ

پر لکھتے ہیں ''یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض سوانح نگاروں نے بیعت امامت جہاد اور بیعت اقامت شریعت کو مخلوط کر دیا ہے۔ حالانکہ دونوں بیعتیں الگ الگ موقعوں پر ہوتی تھیں۔ اور ان میں کم وبیش دو سال دو مہینے کا فصل ہے۔ (ایضاً ج ا ص ۳۸۰)

(۲) نظامِ امارت کی دوبارہ تاسیس

حضرت امام سید احمد شہید کے واقعہ شہادت (۲۴/ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ) کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے شیخ ولی محمد صاحب پھلتی کو (جو امام شہید کے مخصوص احباب میں تھے) اپنا امیر بنالیا پھر ۱۲۵۰ھ میں جب شیخ نصیر الدین دہلوی داماد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرشد اوّل) ہجرت مجاہدین کے مرکز استھانہ پہنچے تو تمام مجاہدین نے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور انھیں اپنا امیر منتخب کرلیا۔ لیکن مجاہدین کی جماعت میں حضرت امام شہید کی غیبت ورجعت کے جدید نظریہ کی وجہ سے اجتماعیت قائم نہ رہ سکی اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شیخ نصیر الدین دہلویؒ نے اگر چہ ان کے انتشار واختلاف کو دور کرنے کی بہت کوشش کی مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی جس کی بناء پر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدو جہد کا وہ سلسلہ جسے امام شہید نے جاری فرمایا تھا اور ان کی شہادت کے بعد منقطع ہوگیا تھا۔ دوبارہ شروع نہ ہوسکا۔ مجاہدین کے اسی انتشار کے زمانہ میں مولانا نصیر الدین دہلوی کا ۱۲۵۶ھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد مجاہدین کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری مولانا ولایت علی صادق پوری نے سنبھالی۔ چونکہ نظریۂ غیبت و رجعت کے مولانا زبردست حامی اور مؤید تھے اور عقیدہ کی رُو سے امام شہید کے ظہور کے بعد انھیں کی معیت میں جہاد کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے ان کے عہد امارت میں بھی حضرت امام شہید کے عظیم مقصد کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی جو ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے انھیں ہندوستان میں دوبارہ اس بابرکت جدوجہد کو دوبارہ شروع کئے جانے کی بڑی تمنا تھی۔ اور اس کی تدبیروں پر اکثر غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب

سیدالطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجرمکی بغرض حج وزیارت حرمین شریفین پہنچے اور تقریباً دوسال اس ارض مقدس میں مقیم رہے۔اس سفرمیں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی مجلس میں حاضری اوران سے استفادہ کا خوب خوب موقع ملا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے انھیں جوہر قابل پا کران کی تربیت کی جانب خصوصی توجہ فرمائی اور ہندوستان میں انقلابی جدوجہد کی ہدایات دے کر واپس بھیجا چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے انھیں خطوط پر جن کی ہدایات ''شاہ صاحب'' نے فرمائی تھیں ہندوستان آکراستاذ الکل مولانا مملوک علی، مولانا مظفرحسین کاندھلوی، مولانا احمدعلی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کےاشتراک وتعاون کےساتھ کام شروع کردیا۔

(ماخوذاز التمہید لتعرف ائمة التجدید۔تالیف مولانا عبیداللہ سندھی ص۷۳،۷۴،۷۵)

بالآخر۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں جب کہ برطانوی سامراج کےظلم وتشدد کےخلاف برسوں کی سلگتی ہوئی آگ لاوابن کرپھوٹ پڑی توان قافلۂ ولی اللّٰہی کے مسافروں نے جو سالوں سے سامانِ سفرکی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے تھانہ بھون کی ایک مسجد میں بیٹھ کر طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ''زمین اللہ کی، حکومت بادشاہ کی اورحکم انگریز بہادر کا کے بالمقابل یہ اعلان کیا جائے کہ، زمین اللہ کی، حکومت اللہ کی اورحکم اللہ کا، ظاہرہے یہ اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں تھا بلکہ ایک ایسی جابروقاہر حکومت کےخلاف اعلانِ جنگ تھا جس کی وسیع سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔اس لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر خوب غوروفکر کرنے کے بعدایک تنظیم کےتحت یہ انقلابی قدم اٹھایا جائے۔مزیدغوروفکرکی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ اپنی ہی جماعت کے ایک بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بحالتِ موجودہ اس اقدام کےشدیدمخالف تھے۔تھانہ بھون کی اسی مسجد میں ایک بارپھرمجلس شوریٰ کے ارکان سرجوڑکر بیٹھے۔اس مجلس شوریٰ کا انعقادکس تاریخ کو ہوا۔ارباب حل وعقدمیں سے کتنے حضرات اس میں شریک ہوئے۔ان تفصیلات سے تاریخ کادامن خالی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے بیان سےصرف دَرج ذیل اکابر کے

ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، (۲) حضرت حافظ ضامن شہید صاحب (۳) حضرت مولانا شیخ محمد صاحب (۴) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب (۵) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب۔ اوّل الذکر تین اکابر تو تھانہ بھون ہی میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ البتہ آخرالذکر ہر دو بزرگوں کو ان کے گھروں سے بلایا گیا تھا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی کارروائی کی تفصیل خود حضرت مدنی قدس سرہ ہی کی زبانی سنی جائے کیونکہ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی آپ کی قدآوار شخصیت تھی۔ اس لئے ان سے زیادہ صحیح رپورٹ کون دے سکتا ہے۔ حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

مجلس شوریٰ کی رُودَاد

جب ہر دو حضرات (مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما) پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (چونکہ وہ چچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ ان کا ادب کیا جاتا تھا) حضرت کیا وجہ ہے کہ دشمنانِ دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سروسامان ہیں مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن (شہید) صاحب نے فرمایا کہ بس مولانا سمجھ میں آگیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع ہوگئی اور اعلان کر دیا گیا۔

حضرت حاجی صاحب کی امارت پر بیعت اور تنظیم کی تشکیل

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو امام مقرر کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا۔ اور حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانویؒ کو میمنہ ومیسرہ (فوج کے دائیں وبائیں بازو) کا افسر قرار دیا گیا۔

عام مسلمانوں کی اطاعت گزاری

چونکہ اطراف وجوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے علم وتقویٰ (تصوف اورتشرع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا ان حضرات کے اخلاص اور للّٰہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے، ہمیشہ سے ان کی دین داری اور خداترسی دیکھتے رہے تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دئے گئے۔ (نقش حیات ج۲ص۴۲،۴۳)

اس نظام امارت کا ذکر مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے تذکرۃ الرشید میں کیا ہے مگر تذکرۃ الرشید ایسے زمانہ میں ترتیب دی گئی ہے جب کہ واقعہ کو اس کے اصلی رنگ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے مولانا میرٹھی نے اجمال وتوریہ سے کام لیا ہے۔ ضرورت تھی کہ بعد کے ایڈیشنوں میں بات وضاحت کے ساتھ حاشیہ ہی میں صحیح بیان کر دی جاتی مگر ناشروں کی سہل انگاری سے ایسا نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس مجمل اور تلمیح وتوریہ کے پردے میں کہی گئی بات کو ماخذ نہیں بنایا جا سکتا۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی سوانح قاسمی بروایت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام اور حضرت قاری صاحب کے بیانات میں جزوی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی مشہور تصنیف التمہید کے صفحہ ۷۹ پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہند نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ مجھ سے بیان کیا تھا مگر حضرت شیخ الہند نے کیا تفصیلات بیان کی تھیں۔ مولانا سندھیؒ اس سے بالکل خاموش۔ کاش کہ مولانا ان تفصیلات

کو بیان کر دیتے تو ممکن تھا کہ اس واقعہ سے متعلق کچھ مزید باتیں منصۂ شہود پر آ جاتیں۔

بادشاہ دہلی کی گرفتاری اور مجاہدین حریت کی ناکامی کے بعد اس نظام امارت کا شیرازہ بھی منتشر ہو گیا۔ جس کی تفصیلات مذکورہ بالا کتابوں بالخصوص نقشِ حیات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۳) تنظیم ملت کی تیسری کوشش

اس ناکامی کے بعد اگرچہ حضرت شیخ الہند اپنے پورے عہد میں ''ثمرۃ الترتیب، جمعیۃ الانصار، نظارۃ المعارف اور ریشمی رومال تحریک کے ذریعہ اسی متاعِ گم شدہ کی بازیافت میں کوشاں رہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک کا ردّ عمل اتنا سنگین تھا کہ اس دور میں دین و مذہب کے نام پر کسی تنظیم کی تشکیل تو دور کی بات ہے۔ زبان پر اس کا نام لانا بھی جُرم عظیم تھا۔ اس لئے باقاعدہ طور پر نظامِ امارت کا قیام تو اس زمانہ میں نہیں ہو سکا۔ پھر بھی حضرت شیخ الہند اپنے مخصوص اور معتمد تلامذہ اور متوسلین سے خفیہ طور پر احیاء دین کے لئے جدوجہد پر بیعت لیتے رہتے تھے۔ بانئ تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ بھی انھیں معتمد تلامذہ کی فہرست میں شامل تھے جن سے یہ معاہدۂ شرعی ہوا تھا (مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت) لیکن آہستہ آہستہ جب شکوک و شبہات کے بادل کچھ چھٹے یا بالفاظ دیگر جب مجاہدین حریت کے پے در پے حملوں سے برطانوی سامراج کی قوت میں اضمحلال پیدا ہو گیا اور اسیران ظلم و ستم کو کسی حد تک امن و اطمینان کی فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تو ۶۳ سال کے طویل عرصے کے بعد ۱۹۲۰ء میں اسی بوڑھے مجاہد (جسے درازئ عمر، کثرتِ امراض اور مالٹا کی تقریباً تین سالہ قید و بند کی صعوبتوں نے چارپائی پر لٹا دیا تھا۔ لیکن اس کے حوصلے جوان اور عزائم بلند تھے) کی یہ آواز ہمارے کانوں میں گونجتی ہے، میری چارپائی کو اٹھا کر جلسہ گاہ لے چلو۔ پہلا شخص میں ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ لیکن بُرا ہو ہم عصری کی چشمک اور منافست کا کہ غیروں نے نہیں بلکہ خود اپنوں نے اس صدائے حیات افزا کو سنی ان سنی کر دیا۔

حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ نے اپنی ایک تحریر میں اسی تلخ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''اگر علماء میں مداہنت ومنافست نہ ہوتی اورصوفیاء میں اربابا من دون اللہ بننے کا شوق نہ ہوتا تو آج تمام ہندوستان ایک شرعی امیر کے تحت زندگی بسر کررہا ہوتا۔اوراسلام کی حقیقی برکات سے متمتع ہوتا۔ان کی روح حکومت کی غلامی سے آزاد ہوتی اگرچہ جسم غلامی میں مقید ہوتا۔'' (حیات سجاد ص ۱۰۷)

قصہ مختصر جب جمعیۃ علماء کے دوسرے اجلاس میں حضرت شیخ الہند جیسی عظیم وہمہ گیر شخصیت کی موجودگی اوران کی شدید خواہش کے باوجود علمائے ذی مراتب امیر الہند کے انتخاب پرآمادہ نہیں ہوئے۔تو مولانا ابوالمحاسن نے اپنی بصیرت سے اسی وقت بھانپ لیا کہ امیرالہند کا مسئلہ جل طے ہونے والا نہیں ہے۔اس لئے انھوں نے صوبائی پیمانے پر نظامِ امارت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔اوراپنے صوبہ بہار میں اس کی داغ بیل ڈالنے کی مہم شروع کردی۔ چنانچہ ۲۳، ۲۴ر شعبان ۱۹۳۹÷ (۲، ۳ر مئی ۱۹۲۱÷ کو دربھنگہ میں جمعیۃ علمائے صوبہ کے اجلاسِ عام کے موقع پر یہ تجویز منظور کی گئی۔

''صوبہ بہارواڑیسہ (اس وقت اڑیسہ مستقل صوبہ نہیں بنا تھا بلکہ صوبہ بہار ہی کا ایک جزءتھا) کے محکمہٗ شرعیہ کے لئے ایک عالم مقتدر شخص امیر منتخب کیا جائے جس کے ہاتھ میں تمام محاکم شرعیہ کی باگ ہواوراس کا ہر حکم مطابقِ شریعت ہر مسلمان کیلئے واجب العمل ہو۔ نیز تمام علماء ومشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت وحفاظتِ اسلام کے لئے بیعت کریں۔ جوسمع وطاعت کی بیعت ہوگی۔ جو بیعتِ طریقت سے الگ ایک ضروری اوراہم چیز ہے۔ جمعیۃ متفقہ طور پرتجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر کیلئے ایک خاص اجلاس علماء بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں کیا جائے۔'' (تاریخ امارت ص ۵۸و۵۹)

حسب تجویز ۱۸، ۱۹ر شوال ۱۳۳۹ھ (۲۵، ۲۶ر جون ۱۹۲۰÷) کو یہ اجلاس پتھر کی مسجد پٹنہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرصدارت منعقد ہوا۔جس میں مولانا آزاد سبحانی اور

مولانا سبحان اللہ خاں کے علاوہ سو سے زیادہ صوبہ بہار کے علماء شریک تھے۔ چنانچہ اسی اجلاس کی دوسری نشست میں بالاتفاق شرکائے اجلاس مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی کو امیر شریعت صوبہ بہار۔ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ ۱۸۵۷÷ کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مبارک دن تھا جس میں باقاعدہ امارتِ شرعیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا سلسلہ بحمدللہ آج تک جاری ہے اب تک یکے بعد دیگرے امارت کے منصب پر چار امراء کا انتخاب ہو چکا ہے اور یہ سب جمعیۃ علماء ہی کی نگرانی میں ہوا ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذٰلک۔

(۴) ایک اور صوبہ میں امیر کا انتخاب

صوبہ بہار میں انتخاب امیر اور نظامِ امارت کے قیام کے بعد، حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی انجمن ''خدّام الدین'' کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۶÷ کے موقع پر جس میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حسین علیؒ بچھراواں، حضرت مولانا علامہ محمد یوسف بنوریؒ، مولانا ظفر علی خاں، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ پانچ سو سے زائد علماء کرام شریک تھے۔ حضرت محدث کشمیری کی تحریک پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت منتخب کیا گیا اور پہلی بیعت خود حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے کی تھی۔ اس کے بعد بیعتِ عامہ ہوئی۔ (ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال شمارہ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ)

اس امارت کے متعلق اس سے زیادہ معلومات پر سر دست دسترس حاصل نہیں ہوئی۔ یہ ہے ہندوستان میں نظام امارت کے قیام کی مختصر تاریخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر اور بزرگوں نے اس شرعی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ہر دور میں حسب استطاعت جدوجہد فرمائی ہے۔ (خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را)

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف و اکابر کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق اور حوصلہ عطا فرمائے۔

باب ﴿۶﴾

تذکرہ اربابِ فضل وکمال

امام ابوحنیفہ اور علم حدیث

امام ابوحنیفہ کی تابعیت

امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ رحمہ اللہ کی جلالتِ قدر وعظمت شان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ تابعیت کے عظیم دینی اور روحانی شرف کے حامل ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی یہ ایسی فضیلت ہے جس نے انہیں اپنے معاصر — فقہا ومحدثین میں اسناد عالی کی حیثیت سے ممتاز کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیتمی مکی لکھتے ہیں۔

”إنه أدرك جماعة من الصحابة كانوا بالكوفة بعد مولده بها سنة ثمانين فهو من طبقة التابعين ولم يثبت ذلك لأحد من أئمة الأمصار المعاصرين له كالأوزاعی بالشام، والحمادين بالبصرة، والثورى بالكوفة ومالك بالمدينة المشرفة،والليث بن سعد بمصر“(۱)

امام ابوحنیفہ نے اپنی پیدائش سن ۸۰ کے بعد صحابہ کی ایک جماعت کا زمانہ پایا ہے جو کوفہ میں تھے اس لیے وہ تابعین کے طبقہ میں ہیں، اور یہ شرف ان کے معاصر محدثین وفقہاء جیسے شام میں امام اوزاعی، بصرہ میں امام حماد بن سلمہ، امام حماد بن زید، کوفہ میں امام سفیان ثوری، مدینہ میں امام مالک، اور مصر میں امام لیث بن سعد کو حاصل نہیں ہوسکا۔

حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی نے بھی ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے امام ابوحنیفہؒ کی تابعیت کو دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے ان کے الفاظ ملاحظہ کیجئے!

(۱) الخیرات الحسان فصل سادس ص:۲۱، از علامہ ابن حجر ہیتمی مکی۔

أدرك الإمام أبو حنيفة جماعة من الصحابة لأنه ولد بالكوفة سنة ثمانين من الهجرة وبها يومئذ من الصحابة عبدالله بن أبى أوفى فإنه مات بعد ذلك بالاتفاق، وبالبصرة يومئذ أنس بن مالك ومات سنة تسعين أو بعدها، قد أورد ابن سعد بسند لابأس به أن أبا حنيفة رأى أنساً وكان غير هذين فى الصحابة بعده من البلاد احياء.

وقد جمع بعضهم جزأ فيما ورد من رواية أبى حنيفة عن الصحابة لكن لايخلو اسنادها من ضعف والمعتمد على ادراكه ما تقدم وعلى رويته لبعض الصحابة ما أورده ابن سعد فى الطبقات، فهو بهذا الاعتبار من طبقه التابعين. (۱)

امام ابوحنیفہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے کیونکہ آپ کی ولادت ۸۰ھ میں کوفہ میں ہوئی اوراس وقت وہاں صحابہ میں سے عبداللہ بن ابی اوفی موجود تھے کیونکہ ان کی وفات بالاتفاق ۸۰ھ کے بعد ہوئی ہے،اور ان دنوں بصرہ میں انس بن مالک موجود تھے اس لیے کہ ان کی وفات ۹۰ھ یا اس کے بعد ہوئی ہےاور ابن سعد نے اِسی سند سے جس میں کوئی خرابی نہیں ہے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، نیز ان دونوں اصحاب کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ مختلف شہروں میں بقید حیات تھےاور بعض علماء نے امام ابوحنیفہ کی صحابہ سے روایت کردہ احادیث کوایک خاص جلد میں جمع کیا ہے، لیکن ان کی سندیں ضعف سے خالی نہیں ہیں، امام ابوحنیفہ کا صحابہ کے زمانے کو پانے کے متعلق قابل اعتماد بات وہی ہے جوگزرچکی ہےاور بعض صحابہ کو دیکھنے کے بارے میں قابل اعتماد بات وہ ہے جس کوابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعین کے طبقہ میں سے ہیں الخ۔

علامہ ہیثمی مکی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے علاوہ امام دارقطنی ، حافظ ابونعیم اصبہانی،

(۱) تبييض الصحيفة ص:۲۵،۲۶،۱،حافظ سیوطی مطبوعہ کراچی ۱۴۱۸ھ

حافظ ابن عبدالبر، امام خطیب بغدادی، ابن الجوزی، امام سمعانی، حافظ عبدالغنی مقدسی، سبط ابن الجوزی، حافظ زین الدین عراقی، ولی الدین عراقی، ابن الوزیر یمانی، وغیرہ ائمہ حدیث نے بھی امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تابعیت کا اقرار واعتراف کیا ہے۔

ذٰلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء

طلب حدیث کے لیے اسفار

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ وکلام کے علاوہ بطور خاص حدیث پاک کی تعلیم وتحصیل کی تھی اور اس کے لئے حضرات محدثین کی روش کے مطابق اسفار بھی کئے چنانچہ امام ذہبی جو رجال علم وفن کے احوال وکوائف کی معلومات میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں اپنی مشہور اور انتہائی مفید تصنیف ''سیر اعلام النبلا'' میں امام صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں وعنى بطلب الآثار وارتحل في ذلك(۱) امام صاحب نے طلب حدیث کی جانب خصوصی توجہ کی اور اس کے لئے اسفار کئے۔

مزید یہ بھی لکھتے ہیں:

ان الامام ابا حنيفة طلب الحديث واكثر منه سنة مئة وبعدها.(۲)

امام ابوحنیفہؒ نے حدیث کی تحصیل کی بالخصوص ۱۰۰ھ اور اس کے بعد کے زمانہ میں اس اخذ وطلب میں بہت زیادہ سعی کی۔

امام ذہبی کے بیان "وارتحل في ذلك" کی قدرے تفصیل صدرالائمہ موفق بن احمد مکیؒ نے اپنی مشہور جامع کتاب ''مناقب الامام الاعظم میں ذکر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ کوفی نے طلب علم میں بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا تھا اور اکثر سال، سال بھر کے قریب قیام رہتا تھا۔''(۳)

(۱) سیر اعلام النبلاء ۶/۳۹۲۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۶/۳۹۶۔

(۳) مناقب الامام الاعظم ۱/۵۹۔

اس زمانے میں سفر حج بھی افادہ واستفادہ کا ایک بڑا ذریعہ تھا کیونکہ بلاد اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے ارباب فضل وکمال حرمین شریفین میں آکر جمع ہوتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ امام ابوالمحاسن مرغینانی نے بالسند نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے پچپن حج کئے تھے۔ تاریخ اسلام میں یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اسے مبالغہ آمیز تصور کیا جائے کیونکہ متعدد شخصیتوں کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں جن کی حج کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے چنانچہ امام ابن ماجہؒ کے شیخ علی بن منذر نے اٹھاون حج کئے تھے اوران میں اکثر پا پیادہ ہی تھے۔(۱) محدث سعید بن سلیمان ابوعثمان واسطی نے ساٹھ حج کئے تھے(۲) اورحافظ عبدالقادر قرشی نے جواهر المضیه فی طبقات الحنفیه میں امام سفیان بن عیینہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے ستر حج کئے تھے۔

علاوہ ازیں ۱۳۰ھ سے خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ تک جس کی مدت چھ سال کی ہوتی ہے آپ کا مستقل قیام مکہ معظّمہ ہی میں رہا۔(۳)

ظاہر ہے کہ اس دور کے طریقۂ رائج کے مطابق دوران حج اوراس چھ سالہ مستقل قیام کے زمانہ میں آپ نے شیوخ حرمین شریفین اور واردین وصادرین اصحاب حدیث سے خوب خوب استفادہ کیا ہوگا طلب علم کے اسی والہانہ اشتیاق اور بے پناہ شغف کا ثمرہ ہے کہ آپ کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی۔(۴) پھران چار ہزار اساتذہ سے آپ نے کس قدر احادیث حاصل کیں اس کا کچھ اندازہ مشہور امام حدیث حافظ مسَعر بن کِدام کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جسے امام ذہبی نے ''مناقب امام ابی حنیفہ وصاحبیہ'' میں نقل کیا ہے۔

(۱) سنن ابن ماجہ باب صید الکلب۔

(۲) مناقب امام احمد از ابن الجوزی ص ۳۸۷۔

(۳) عقود الجمان از مؤرخ کبیر ومحدث امام محمد بن یوسف الصالحی الشافعی ص ۳۱۲۔

(۴) عقود الجمان میں امام صالحی نے الباب الرابع فی ذکر بعض شیوخہ کے تحت ۲۴ صفحات میں شیوخ امام اعظم کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

علم حدیث میں مہارت وامامت

امام مُسعِر بن کدام جو اکابر حفاظ حدیث میں ہیں امام صاحب کی جلالت شان کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

طلبت مع ابی حنیفة الحدیث فغلبنا، واخذنا فی الزهد فبرع علینا و طلبنا معه الفقه فجاء ماترون(۱)

''میں نے امام ابوحنیفہ کی رفاقت میں حدیث کی تحصیل کی تو وہ ہم پر غالب رہے اور زہد وپرہیزگاری میں مصروف ہوئے تو اس میں بھی وہ فائق رہے اور فقہ ان کے ساتھ شروع کی تو تم دیکھتے ہو کہ اس فن میں کمالات کے کیسے جوہر دکھائے۔''

یہ مسعر بن کدام وہ بزرگ ہیں جن کے حفظ واتقان کی بناء پر امام شعبہ انہیں مصحف کہا کرتے تھے(۲) اور حافظ ابومحمد رامہرمزی نے اصول حدیث کی اولین جامع تصنیف المحدث الفاضل میں لکھا ہے کہ امام شعبہ اور امام سفیان ثوری میں جب کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے کہ ''اذهبنا الی المیزان مسعر''ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو فن حدیث کے میزان علم ہیں، ذرا غور تو فرمایئے کہ امام شعبہ اور امام سفیان ثوری دونوں امیرالمومنین فی الحدیث ہیں پھر ان دونوں بزرگ کی میزان جس ذات کے بارے میں یہ شہادت دے کہ وہ علم حدیث میں ہم پر فوقیت رکھتی ہے اس شخصیت کا فن حدیث میں پایہ کیا ہوگا۔

مشہور امام تاریخ وحدیث حافظ ابوسعد سمعانی کتاب الانساب میں امام صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

اشتغل بطلب العلم وبالغ فیه حتی حصل له مالم یحصل لغیره.(۳)

(۱) مناقب ذہبی ص:۲۷۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ از امام ذہبی ۱/۱۸۸۔

(۳) کتاب الانساب طبع لندن ورق ۱۹۶۔

''امام ابوحنیفہ طلب علم مشغول ہوئے تو اس درجہ غایت انہماک کے ساتھ ہوئے کہ جس قدر علم انہیں حاصل ہوا دوسروں کو نہ ہوسکا۔''

غالبًا امام صاحب کے اسی کمالِ علمی کے اعتراف کے طور پر امام احمد بن حنبل اور امام بخاری کے استاذ حدیث شیخ الاسلام حافظ ابوعبدالرحمٰن مقری جب امام صاحب سے کوئی حدیث روایت کرتے تو اس الفاظ کے ساتھ روایت کرتے تھے اخبر نا شاھنشاہ ہمیں علم حدیث کے شہنشاہ نے خبر دی۔ یہ حافظ ابوعبدالرحمٰن مقری امام ابوحنیفہ کے خاص شاگرد ہیں اور امام صاحب سے نوسو (۹۰۰) حدیثیں سنی ہیں جیسا کہ علامہ کردی مناقب الامام الاعظم (ج۲ص ۲۱۶ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) میں لکھتے ہیں عبداللہ بن یزید المقری (ابوعبدالرحمٰن) سمع من الإمام تسع مأة حديث.

اسی بات کا اعتراف محدث عظیم حافظ یزید بن ہارون نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

كان ابو حنيفة نقيا، زاهدًا عالماً صدوق اللسان احفظ اهل زمانه.(۱)

امام ابوحنیفہ پاکیزہ سیرت، متقی، پرہیزگار، صداقت شعار اور اپنے زمانہ میں بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کے علوم وقرآن وحدیث میں امتیازی تبحر اور وسعت معلومات کا اعتراف امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید القطان نے ان وقیع الفاظ میں کیا ہے۔ إنه والله لأعلم هذه الامة بما جاء عن الله ورسوله(۲)

''بخدا ابوحنیفہ اس امت میں خدا اور اس کے رسول سے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کے سب سے بڑے عالم تھے۔''

امام بخاریؒ کے ایک اور استاذ حدیث امام مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں۔

كان أبو حنيفة زاهدا، عالماً، راغباً في الآخرة صدوق اللسان أحفظ اهل زمانه(۳)

(۱) اخبار ابی حنفیہ واصحابہ از ہمیری ص ۳۶۔

(۲) مقدمہ کتاب التعلیم از مسعود بن شیبہ سندھی بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۶۷، از محقق کبیر علامہ محمد عبدالرشید نعمانی۔ (۳) مناقب الامام الاعظم از صدر الائمہ موفق بن احمد مکی۔

”امام ابوحنیفہ، پرہیزگار، عالم، آخرت کے راغب، بڑے راست باز اور اپنے معاصرین میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔“

امام ابوحنیفہؒ کی حدیث میں کثرت معلومات کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب نے حدیث پاک میں اپنی اولین تالیف کتاب الآثار کو چالیس ہزار احادیث کے مجموعہ سے منتخب کر کے مرتب کیا ہے۔ چنانچہ صدر الائمہ موفق بن احمد مکی محدث کبیر امام الائمہ بکر بن محمد زِرَنجری متوفی ۵۱۲ھ کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

وانتخب ابو حنيفة رحمه اللّٰه الآثار من اربعين الف حديث.(۱)

”امام ابوحنیفہ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا ہے۔“

پھر اسی کے ساتھ امام حافظ ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری متوفی ۲۹۸ھ کا یہ بیان بھی پیش نظر رکھئے جسے انھوں نے اپنی کتاب مناقب ابی حنیفہ میں خود امام اعظم سے بہ سند نقل کیا ہے کہ:

عندى صناديق الحديث ما أخرجت منهما إلا أليسير الذى ينتفع به(۲)

”میرے پاس حدیث کے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اٹھائیں۔“

اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ ان صندوقوں کی تعداد کیا تھی اور ان میں احادیث کا کس قدر ذخیرہ محفوظ تھا۔ لیکن اس سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ والغفر ان کثیر الحدیث ہیں اور یار لوگوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ حدیث کے باب میں امام صاحب تہی دامن تھے اور انھیں صرف سترہ حدیثیں معلوم تھیں یہ ایک بے بنیاد الزام ہے جو علمی دنیا میں قطعاً غیر معروف ہے۔ اور بازاری افسانوں سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

---

(۱) مناقب الامام الاعظم ۱/ ۹۵۔

(۲) مناقب الامام الاعظم ۱/ ۹۵۔

ضروری تنبیہ

اس موقعہ پر یہ علمی نکتہ پیش نظر رہے کہ یہ چالیس ہزار متون حدیث کا ذکر نہیں بلکہ اسانید کا ذکر ہے پھر اس تعداد میں صحابہ واکابر تابعین کے آثار واقوال بھی داخل ہیں کیونکہ سلف کی اصطلاح میں ان سب کے لئے حدیث واثر کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

امام صاحب کے زمانہ میں احادیث کے طرق واسانید کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی بعد کو امام بخاری، امام مسلم وغیرہ کے زمانہ میں سندوں کی یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو مثلاً دس تلامذہ سے بیان کیا تو اب محدثین کی اصطلاح کے مطابق یہ دس سندیں شمار ہوں گی، اگر آپ کتاب الآثار اور مؤطا امام مالک کی احادیث کی تخریج دیگر کتب حدیث کی احادیث سے کریں تو ایک ایک متن کی دسیوں بیسیوں سندیں مل جائیں گی۔

حافظ ابونعیم اصفہانی نے مسند ابی حنیفہ میں بسند متصل یحییٰ بن نصر کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

دخلت علی أبی حنیفة فی بیت مملوء کتباً فقلت: ما هذه؟ قال هذه أحادیث کلها وما حدثت به الا الیسیر الذی ینتفع به(۱)

> ''میں امام ابوحنیفہ کے یہاں ایسے مکان میں داخل ہوا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا یہ سب کتابیں حدیث کی ہیں اور میں نے ان سے تھوڑی سی حدیثیں بیان کی ہیں جن سے نفع اٹھایا جائے۔''

مشہور محدث ابومقاتل حفص بن سلم امام ابوحنیفہؒ کی فقہ و حدیث میں امامت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

وکان أبوحنیفة إمام الدنیا فی زمانه فقها وعلما وورعاً قال: وکان

(۱) الانتقاء از حافظ عبدالبر ص۳۱۹ مطبوعہ دالرالبشائر الاسلامیہ بیروت ۱۴۱۷ھ

أبو حنيفة محنة يعرف به أهل البدع من الجماعة ولقد ضرب بالسياط على الدخول فى الدنيا لهم فابى (۱)

امام ابوحنیفہ اپنے زمانہ میں فقہ وحدیث اور پرہیز گاری میں امام الدنیا تھے۔ ان کی ذات آزمائش تھی جس سے اہل سنت والجماعت اور اہل بدعت میں فرق وامتیاز ہوتا تھا انھیں کوڑوں سے مارا گیا تاکہ وہ دنیاداروں کے ساتھ دنیا میں داخل ہوجائیں (کوڑوں کی ضرب برداشت کرلی) مگر دخولِ دنیا کو قبول نہیں کیا۔

حفص بن مسلم کے قول ”وكان أبوحنيفة محنة يعرف به أهل البدع من الجماعة“ (امام ابوحنیفہ آزمائش تھے ان کے ذریعہ اہل سنت اور اہل بدعت میں تمیز ہوتی تھی) کی وضاحت امام عبدالعزیز ابن ابی رواد کے اس قول سے ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں:

أبو حنيفة المحنة من أحب أبا حنيفة فهو سنّيى ومن أبغض فهو مبتدع (۲)

”امام ابوحنیفہ آزمائش ہیں جو امام صاحب سے محبت رکھتا ہے وہ سنی ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ بدعتی ہے۔“

مؤرخ کبیر شیخ محمد بن یوسف صالحی اپنی معتبر، مقبول اور جامع کتاب ”عقود الجمان فى مناقب الامام الاعظم ابى حنيفة النعمان“ میں امام صاحب کی عظیم محدثانہ حیثیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اعلم رحمك الله أن الإمام أبا حنيفة رحمه الله تعالى من كبار حفاظ الحديث وقد تقدم انه اخذ عن أربعة آلاف شيخ من التابعين وغيرهم وذكره الحافظ الناقد ابو عبدالله الذهبى فى كتابه الممتع طبقات الحفاظ من المحدثين منهم ولقد اصاب وأجاد، ولولا كثرة اعتنائه بالحديث ماتهيّاله استنباط مسائل الفقه فانه أوّل من استنبطه من الأدلة ا هـ (۳)

(۱) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ از امام صمیری ص ۷۹۔

(۲) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ از امام صمیری ص ۷۹۔ (۳) عقود الجمعان ص ۳۱۹۔

''معلوم ہونا چاہئے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کبار حفاظ حدیث میں سے ہیں اور اگلے صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ امام صاحب نے چار ہزار شیوخ تابعین وغیرہ سے تحصیل علم کیا ہے اور حافظ ناقد امام ذہبی نے اپنی مفید ترین کتاب تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ محدثین میں امام صاحب کا بھی ذکر کیا ہے (جو امام صاحب کے حافظ حدیث ہونے کی بڑی پختہ دلیل ہے) ان کا یہ انتخاب بہت خوب اور نہایت درست ہے اگر امام صاحب تکثیر حدیث کا مکمل اہتمام نہ کرتے تو مسائل فقہیہ کے استنباط کی استعداد ان میں نہ ہوتی جبکہ دلائل سے مسائل کا استنباط سب سے پہلے انھوں نے ہی کیا ہے۔''

علم حدیث میں امام صاحب کے اسی بلند مقام ومرتبہ کی بناء پر اکابر محدثین اور ائمہ حفاظ کی جماعت میں عام طور پر امام اعظم کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے:۔ چنانچہ امام المحدثین ابوعبداللہ الحاکم اپنی مفید ومشہور کتاب ''معرفة علوم الحديث'' کی انچاسویں (۴۹) نوع کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

هذا النوع من هذه العلوم معرفة الائمة الثقات المشهورين من التابعين وأتباعهم ممن يجمع حديثهم للحفظ والمذاكرة والتبرك بذكرهم من الشرق الى الغرب.

''علوم حدیث کی یہ نوع مشرق ومغرب کے تابعین اور اتباع تابعین میں سے مشہور ائمہ ثقات کی معرفت اور ان کے ذکر میں ہے جن کی بیان کردہ احادیث حفظ ومذاکرہ اور تبرک کی غرض سے جمع کی جاتی ہیں۔''

پھر اس نوع کے تحت بلاد اسلامیہ کے گیارہ علمی مراکز مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، جزیرہ، بصرہ، واسط، خراسان کے مشاہیر ائمہ حدیث کا ذکر کیا ہے۔

ا- محدثین مدینہ میں سے امام محمد بن مسلم زہری، محمد بن المنکدر قرشی، ربیعة بن ابی عبدالرحمٰن الرائی، امام مالک بن انس، عبداللہ بن دینار، عبیداللہ بن عمر بن حفص عمری، عمر

بن عبدالعزیز، سلمہ بن دینار، جعفر بن محمد الصادق وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۲-محدثین مکہ میں سے ابراہیم بن میسرہ، اسماعیل بن امیہ، مجاہد بن جبر، عمرو بن دینار، عبدالملک بن جریج، فضیل بن عیاض وغیرہ کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

۳-محدثین مصر میں سے عمرو بن الحارث، یزید بن ابی حبیب، عیاش بن عباس القتبانی، عبدالرحمٰن بن خالد بن مسافر، حیوۃ بن شریح التجیبی، رزیق بن حکیم الایلی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

۴-محدثین شام میں سے عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ الحمصی، رجاء بن حیوۃ الکندی، امام مکحول (الفقیہ) وغیرہ کے اسماء بیان کئے گئے ہیں۔

۵- اہل یمن میں سے ہمام بن منبّہ، طاؤس بن کیسان، ضحاک بن فیروز دیلمی، شرحبیل بن کلیب صنعانی وغیرہ کے نام لئے ہیں۔

۶-محدثین یمامہ میں سے یحییٰ بن ابی کثیر، ابوکثیر یزید بن عبدالرحمٰن الحیمی، عبداللہ بن بدر یمانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۷-محدثین کوفہ میں سے عامر بن شراحیل الشعبی، ابراہیم نخعی، ابواسحاق السبیعی، عون بن عبداللہ، موسی بن ابی عائشہ الہمدانی، سعید بن مسروق الثوری، الحکم بن عتیبہ الکندی، حماد بن ابی سلیمان (شیخ امام ابوحنیفہ) منصور بن المعتمر السلمی، زکریا بن ابی زائدہ الہمدانی، مسعر بن کدام الہلالی، امام ابوحنیفہ النعمان بن ثابت التیمی، سفیان بن سعید الثوری، الحسن بن صالح بن حی، حمزہ بن حبیب الزیات، زفر بن الہذیل (تلمیذ امام ابوحنیفہ) وغیرہ کا نام لیا ہے۔

۸-محدثین جزیرہ میں سے میمون بن مہران، کثیر بن مرۃ حضرمی، ثور بن یزید ابوخالد الرجبی، زہیر بن معاویہ، خالد بن معدان العابد وغیرہ کے اسماء ذکر کئے ہیں۔

۹- اہل بصرہ کے محدثین میں سے ایوب بن ابی تمیمۃ السختیانی، معاویہ بن قرۃ مزنی، عبداللہ بن عون، داؤد بن ابی ہند، شعبہ بن الحجاج (امام الجرح والتعدیل) ہشام بن حسان، قتادہ بن دعامۃ سدوسی، راشد بن نجیح حمانی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۰- اہل واسط میں سے یحییٰ بن دینار رمانی، ابو خالد یزید بن عبد الرحمٰن دالانی، عوام بن حوشب وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۱- محدثین خراسان میں سے عبد الرحمٰن بن مسلم، عتیبہ بن مسلم، ابراہیم بن ادہم الزاہد، محمد بن زیاد وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔(۱)

اس نوع میں امام حاکم نے پانچ سو سے زائد ان ثقات ائمہ حدیث کا ذکر کیا ہے جن کی مرویات محدثین کے یہاں اہمیت کی حامل ہیں اور انہیں جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور ان ائمہ حدیث میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ذکر ہے، کیا اس کے بعد بھی امام صاحب کے حافظ حدیث بلکہ کبار حفاظ حدیث میں ہونے کے بارے میں کسی تردد کی گنجائش رہ جاتی ہے؟۔

اسی طرح امام ذہبی جو بقول حافظ ابن حجر عسقلانی نقد رجال میں استقراء تام کے مالک تھے۔ اپنی اہم ترین ومفید ترین تصنیف سیر اعلام النبلاء میں امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے تذکرہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کے قول "العلم يدور على ثلثة مالك، والليث وابن عيينة"

(علم حدیث تین بزرگوں امام مالک، امام للیث بن سعد اور امام سفیان بن عیینہ پر دائر ہے) کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قلت بل وعلى سبعة معهم، وهم الاوزاعى، الثورى، معمر، وأبو حنيفة، وشعبة، والحمادان(۲)

میں کہتا ہوں کہ ان تینوں مذکورہ ائمہ حدیث کے ساتھ مزید سات بزرگوں یعنی امام اوزاعی، امام ثوری، امام معمر، امام ابو حنیفہ، امام شعبہ، امام حماد بن سلمہ اور امام حماد بن زید پر علم دائر ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں امام ذہبی ان اکابر ائمہ حدیث کے زمرہ میں جن پر علوم حدیث

(۱) معرفۃ علوم الحدیث از امام حاکم نیساپوری ص ۲۴۰-۲۴۹۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۹۴/۸۔

دائر ہے امام ابوحنیفہ کو بھی شمار کررہے ہیں امام صاحب کے کبار محدثین کے صف میں ہونے کی یہ کتنی بڑی اور معتبر شہادت ہے اس کا اندازہ اہل علم کرسکتے ہیں۔

نیز اسی سیر اعلام النبلاء میں مشہور امام حدیث یحییٰ بن آدم کے تذکرہ میں محمود بن غیلان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

"سمعت أبا أسامة يقول كان عمرؓ فى زمانه رأس الناس وهو جامع وكان بعده ابن عباس فى زمانه وبعده الشعبى فى زمانه وكان بعده سفيان الثورى وكان بعد الثورى يحيىٰ بن آدم"

محمود بن غیلان کہتے ہیں کہ میں نے ابواسامہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں علم واجتہاد کے اعتبار سے لوگوں کے سردار تھے اور وہ جامع فضائل تھے۔ اور ان کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ میں، اور ان کے بعد امام شعبی اپنے زمانہ میں اور امام شعبی کے بعد سفیان ثوری اپنے زمانہ میں اور ان کے بعد یحییٰ بن آدم اپنے زمانے میں علم واجتہاد کے امام تھے۔

اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس بارے میں امام ذہبی نے اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

قلت: قد كان يحيىٰ بن آدم من كبار ائمة الاجتهاد، وقد كان عمر كما قال فى زمانه ثم كان على، وابن مسعود، ومعاذ، وابوالدرداء، عم كان بعدهم فى زمانه زيد بن ثابت، وعائشه و ابوموسىٰ، ابوهريرة، ثم كان ابن عباس وابن عمر، ثم علقمة، ومسروق، وابوادريس، وابن المسيب، ثم عروة، والشعبى، والحسن، وابراهيم النخعى، ومجاهد، وطاؤس، وعدَّة، ثم الزهرى، وعمر بن عبدالعزيز، وقتادة، وأيوب، ثم الأعمش، وابن عون، وابن حريج، وعبيد الله بن عمر، ثم الأوزاعى، وسفيان الثورى، ومعمر، وابوحنيفه، وشعبة، ثم مالك والليث، وحماد بن زيد، و ابن عيينة، ثم ابن المبارك، ويحيىٰ القطان، ووكيع، و عبدالرحمن، وابن وهب، ثم يحيىٰ بن آدم وعفان، والشافعى، وطائفة ثم

أحمد، واسحاق، و ابوعبيد، وعلى المدينى وابن معين، ثم ابو محمد الدارمى، ومحمد بن اسماعيل البخارى وآخرون من ائمة العلم والاجتهاد. (۱)

میں کہتا ہوں یقیناً یحییٰ بن آدم کبار ائمہ اجتہاد میں سے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلاشبہ اپنے زمانہ میں علم واجتہاد میں سرتاج مسلمین تھے پھر ان کے بعد حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل ابو درداء رضی اللہ عنہم کا مرتبہ ہے، ان حضرات کے بعد زید بن ثابت، عائشہ صدیقہ، ابوموسیٰ اشعری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا علم واجتہاد میں مرتبہ تھا، ان حضرات کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا مقام تھا پھر ان حضرات صحابہ کے بعد علقمہ، مسروق، ابوادریس خولانی اور سعید بن المسیب کا درجہ تھا پھر عروۃ بن زبیر، امام شعبی، حسن بصری، ابراہیم نخعی، مجاہد، طاؤس وغیرہ تھے پھر ابن شہاب زہری، عمر بن عبدالعزیز، قتادہ، ایوب سختیانی کا مرتبہ تھا پھر امام اعمش، ابن عون، ابن جریج، عبیداللہ بن عمر کا درجہ تھا پھر امام اوزاعی، سفیان ثوری، معمر، امام ابوحنیفہ اور شعبہ بن حجاج کا مقام ومرتبہ تھا پھر امام مالک، لیث بن سعد، حماد بن زید اور سفیان بن عیینہ تھے، پھر عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید قطان، وکیع بن جراح، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن وہب تھے پھر یحییٰ بن آدم، عفان بن مسلم، امام شافعی وغیرہ تھے پھر امام احمد بن حنبل اسحاق بن راہویہ، ابوعبید، علی بن المدینی اور یحییٰ بن معین تھے پھر ابومحمد دارمی، امام بخاری اور دیگر ائمہ علم واجتہاد اپنے زمانہ میں تھے۔

اس موقع پر بھی امام ذہبی نے اکابر ائمہ حدیث کے ساتھ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ امام ذہبی کے نزدیک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علم حدیث میں ان اکابر کے ہم پایہ ہیں۔

یہ اکابر محدثین یعنی امام مسعر بن کدام، امام ابوسعد سمعانی، حافظ حدیث یزید بن ہارون، استاذ امام بخاری مکی بن ابراہیم، ابومقاتل، امام عبدالعزیز بن رواد، مؤرخ کبیر المحدث محمد بن یوسف صالحی، امام المحدثین ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری، امام ذہبی وغیرہ

(۱) سیر اعلام النبلاء ۹/۵۲۵-۵۲۶۔

بیک زبان شہادت دے رہے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ اپنے عہد کے حفاظ حدیث میں امتیازی شان کے مالک تھے ان اکابر متقدمین ومتأخرین علمائے حدیث کے علاوہ امام ابن تیمیہ، ان کے مشہور تلمیذ ابن القیم وغیرہ حفاظ حدیث بھی امام صاحب کو کثیر الحدیث ہی نہیں بلکہ اکابر حفاظ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔

اس موقع پر بغرض اختصار انہیں مذکورہ ائمہ حدیث وفقہ کی نقول پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ امام اعظمؒ کی مدح وتوصیف کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ امام حافظ عبدالبر اندلسی مالکی اپنی انتہائی وقیع کتاب "الانتقاء فی فضائل الائمة الثلاثة الفقهاء" میں سرسٹھ (٦٧) اکابر محدثین وفقہاء کے اسماء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وكل هٰولاء أثنوا عليه ومدحوه بألفاظ مختلفة(۱)

ان سارے بزرگوں نے مختلف الفاظ میں امام ابوحنیفہؒ کی مدح وثنا کی ہے امام صاحب کے بارے میں تاریخ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں کے اقوال کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس صحیح حدیث کی روشنی میں دیکھئے، خادم رسول اللہ ...... بیان کرتے ہیں کہ:

مرّوا بجنازه فاثنوا عليها خيرًا فقال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم! وجبت فقال عمر ما وجبت؟ فقال هذا أثنيتم عليه خيرا، فوجبت له الجنة أنتم شهداء اللّٰه فى الأرض (متفق علیہ)(۲)

حضرات صحابہ کا ایک جنازہ کے پاس سے گزر ہوا تو ان حضرات نے اس کی خوبیوں کی تعریف کی اس پر آنحضرت ...... نے فرمایا واجب ہوگئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا چیز واجب ہوگئی؟ تو رسول خدا ...... نے فرمایا تم نے اس کے خیر وبھلائی کو بیان کیا لہٰذا اس کے لئے جنت واجب ہوگئی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

اس حدیث پاک کے مطابق یہ اعیان علماء اسلام یعنی محدثین فقہاء، عباد وزہاد اور

(۱) الانتقاء ص ۲۲۹ مطبوعہ دار البشائر بیروت ۱۴۱۷ھ

(۲) مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۴۵ اباختصار۔

اصحابِ امانت ودیانت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت شان اور دینی امامت کے بارے میں شہداء اللہ فی الارض ہیں اور اللہ کے ان گواہوں کی شہادت کے بعد مزید کسی شہادت کی حاجت نہیں۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر اک کا نصیب یہ بخت رسا کہاں

امام صاحب کی عدالت وثقاہت

سید الفقہاء، سراج الامت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علم وفضل اور امامت و شہرت کے جس بلند وبالا مقام پر ہیں، ان کی عظمت شان بذات خود انہیں ائمۂ جرح و تعدیل کی انفرادی تعدیل وتوثیق سے بے نیاز کردیتی ہے۔

چنانچہ امام تاج الدین سبکی اصول فقہ پر اپنی مشہور کتاب ''جمع الجوامع'' کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"ونعتقد أن أبا حنيفة ومالكا، والشافعي،وأحمد، والسفيانين، والأوزاعي، واسحاق بن راهويه، وداؤد الظاهري، وابن جرير وسائر أئمة المسلمين على هدى من اللّٰه في العقائد وغيرها ولا التفات الى من تكلم فيهم بماهم بريئون منه فقد كانوا من العلوم اللّدنّية والمواهب الالٰهية والاستنباط الدقيقة والمعارف الغزيرة والدين والورع والعبادة والزهادة والجلالة بالمحل لايسامٰى"(۱)

ہمارا اعتقاد ہے کہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، سفیان ثوری، وسفیان بن عیینہ، اوزاعی، اسحاق بن راہویہ، داؤد ظاہری، ابن جریر طبری اور سارے ائمہ مسلمین عقائد واعمال میں منجانب اللہ ہدایت پر تھے اوران ائمۂ دین پر ایسی باتوں کی حرف گیری کرنے والے جن سے یہ بزرگان دین بری تھے مطلقاً لائق التفات نہیں ہیں کیونکہ یہ حضرات علوم لدنی، خدائی عطایا، باریک استنباط، معارف کی کثرت اور دین وپرہیزگاری، عبادت وزہد

(۱) جمع الجوامع ۳/۴۴۱۔

نیز بزرگی کے اس مقام پر تھے جہاں پہنچا نہیں جاسکتا ہے۔

نیز شیخ الاسلام ابواسحاق شیرازی شافعی اپنی کتاب **اللمع فی اصول الفقه** میں رقمطراز ہیں۔

وجملته أن الراوی لایخلوا إما ان یکون معلوم العدالة أو معلوم الفسق أومجهول الحال، فإن کانت عدالته معلومة کالصحابة رضی اللّٰہ عنهم أو أفاضل التابعین کالحسن وعطاء والشعبی والنخعی أو أجلاء الأئمة کمالك، وسفیان، وأبی حنیفة، والشافعی، وأحمد، وإسحاق، ومن یجری مجراهم وجب قبول خبره ولم یجب البحث عن عدالته.(۱)

(جرح وتعدیل کے باب میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ راوی کی یا تو عدالت معلوم و مشہور ہوگی یا اس کا فاسق ہونا معلوم ہوگا، یا وہ مجهول الحال ہوگا (یعنی اس کی عدالت یا فسق معلوم نہیں) تو اگر اس کی عدالت معلوم ہے جیسے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم یا افاضل تابعین جیسے حسن بصری، عطاء بن رباح، امام سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ اور جو ان کے ہم درجہ ہیں تو ان کی خبر ضرور قبول کی جائے گی اور ان کی عدالت وتوثیق کی تحقیق ضروری نہیں ہوگی)۔

یہی بات اپنے الفاظ میں حافظ ابن صلاح نے اصول حدیث پر اپنی مشہور ومعروف کتاب علوم الحدیث میں تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

فمن اشتهرت عدالته بین أهل النقل من اهل العلم وشاع کالثناء علیه بالثقة والأمانة استغنی فیه بذلك عن بینة شاهد بعدالته تنصیصاً(۲)

”علمائے اہل نقل میں جس کی عدالت مشہور ہو اور ثقاہت وامانت میں جس کی تعریف عام ہو اس شہرت کی بناء پر اس کے بارے میں صراحتاً انفرادی تعدیل کی حاجت نہیں ہے۔“

(۱) اللمع فی اصول الفقہ ص ۴۱ مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی بمصر ۱۳۵۸ھ

(۲) علوم الحدیث المعروف بمقدمۃ ابن صلاح ص ۱۱۵۔

حافظ شمس الدین سخاوی "الجواهرُ الدرر فی ترجمة شیخ الاسلام ابن حجر" **میں رقم طراز ہیں:**

وسئل ابن حجر مما ذکرہ النسائی فی "الضعفاء والمتروکین عن أبی حنیفة رضی اللّٰہ أنه لیس بقوی فی الحدیث وھو کثیر الغلط والخطاء علی قلة روایته، ھل ھو صحیح؟ وھل وافقه علی ھذا احد من ائمة المحدثین ام لا؟

فأجاب: النسائی من أئمة الحدیث والذی قاله إنما ھو حسب ما ظھر له وأداہ إلیه اجتھادہ، ولیس کل أحد یؤخذ بجمیع قوله، وقد وافق النسائی علی مطلق القول فی جماعة من المحدثین، واستوعب الخطیب فی ترجمته من تاریخه أقاویلھم وفیھا مایقبل ومایرد وقد اعتذر عن الإمام بانه کان یری أنه لایحدث إلا بما حفظه منذ سمعه إلی أن اداہ، فلھذا قلت الروایة عنه وصارت روایته قلیلة بالنسبة لذلك، وإلا فھو فی نفس الأمر کثیر الروایة.

وفی الجملة: ترك الخوض فی مثل ھذا أولی فإن لإمام وأمثاله من قفزوا القنطرة فما صار یؤثر فی أحد منھم قول أحد بل ھم فی الدرجة اللتی رفعھم اللّٰہ تعالیٰ إلیھا من کونھم متبوعین یقتدیٰ بھم فلیعتمد ھذا واللّٰہ ولی التوفیق(۲)

"شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ سے دریافت کیا گیا کہ امام نسائی نے اپنی کتاب "الضعفاء والمتروکین" **میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ** "إنه لیس بالقوی فی الحدیث وھو کثیر الغلط والخطاء علی قلة روایته" **(کیا یہ درست ہے اور ائمہ محدثین میں کسی نے اس قول میں ان کی موافقت کی ہے؟) تو شیخ اسلام حافظ ابن حجر نے جواب دیا۔ نسائی ائمہ حدیث میں ہیں انھوں نے امام اعظمؒ کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ اپنے علم واجتہاد کے مطابق کہی ہے۔ اور ہر شخص کی ہر بات لائق قبول نہیں ہوتی، محدثین کی جماعت میں سے کچھ لوگوں نے اس بات میں نسائی کی موافقت کی ہے اور امام خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام اعظم کے تذکرے میں ان لوگوں کے اقوال**

(۲) بحوالہ اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمہ رضی اللہ عنہم ص ۱۱۶-۱۱۷، از محقق علامہ محمد عوامہ۔

کو جمع کر دیا ہے جن میں لائق قبول اور قابل رد دنوں طرح کے اقوال ہیں۔امام اعظمؒ کی قلت روایت کے بارے میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ روایت حدیث کے سلسلے میں چونکہ ان کا مسلک یہ تھا کہ اسی حدیث کا نقل کرنا درست ہے جو سننے کے وقت سے بیان کرنے کے وقت تک یاد ہو، باب روایت میں اسی کڑی شرط کی بناء پر ان سے منقول روایتیں کم ہوگئیں ورنہ وہ فی نفسہٖ کثیر الروایت ہیں''۔

''بہر حال (امام اعظمؒ کے متعلق) اس طرح کی باتوں میں نہ پڑنا ہی بہتر ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ اور ان جیسے ائمہ دین ان لوگوں میں ہی ں جو اس پل کو پار کر چکے ہیں (یعنی باب جرح میں ہماری بحث و تحقیق سے بالاتر ہیں) لہٰذا ان میں کسی کی جرح مؤثر نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو امامت و مقتدائیت کی جو رفعت و بلندی عطا کی وہ اپنے اسی مقام بلند پر فائز ہیں۔ان ائمہ حدیث کے متعلق اسی تحقیق پر اعتماد کرو اللہ تعالیٰ ہی توفیق کے مالک ہیں۔''

ان اکابر علماء حدیث وفقہ کی مذکورہ بالا تصریحات اور حدیث وفقہ کے اس مسلمہ اصول کے پیش نظر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی توثیق و تعدیل سے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کے انفرادی اقوال پیش کئے جائیں پھر بھی بغرض فائدہ مزید امام اعظمؒ کی توثیق و تعدیل سے متعلق ذیل میں کچھ ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال درج کئے جارہے ہیں۔

۱- قال محمد بن سعد العوفی سمعت یحییٰ بن معین یقول کان أبو حنیفة ثقة لا یحدث بالحدیث إلا بما یحفظه و لا یحدث بمالا یحف.(۱)

''محمد بن سعد عوفی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین سے کہتے ہوئے سنا کہ امام ابوحنیفہ ثقہ تھے وہ اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو انہیں محفوظ ہوتی تھی اور جو حدیث یاد نہ ہوتی بیان نہیں کرتے تھے۔''

۲- وقال صالح بن محمد الأسدی الحافظ سمعت یحییٰ بن معین

(۱) تہذیب الکمال از حافظ مزی ۷/۳۴۰ مطبوعہ موسسۃ الرسالہ ۱۴۱۸ھ۔

يقول كان أبو حنيفة ثقة فى الحديث.(١)

''حافظ صالح بن محمد اسدی کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین کو کہتے ہوئے سنا کہ امام ابوحنیفہ حدیث میں ثقہ تھے۔''

٣- وقال علی بن المدینی أبوحنیفة روی عنه الثوری، وابن المبارك وحماد بن زید وهشیم ووکیع بن الجراح وعباد بن العوام وجعفر بن عون وهو ثقة لا بأس به.(٢)

امام بخاری کے استاذ کبیر علی بن المدینی کا قول ہے کہ امام ابوحنیفہ سے سفیان ثوری عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع بن الجراح، عباد بن عوام اور جعفر بن عون روایت کرتے ہیں اور وہ ثقہ تھے ان میں کوئی خرابی نہیں تھی۔

٤- قال محمد بن اسماعیل سمعت شبابة بن سوار کان شعبة حسن الرای فی أبی حنیفة.(٣)

شبابۃ بن سوار کا بیان ہے کہ امام شعبہ بن الحجاج امام ابوحنیفہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔

٥- قال عبداللّٰه بن أحمد بن إبراهیم الدورقی قال سئل یحیٰی بن معین وانا اسمع عن ابی حنیفة فقال: ثقة ماسمعت احد أضعّف هذا شعبة بن الحجاج یکتب إلیه ان یحدث ویامره وشعبة شعبه.(٤)

''عبداللہ دورقی کہتے ہیں یحییٰ بن معین سے امام ابوحنیفہ کے متعلق پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا کہ یحییٰ بن معین نے فرمایا وہ ثقہ ہیں میں نے کسی سے ان کی تضعیف نہیں سنی، یہ امام شعبہ ہیں جنھوں نے امام ابوحنیفہ کو مکتوب لکھا ہے کہ آپ حدیث روایت کیجئے یعنی

(١) ایضاً۔

(٢) جامع بیان العلم وفضلہ ٢/١٠٨٣، از حافظ ابن عبدالبر مطبوعہ دار الجوزیہ طبعۃ ثالثہ ١٤١٨ھ۔

(٣) الانتقاء فی فضائل الائمة الثلاثة الفقهاء ص ١٩٦ از حافظ ابن عبدالبر مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ بیروت لطبعة الاولی ١٤١٧ھ۔

(٤) جامع بیان العلم وفضلہ ٢/١٠٨٤۔

امام شعبہ نے انہیں حدیث کی روایت کا حکم دیا اور جرح وتعدیل کے فن میں شعبہ کا جو مقام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔''

اس موقع پر بغرض اختصار ائمہ جرح وتعدیل میں سے امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی اورامام شعبہ بن الحجاج کے اقوال پر اکتفاء کیا جارہا ہے ورنہ "یقول امام ابن عبدالبر: الذین رووا عن أبی حنیفة ووثقوہ وأثنوا علیه أکثر من الذین تکلموا فیه"

یعنی امام ابوحنیفہ سے حدیث کی روایت کرنے اور ان کی توثیق وتعریف کرنے والوں کی تعداد ان پر کلام کرنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔

پھر ان مذکورہ ائمہ کا فن جرح وتعدیل میں جو مقام ومرتبہ ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ ان میں سے صرف ایک کی تعدیل کسی کی عدالت کے ثبوت کیلئے کافی سمجھی جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ اورفن جرح وتعدیل

سراج الامت، سید الفقہاء نہ صرف ایک عادل وضابط حافظ حدیث تھے بلکہ ائمہ محدثین کی اس صف میں شامل تھے جو علوم حدیث اور رجال حدیث میں مہارت، نیز ذکاوت وفراست وعدالت وثقاہت میں اس معیار پر تھے جن کے فیصلوں پر راویانِ حدیث کے مقبول وغیر مقبول ہونے کا مدار ہے۔

چنانچہ الامام الناقد الحافظ ابوعبداللہ شمس الدین محمد الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ طبقات المحدثین کے فن میں اپنی جامع ونافع ترین کتاب ''تذکرۃ الحفاظ'' کے سرورق پر رقم طراز ہیں:

هذه تذكرة اسماء معدلی حملة العلم النبوی و من يرجع اجتهادهم فی التو ثيق و التضعيف و التصحيح و التعريف (۱)

''یہ مستقیم السیرت حاملین حدیث اور رجال کی توثیق وتضعیف نیز حدیث کی تصحیح وتضعیف میں جن کے اجتہاد ورائے کی جانب رجوع کیا جاتا ہے کے اسماء کا تذکرہ ہے۔''

(۱) تذکرۃ الحفاظ ۱/۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بلا تاریخ۔

اور تذکرہ میں امام ذہبی پانچویں طبقہ کے حفاظ حدیث میں امام صاحب کا بھی ذکر ہے(۱) جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ذہبی نے (جن کے بارے میں حافظ ابن حجر کا فیصلہ ہے کہ نقد رجال میں استقراء تام کے مالک ہیں) کے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہ کا شمار ان ائمہ حدیث میں ہے جن کے قول سے جرح وتعدیل کے باب میں سند پکڑی جاتی ہے۔

پھر یہی امام ذہبی اپنے رسالہ ”ذکر من یعتمد قوله فی الجرح والتعدیل“ میں لکھتے ہیں۔

فاول من زكّىٰ وجرّح عند انقراض عصر الصحابة

١- الشعبى، ٢-وابن سيرين ونحوهما حفظ عنهم توثيق أناس وتضعيف آخرين. سبب قلة الضعفاء فى ذلك الزمان: قلة متبوعهم من الضعفاء إذا كثر المتبوعين صحابة عدول واكثرهم من غيرالصحابة بل عامتهم ثقات صادقون يعون ما يرون وهم كبار التابعين ... ثم كان فى المائة الثانية فى اوائلها جماعة من الضعفاء من اوساط التابعين وصغارهم ... فلما كان عند انقراض امة التابعين فى حدود الخمسين ومائة تكلم طائفة من الجهابذة فى التوثيق والتضعيف، ٣- فقال ابوحنيفة ما رأيت أكذب من جابر الجعفى الخ.(٢)

”عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے خاتمہ کے بعد اولین جرح وتعدیل کرنے والوں میں امام شعبی اور امام ابن سیرین ہیں ان دونوں بزرگوں سے کچھ لوگوں کی توثیق اور کچھ دوسرے لوگوں کی جرح محفوظ ہے۔ اس عہد میں ضعفاء کی کمی کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ کے متبوعین میں حضرات صحابہ ہیں جو سب کے سب عادل ہی ہیں اور غیر صحابہ میں کبار تابعین ہیں جو عام طور پر ثقہ صادق اور اپنی مرویات کو محفوظ رکھنے والے تھے پھر دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اوساط وصغار تابعین میں ضعفاء کی ایک جماعت ہے۔ پھر

(۱) ایضاً/ ۱۶۸۔

(۲) اربع رسائل فی علوم الحدیث،ص۱۷۲-۱۷۵مطبوعہ دارالبشائر الاسلامیه الطبعة السادسة ۱۴۱۶ھ بتحقیق علامه محدث عبدالفتاح ابوغده.

جب ۱۵۰ھ کے حدود میں اکثر اور عام تابعین ختم ہو گئے تو ناقدین رجال کی ایک جماعت نے توثیق وتضعیف کے باب میں کلام کیا چنانچہ امام ابوحنیفہ نے جابر جعفی پر جرح کرتے ہوئے فرمایا: "ما رأیت اکذب من جابر الجعفی" جابر جعفی سے بڑا جھوٹا میں نے نہیں دیکھا۔"

جابر جعفی کے بارے میں امام صاحب کی اس جرح کی بنیاد پر عام طور پر ائمہ رجال نے یہی فیصلہ صادر کیا ہے کہ جابر جعفی کی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ چنانچہ امام ترمذی کی کتاب العلل میں امام صاحب کے حوالہ سے جابر جعفی پر جرح نقل کی ہے وہ لکھتے ہیں:

حدثنا محمود بن غیلان، حدثنا ابویحییٰ الحمانی قال سمعت أبا حنیفة یقول: ما رأیت احدًا أکذب من جابر الجعفی و لا أفضل من عطاء.(۱)

"امام ترمذی ناقل ہیں کہ مجھ سے محمود بن غیلان نے اور انھوں نے اپنے شیخ ابو یحییٰ حمّانی سے نقل کیا کہ میں نے ابوحنیفہ سے کہتے ہوئے سنا کہ جابر جعفی سے بڑا جھوٹا اور عطا ابن ابی رباح سے افضل میں نے نہیں دیکھا۔"

جرح وتعدیل کے باب میں امام صاحب کے اس قول کو امام ترمذی کے علاوہ امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حافظ ابن عدی نے "الکامل فی الضعفاء" میں اور حافظ ابن عبدالبر نے "جامع بیان العلم وفضلہ" میں نقل کیا ہے۔

امام بیہقی کتاب القرأت خلف الامام میں لکھتے ہیں۔

"ولو لم یکن فی جرح الجعفی الاقول ابی حنیفة رحمه الله لکفاه به شرا فانه رأه وجرّبه و سمع منه ما یوجب تکذیبه فاخبر به."(۲)

"جابر جعفی کی جرح میں اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول ہوتا تو بھی اس کے مجروح ہونے کیلئے یہ کافی تھا کیونکہ امام صاحب نے اسے دیکھا اور اس کا تجربہ کیا تھا اور اس

(۱) جامع ترمذی ۲/۳۳۳ طبع مصر ۱۲۹۲ بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث از محقق علامہ عبدالرشید نعمانی ص ۲۲۹، تہذیب التہذیب ۲/ ۴۸۔

(۲) ص ۱۰۸-۱۰۹ مطبوعہ دہلی ۱۴۱۶ھ

سے ایسی باتیں سنی تھیں جس سے اس کی تکذیب ضروری تھی لہٰذا انھوں نے اس کی خبر دی“

اور امام ابو محمد علی بن احمد المعروف بہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب ”المحلی فی شرح المجلی“ میں لکھتے ہیں۔

جابر الجعفی کذاب وأول من شهد علیه بالکذب ابو حنیفة(۱)

جابر جعفی کذاب ہے اور سب سے پہلے جس نے اس کے کاذب ہونے کی شہادت دی وہ امام ابو حنیفہ ہیں۔

ان نقول سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جرح وتعدیل کے باب میں امام بخاری، امام علی بن المدینی استاذ امام بخاری، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، امام شعبہ وغیرہ ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال کی طرح امام ابو حنیفہ کے اقوال سے بھی ائمہ حدیث احتجاج واستدلال کرتے ہیں، کتب رجال مثلاً تہذیب الکمال از امام مزی، تہذیب التہذیب از امام ذہبی، تہذیب التہذیب از حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ میں جرح وتعدیل سے متعلق امام صاحب کے دیگر اقوال بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس مختصر مقالہ میں ان سب اقوال کے نقل کی گنجائش نہیں کسی دوسرے موقع پر انشاء اللہ اس اختصار کی تفصیل بھی پیش کر دی جائے گی۔ یار زندہ صحبت باقی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العالمین والصلاة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وأصحابه وأتباعه أجمعین.

☆ ☆ ☆

(۱) ۸۱/۳ طبع بیروت۔

امام ابوداؤد اور ان کی سنن

امام ابوداؤد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اس سرائے فانی میں وارد ہوئے اور زندگی کی تہتر بہاریں دیکھ کر رہگرا ے عالم جاودانی ہوگئے، تاریخ تمدن و ثقافت میں یہ صدی اسلامی علوم وفنون کی جمع وتدوین اور بحث وتحقیق کے لحاظ سے سنہری صدی شمار ہوتی ہے، چنانچہ امام ابوداؤد کی علمی حیات پر سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے ان کے شیوخ اور اساتذہ کی فہرست میں امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راہویہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، سعید بن منصور، ہناد بن سری مسدد بن مسرہد وغیرہ جیسے اکابر ائمہ حدیث، ہم عصر علماء کی جماعت میں امام بخاری، مسلم، ابوحاتم الرازی، ابوزرعہ الرازی جیسے اساطین حدیث ورجال، اوران کے تلامذہ کی صف میں امام ترمذی، نسائی، ابوعوانہ الاسفرائینی، ابوبشر الدولابی، زکریا الساجی محمد بن نصر المروزی، ابوبکر محمد بن یحییٰ الصولی جیسے نابغۂ روزگار محدثین وعلماء نظر آتے ہیں جس سے اس عہد کے علمی نشاط وشباب کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نام ونسب

سلیمان ابن الاشعث بن اسحاق بن بشیر، بن شداد، بن عمرو، بن عمران، ابوداؤد الازدی السجستانی (۱)

(۱) تاریخ بغداد از خطیب بغدادی، ج:۹،ص:۵۵ وتہذیب، تاریخ دمشق از ابن عساکر، ج:۶،ص:۲۴۶ وفیات الاعیان از ابن خلکان، ج:۱،ص:۳۸۲ وتہذیب الکمال از مزی، ج:۳،ص:۳۶۵ وتذکرۃ الحفاظ، ج:۲،ص:۵۹۱ وسیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۰۵، از الذہبی، والبدایہ والنہایۃ ابن کثیر، ج:۱۱،ص:۶۴۔ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ۱۴۱۳ھ-۱۹۹۳ء میں عمرو بن عمران کی بجائے یحییٰ بن عمران ہے جو بلاشبہ طباعتی غلطی ہے۔

امام ابوداؤد کے والد ''الاشعث'' کے اوپر سلسلۂ نسب میں قدرے اختلاف ہے چنانچہ حافظ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں نسب نامہ یوں درج کیا ہے۔

سلیمان بن الاشعث بن شداد بن عمرو بن عامر الازدی ابوداؤد السجستانی (۱) جبکہ امام ابوداؤد کے دو اہم تلامذہ ابن داسہ اور ابوعبید الآجرّی نے اوپر مذکور سلسلۂ نسب کو بیان کیا ہے البتہ انھوں نے صرف ''بشیر'' تک کا ہی ذکر کیا ہے۔ آگے کا اضافہ خطیب بغدادی کا ہے۔ (۲)

ابن داسہ اور آجرّی ہی کے بیان پر خطیب بغدادی، مزّی اور ذہبی نے اعتماد کیا ہے۔ حافظ ابوطاہر السّلفی بھی اسی کو راجح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ''هذا القول أمثل والقلب اليه أميل'' یہی قول حق سے قریب تر ہے اور دل کا رجحان اسی جانب زیادہ ہے۔ (۳) اسی لیے یہی نسب نامہ درست ہے۔ واللہ اعلم

امام ابوداؤد کی پانچویں پشت اور شجرہ میں مذکور آخری دادا کے بارے میں حافظ ابن عساکر نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ جنگ صفین میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ (۴)

''الازدی'' ازد کی جانب نسبت ہے، جو یمن کا معروف قبیلہ ہے صاحب قاموس لکھتے ہیں ''الأزد ابن الغوث أبو حَيٍّ باليمن ومن أولاده الانصار كلهم'' ازد ابن الغوث یمن کے ایک قبیلہ کے باپ ہیں اور سارے انصار مدینہ انھیں کی اولاد ہیں۔ (۵) امام ابوداؤد کا بھی نسبی تعلق اسی یمنی قبیلہ سے ہے۔

''السجستانی'' سجستان (سیستان) کی طرف نسبت ہے۔ ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں هذه النسبة إلى سجستان وهى البلاد المعروفة ينسب إلى هذه النسبة جماعة

(۱) ج۴،ص:۱۰۲و۱۰۳رقم الترجمہ ۴۵۶۔

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۰۵۔

(۳) تہذیب الاسماء واللغات از نووی، ج:۲،ص:۲۲۵۔

(۴) تہذیب تاریخ دمشق از ابن عساکر، ج:۶،ص:۲۴۶۔

(۵) القاموس المحیط ص ۳۳۸ مطبوعہ موسسۃ الرسالہ ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۶ء۔

من العلماء منهم الامام أبوداؤد سليمان بن الأشعث السجستانی صاحب کتاب السنن (۱) یہ سجستان کی جانب نسبت ہے جوایک معروف بلاد ہے۔علماء کی ایک جماعت اس کی طرف منسوب ہے، جن میں امام ابوداؤد سجستانی ''صاحبِ سُنن'' بھی ہیں۔

حافظ ذہبی اس بلادمعروفہ کی تفصیل یوں رقم کرتے ہیں:

واما سِجّستان الإقلیم الذی منه الإمام أبوداؤد ، فهو إقلیم صغیر منفرد، یتاخم بالسند ، غربیّه بلد هراة وجنوبیّه مفازة بینه وبین اقلیم فارِس وکرمان، وشرقیّه مفازة بَرِّیَةٌ بینه وبین مکران التی هی قاعدة السند ... وشمالیّه أول الهند''(۲)

سجستان جس سے امام ابوداؤد کا وطنی تعلق ہے ایک چھوٹا سا علیحدہ صوبہ ہے جس کی سرحد سندھ سے ملتی ہے اس کی جانب مغرب شہر ہراۃ ہے اور جنوبی سمت ایک وسیع بیابان ہے جو سجستان اور فارس وکرمان کے درمیان حائل ہے جانب مشرق بھی بیابان اور خشک زمین ہے جو سجستان اور مکران (جو سندھ کا ایک بڑا شہر ہے) کے درمیان واقع ہے اور اس کا شمالی حصہ ہندوستان کی سرحد سے ملحق ہے۔

ان واضح تصریحات کے برخلاف ''ابوموسیٰ صاحب زیادات'' روایت کرتے ہیں کہ میں نے ''محمد بن نصر'' الملقب بہ قل ھو اللہ احد خواں سے کہتے ہوئے سنا کہ ''أبوداود السجستانی الإمام هو من قریة بالبصرة یقال لها سجستان ولیس من سجستان خراسان''(۳) امام ابوداؤد سجستانی بصرہ کے سجستان نامی ایک قریہ کے ہیں خراسان سے ملحق سجستان کے نہیں ہیں۔

اس قول کو حافظ منذری نے تہذیب سنن ابی داؤد کے مقدمہ میں اور ابن خلکان

---

(۱) اللباب فی تہذیب الانساب، ج:۱،ص:۴۳۱۔

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۲۰۔

(۳) زیادات ابی موسیٰ علی الانساب المتفقة لابن طاہر ص:۱۹۹ بواسطہ حاشیہ الاکمال، ج:۴،ص:۵۵۰ لابن ماکولا۔

نے وفیات الاعیان میں صیغۂ تمریض کے ساتھ ذکر کیا ہے اور امام منذری نے ساتھ ہی یہ تصریح بھی کردی ہے کہ "والأول أكثر و أشهر"

محقق یاقوت حموی نے بھی ابوموسیٰ کی بیان کردہ روایت ذکر کی ہے مگر غلطی سے اس کی نسبت حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی کی جانب کردی ہے جبکہ اس کے راوی ابوموسیٰ ہیں ابوالفضل نہیں۔ حموی اس روایت کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ محمد بن نصر المذکور کا بیان ہے کہ میں نے اہل بصرہ سے سجستان نامی بستی کے بارے میں تحقیق کی تو کسی کو بھی اس قریہ کا علم نہیں تھا۔ پھر تذکروں میں مذکور ہے کہ امام ابوداؤد کے صاحبزادے ابوبکر عبد اللہ نیساپور کے مکتب میں امام اسحاق بن راہویہ کے لڑکوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اور تذکرہ نگار یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابوبکر نے حدیث پاک کی تحصیل کا آغاز شیخ مشرق محمد بن اسلم الطّوسی سے کیا(۱)۔ اس وقت ان کی عمر دس سال سے بھی کم تھی، علاوہ ازیں حفاظ میں سے کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ امام ابوداؤد غیر معروف سجستان کے تھے۔ (۲)

معجم البلدان میں مذکور یہ قرائن بتارہے ہیں کہ امام ابوداؤد کا مسقطِ راس اور آبائی وطن موجودہ افغانستان کا صوبہ سجستان ہی ہے اور زیادات علی الانساب المتفقہ میں مذکور روایت بس روایت ہی ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

تاریخ پیدائش اور تعلیم وتحصیل

امام ابوداؤدؒ کے سارے تذکرہ نگار بیک قلم لکھتے ہیں کہ ان کی ولادت **۲۰۲ھ** میں ہوئی خود امام ابوداؤد نے بھی اپنی پیدائش کی یہی تاریخ بتائی ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں "مولده سِجستان و له ولسلفه إلى الآن عُقَد و أملاك وأوقاف" (۳) امام ابوداؤد کی جائے پیدائش سجستان ہے ان کی اور ان کے بزرگوں کی جائیدادیں، املاک اور اوقاف

(۱) امام ذہبی لکھتے ہیں: فأول شيخ سمع منه محمد بن أسلم الطوسی اولین شیخ جن سے ابوبکر ابن ابی داؤد نے حدیث کی سماعت کی محمد ابن اسلم طوسی ہیں۔

(۲) معجم البلدان ج:۳، ص:۲۴۔

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۷۔

وہاں اب تک موجود ہیں۔

امام ابوداوٗد کی نشو ونما، تربیت و پرورش سے متعلق تفصیلات کے بارے میں ان کے سوانح نویس خاموش ہیں نیز امام صاحب نے طلب و تحصیل کا آغاز کس وقت کیا اس کا ذکر بھی کسی نے نہیں کیا ہے، البتہ خود امام ابوداوٗدؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ برس کی عمر میں انھوں نے طلب علم کے لیے گھر سے رخت سفر باندھا۔ ظاہر ہے اس رحلت سے پہلے اپنے شہر کے اساتذہ سے ابتدائی ضروری علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل کر لی ہوگی چنانچہ امام الحاکم لکھتے ہیں: ”وقد كتب بخراسان قبل خروجه الى العراق فى بلده وهراة“(۱) عراق کی رحلت سے قبل انھوں نے خراسان، اپنے شہر اور ہراۃ میں تحصیل علم کیا۔ بعد ازاں مزید علمی لیاقت کے لیے مراکز علمیہ کا سفر کیا۔ آپ کے تلمیذ رشید ابوعبید الآجری ناقل ہیں:

سمعت سليمان بن الأشعث أبا داؤد يقول ولدت سنة اثنتين ومأتين، وصليت على عفان ببغداد سنة عشرين، وسمعت ابن عمر الضرير مجلسا واحدا، ودخلت البصرة وهم يقولون أمس مات عثمان المؤذن، وتبعت عمربن حفص بن غياث ولم أسمع منه شيئاً.(۲)

ابوعبید الآجریؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوداوٗد سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور میں نے ۲۲۰ھ میں عفان بن مسلم کی نماز جنازہ بغداد میں پڑھی اور ابن عمر الضریر سے صرف ایک مجلس میں حدیث کی سماعت کی، اور بصرہ اس وقت پہنچا کہ وہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ گذشتہ کل عثمان بن الہیثم المؤذن انتقال کر گئے، اور عمر بن حفص بن غیاث کے پیچھے پیچھے ان کے گھر تک گیا مگر ان سے کچھ سننے کا اتفاق نہ ہوا۔

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابوعمر الضریر کی وفات ماہ شعبان ۲۲۰ھ میں ہوئی اور ان سے

(۱) تہذیب الکمال از مزّی مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء، ج:۳، ص:٦٦٥۔

(۲) سوالات ابوعبید الآجرّی، ج:۲، ص:۲۹۴ و۲۹۵۔

ایک ماہ قبل یعنی رجب میں عثمان بن الہیثم فوت ہوئے۔(۱)

امام ابوداوٗدؒ کے اس بیان سے واضح ہے کہ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے گھر سے نکلے اور اس وقت کے عظیم علمی مرکز بغداد پہنچے، یہی ان کا اولین علمی سفر بتایا جاتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نوعمری ہی سے انھیں تحصیل علم کا شوق تھا اور اسکے لیے وطن اور اقربا سے مفارقت اور اسفار کی صعوبت انکے جذبۂ صادق کی راہ میں حائل نہیں ہوسکی۔

تعلیمی اسفار

امام ابوداوٗد ان اکابر ائمہ حدیث میں ہیں جنھوں نے حدیث پاک کی تعلیم وتحصیل کے لیے کثرت سے اسفار کیے اور اپنے عہد کے مراکز علمیہ میں پہنچ کر وہاں کے شیوخ و اساتذہ سے احادیث کی سماعت و کتابت کی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر صراحت کرتے ہیں کہ

أحد أئمة الحديث الرحالين فی الآفاق فی طلبه ... وسمع الكثير عن مشائخ البلدان فی الشام، ومصر، والجزيرة، والعراق، وخراسان وغير ذلك.(۲)

امام ابوداوٗد ان ائمہ حدیث میں سے ایک ہیں جنھوں نے حدیث کی طلب میں آفاق کا چکر لگایا ہے، شام، مصر، جزیرہ، عراق، خراسان وغیرہ شہروں کے بہت سارے مشائخ سے احادیث کی سماعت کی۔

حافظ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

"أحد من رحل وطوّف وجمع وصنّف وكتب عن العراقيين والخراسيين والمصريين والجزريين" (۳)

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۰۴، امام ذہبی سیر اعلام النبلاء ج:۱۰، ص:۲۱۰، امام ابوداوٗد کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ عثمان المؤذن کی وفات ۱۱/رجب ۲۲۰ھ کو ہوئی۔

ء حافظ ذہبی لکھتے ہیں: "فأبوداؤد أول ما قدم من البلاد دخل بغداد وهو ابن ثمان عشرة سنة وذلك قبل أن يروی البصرة، ثم ارتحل من بغداد البصرة" سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۱۔

(۲) البدایۃ والنہایۃ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ۱۴۱۳ھ-۱۹۳۰ء، ج:۱۱، ص:۶۴۔

(۳) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۵۔

امام ابوداؤد ان محدثین میں سے ایک ہیں جنھوں نے طلب حدیث کے لیے اسفار کیے، مراکز علمیہ کا چکر لگایا، احادیث جمع کیں، کتابیں تصنیف کیں، عراق، شام، مصر اور جزیرہ کے شیوخ سے احادیث نقل کیں۔

امام مزّی نے ان پر شیوخ حجاز وغیرہ کا اضافہ کیا ہے۔

حافظ ابن عساکر یوں تحریر کرتے ہیں:

”وسمع الحديث بدمشق، ومصر، والبصرة، والكوفة، وبغداد، وخراسان من خلق.“ (۱)

دمشق، مصر، بصرہ، کوفہ، بغداد اور خراسان میں بہت سارے لوگوں سے احادیث کی سماعت کی۔

امام ابوداؤد کے تذکرہ نویسوں کی تصریحات نیز ان کے اساتذہ کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بغداد، بصرہ، کوفہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، دمشق، حلب، حمص، ہراۃ، مرو، بلخ، بغلان، نیشاپور، رے، واسط، جزیرہ، بیروت، حرّان، رملہ، مصر، طرسوس وغیرہ بلاد اسلامیہ کے شیوخ سے حدیث کی سماعت کی۔

اسفار کی ضروری تفصیلات

امام ابوداؤد نے اپنی رحلۃ علمیہ اور اسفار کی وقتاً فوقتاً جو مختصر روداد اور اپنے شیوخ کے متعلق جو معلومات دی ہیں ان سے اوپر مذکور اجمال کی بعض تفصیلات یوں سامنے آتی ہیں کہ امام ابوداؤد جو ۲۰۲ھ میں موجودہ افغانستان کے ایک صوبہ یا ضلع سجستان میں پیدا ہوئے، طلب علم کے لیے ۲۲۰ھ میں بغداد میں نظر آتے ہیں جہاں عفان بن مسلم کی نماز جنازہ میں حاضری کا شرف انھیں حاصل ہوا، بغداد سے اسی سال بصرہ آ گئے جہاں لوگوں سے انھیں معلوم ہوا کہ کل گذشتہ عثمان بن الہیثم المؤذن اللہ کو پیارے ہو گئے، گذشتہ سطور میں یہ بات گذر چکی ہے کہ ”عثمان المؤذن کی وفات ۱۱؍رجب ۲۲۰ھ کو ہوئی، بصرہ میں

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۶۔

ان کا قیام ۲۲۱ھ تک رہا اور محمد بن بشار المعروف بہ بُندار، ابوموسیٰ الزمن وغیرہ سے وہاں حدیث کی سماعت کی چنانچہ خود امام ابوداؤد کا قول ہے "كتبت عن بُندار وأبي موسىٰ سنة احدى وعشرين" (۱) میں نے بندار اور ابوموسیٰ الزمن سے ۲۲۱ھ میں احادیث نقل کیں، اسی سال یہاں سے کوچ کر کے کوفہ پہنچے خود انھیں کا بیان ہے "دخلت الكوفة سنة ۲۲۱ھ" (۲) میں ۲۲۱ھ میں کوفہ پہنچا، بظاہر یہیں سے عازم مکہ معظّمہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر امام عبداللہ بن مسلمہ القعنبی المتوفی ۲۲۱ھ سے احادیث کی تحصیل کی۔ مکہ معظّمہ سے ۲۲۲ھ میں دمشق کے لیے رخت سفر باندھا جہاں ابوالنضر اسحاق بن ابراہیم الدمشقی سے اخذ علم کیا، حافظ الآجری لکھتے ہیں کہ امام ابوداؤدؒ نے ایک دن اسحاق الدمشقی کا ذکر کیا اور فرمایا: "مارأيت بدمشق مثله كان كثير البكاء كتبت عنه سنة اثنين وعشرين"(۳) میں نے دمشق میں ان جیسا نہیں دیکھا وہ بہت رونے والے تھے میں نے ان سے ۲۲۲ھ میں حدیثیں لکھیں، یہاں سے ۲۲۳ھ میں پھر بصرہ آگئے اور محمد بن کثیر العبدی البصری المتوفی ۲۲۳ھ کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے، اسی موقع پر ان کی ملاقات حفص بن عمر الحوضی سے ہوئی۔(۴) بصرہ سے جانب حمص متوجہ ہوئے اور یہاں حیوۃ بن الشریح الحمصی المتوفی ۲۲۴ھ اور حافظ یزید بن عبدربہ المتوفی ۲۲۴ھ نیز دیگر شیوخ حدیث سے اخذ واستفادہ کیا۔(۵) حمص کا سفر کئی بار کیا جس کا ذکر امام ابوداؤد نے محمد بن اسماعیل بن عیاش کے تذکرہ میں کیا ہے۔(۶)

۲۲۷ھ میں وہ بیروت وارد ہوئے اور ابن ابی سمینہ کی رفاقت میں عباس بن الولید بن مزید البیروتی سے حدیث کی نقل وسماع کیا۔(۷) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اسفار

(۱) سوالات ابوعبید الآجرّی، ج:۲، ص:۱۴۲۔

(۲) تہذیب الکمال ج:۱۳، ص:۲۶۵۔

(۳) سوالات ابوعبید الآجرّی، ج:۲، ص:۲۲۵۔

(۴) ایضاً ج:۱، ص:۴۴۲۔

(۵) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۰۴۔

(۶) سوالات آجری، ج:۲، ص:۲۳۱۔ (۷) ایضاً، ج:۲، ص:۲۵۴ و۲۵۵۔

کے دوران وہ بغداد آتے جاتے رہے چنانچہ مسدد بن مسرھد کے سانحۂ ارتحال کے متعلق ان کا یہ بیان ہے کہ مسدد کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی اور میں نے اس حادثہ کی خبر امام احمد بن حنبل کو دی۔(۱) بغداد ہی کے بعض اسفار میں ان کی ملاقات امام ابوحاتم الرازی سے ہوئی اور ان کی خدمت میں بغرض سلام حاضر ہوئے۔(۲) ۲۳۰ھ میں وہ بمقام رملہ محمد بن سماعہ الرملی سے تحصیل علم کرتے نظر آتے ہیں(۳) اسی سال ان کے خلف صدق ابوبکر عبداللہ بن ابوداؤد کی سجستان میں ولادت ہوئی۔(۴)

۲۳۵ھ میں ھیثم بن خالد الجہنی سے روایت کی(۵) ھیثم ابن خالد الجہنی کوفی ہیں اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلادشام وغیرہ سے لوٹ کر کوفہ آئے اور یہیں ان سے سماعت کی۔واللہ اعلم

برادر کبیر کی رفاقت

ان اسفار میں امام ابوداؤد کے بڑے بھائی محمد بن الاشعث السجستانی ان کے رفیق تھے۔امام ذہبی لکھتے ہیں: "كان أخوه محمد بن الأشعث أسن منه بقليل و كان رفيقا له في الرحلة ... و مات كهلاً قبل أبي داؤد بمدة" (۶) امام ابی داؤد کے بھائی محمد بن الاشعث ان سے کچھ بڑے تھے اور رحلت علمیہ میں ان کے رفیق سفر تھے، امام ابوداؤد سے بہت پہلے ادھیڑ عمر میں اُن کی وفات ہوئی۔

وقفہ وقفہ سے وطن مالوف کی مراجعت

اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگرچہ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ امام ابوداؤد

(۱) ایضا، ج:۲،ص:۵۴۔
(۲) کتاب الجرح والتعدیل ازعبدالرحمٰن بن ابی حاتم ج:۴،ص:۱۰۱-۱۰۲۔
(۳) سوالات الآجری، ج:۲،ص: ۲۹۵۔
(۴) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۲۲۔
(۵) سوالات ابوعبید الاجرّی، ج:۱،ص:۱۸۵۔
(۶) سیر الاعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۲۱۔

اپنے اس پندرہ سالہ سفر میں کبھی وطن مالوف سجستان بھی گئے، مگر وہاں ان کی جائیداد، املاک اوراوقاف کا ہونا، ان کا شادی شدہ ہونا اور وطن میں بیوی کی موجودگی، نیز ۲۳۰ھ میں صاحبزادے کی پیدائش ایسے قرائن ہیں جن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے اس طویل علمی اسفار کے دوران وقفہ، وقفہ سے وہ سجستان آتے رہے تاکہ املاک واوقاف کی نگرانی اور خانگی ضروریات کی کفالت فی الجملہ ہوتی رہے۔ البتہ ۲۳۸ھ میں امام ابوداؤد کی سجستان میں موجودگی حافظ ذہبی کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتی ہے۔

عبدالله بن سليمان بن الأشعث، الإمام العلامة شيخ بغداد أبوبكر السجستانى صاحب التصانيف ولد بسجستان فى سنة ثلاثين ومئتين وسافر به أبوه وهوصبى فكان يقول رأيت جنازة اسحاق بن راهويه ، قلت و كانت فى سنة ثمان و ثلاثين و مئتين، قال وأول شيخ سمع عنه محمد بن أسلم الطوسى و سُر أبوه لجلالة محمد بن أسلم"(۱)

الامام، العلامہ، شیخ بغداد عبداللہ بن سلیمان بن الاشعث، ابوبکر السجستانی ۲۳۰ھ میں سجستان میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں ان کے والد اپنے ساتھ انھیں سفر میں لے گئے، ابوبکر عبداللہ کہتے تھے کہ میں نے نیساپور میں اسحاق بن راہویہ کے جنازہ کو دیکھا، امام ذہبی کہتے ہیں کہ امام ابن راہویہ کے جنازہ کی یہ رویت ۲۳۸ھ میں واقع ہوئی اوراولین شیخ جن سے ابوبکر بن ابی داؤد نے سماعت کی شیخ مشرق محمد بن اسلم الطوسی ہیں۔ شیخ طوسی کی علم وفضل میں جلالت شان کی بناء پر (بیٹے کے اس معنوی شرف سے) امام ابوداؤد کو بڑی مسرت ہوئی۔

صاحبزادے ابوبکر کی معیت

اسی طرح امام الحاکم بیان کرتے ہیں:

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۲

ثم رحل بابنه أبي بكر بقية المشائخ، وجاء إلى نيساپور فسمع ابنه من إسحاق ابن منصور، ثم خرج إلى سجستان وطالع بها اسبابه، وانصرف إلى البصرة واستوطنها"(۱)

پھر اپنے صاحبزادے ابوبکر کے ساتھ بقیہ مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نیساپور آئے جہاں صاحبزادے ابوبکر نے اسحاق بن منصور الکوشج المتوفی ۲۵۱ھ سے درس حدیث لیا۔ پھر "وطن" سجستان کی مراجعت کی اور وہاں گھر کے اسباب کا معاینہ کیا، پھر بصرہ گئے اور (آخر میں) اسی کو وطن بنالیا۔

امام حاکم کے اس بیان میں خاصا اجمال ہے پھر بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیساپور سے (جہاں ۲۳۸ھ میں پہنچے تھے) وطن واپس لوٹے اور گھر کے اسباب وغیرہ کی دیکھ ریکھ کے بعد پھر سماع حدیث کیلئے سفر پر روانہ ہوگئے اس سفر میں ولدرشید ابوبکر عبداللہ السجستانی ساتھ رہے، امام ابوداؤد نے اس دوران جن شیوخ سے حدیث کی سماعت کی ابوبکر بھی ان کے شریک درس رہے، ابن خلکان لکھتے ہیں وشارك اباه في شيوخه بمصر والشام ابوبکر اپنے والد کے مصر اور شام کے شیوخ میں ان کے شریک درس رہے۔(۲) چنانچہ جب امام ابوداؤد مصر میں محدث احمد بن صالح المتوفی ۲۴۸ھ کی خدمت میں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ شیخ احمد مجلس درس میں کسی امرد نوجوان کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دیتے تو امام ابوداؤد نے بیٹے کو شریک درس کرنے کیلئے ان کے چہرے پر مصنوعی داڑھی لگادی۔ اس تدبیر سے وہ اپنے والد کے ساتھ شیخ احمد بن صالح کی مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ کچھ دنوں بعد کسی طرح شیخ کو اس کی خبر ہوگئی تو بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا "أمثلي يعمل معه هذا؟" کیا مجھ جیسے کے ساتھ یہ حیلہ کیا گیا، اس پر امام ابوداؤد نے معذرت کی اور عرض کیا کہ میرے اس نوعمر بیٹے کا بڑوں سے مقابلہ کرکے دیکھ لیں اگر علم ومعرفت میں ان سے کمتر ٹھہرے تو پھر اسے سماع حدیث سے ضرور محروم فرمادیں، اس

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۸۔

(۲) وفیات الاعیان، ج:۱، ص:۳۸۲۔

پر امام احمد بن صالح مصری نے ان کا امتحان لیا تو وہ سب پر فائق نکلے، پھر بھی اپنے معمول کے مطابق انھیں مجلس درس میں حاضری کی اجازت نہیں دی، اسی بناء پر امام احمد بن صالح مصری کی جملہ مرویات کی بجائے نصف یا نصف سے کچھ زائد کی حافظ ابوبکر عبداللہ السجستانی روایت کرتے ہیں۔(۱)

اساتذۂ کرام

گذشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ امام ابوداؤد نے ۲۲۰ھ میں بہ عمر اٹھارہ برس تحصیل حدیث کے لیے اسفار کا آغاز کیا جو تقریباً ۲۴۰-۲۴۱ھ تک جاری رہا اس مدت میں انھوں نے سیکڑوں شیوخ سے حدیث کا سماع کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں "وشيوخه فى السنن وغيرها نحو ثلاثمائة نفس"(۲) کتاب السنن وغیرہ میں انکے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے ان تین سو میں سے تقریباً چوہتر (۷۴) کا نام بنام ذکر امام مزّی نے تہذیب الکمال میں کیا ہے جن میں کچھ حضرات یہ ہیں:

امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی ابن المدینی، اسحاق بن راہویہ، مسلم بن ابراہیم، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوعمر والحوضی، عثمان بن ابی شیبہ، ہناد ابن سری، قتیبہ بن سعید، مسدد بن مسرہد، محمد بن بشار المعروف بہ بندار، ابوالولید الطیالسی، موسیٰ بن اسماعیل المنقری، ابوجعفر النفیلی، ابوسلمہ التبوذکی، محمد بن کثیر العبدی، قطن بن نسیر وغیرہ، اپنے سارے اساتذہ میں سے امام ابوداؤد نے بطور خاص امام احمد بن حنبل سے استفادہ کیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں "وهو من نجباء أصحاب الإمام أحمد لازم مجلسه مدة" وہ امام احمد کے برگزیدہ اور بڑے تلامذہ میں تھے ایک طویل مدت تک ان کی مجلس درس میں بیٹھے۔(۳) امام ابوداؤد اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ امام احمد ہی سے متاثر تھے حتی کہ

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۲۶-۲۲۷ وتذکرۃ الحفاظ، ج:۲، ص:۷۰۰-۱۷۷۔ حافظ ذہبی نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "يروىٰ بإسناد منقطع"

(۲) تہذیب التہذیب، ج:۴، ص:۱۵۵۔

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۵۔

سیرت وعادت اور چال ڈھال میں انھیں کی وضع کی پابندی کرتے تھے۔

کیا امام ابوداؤد کے تمام شیوخ ثقہ ہیں؟

ائمہ حدیث میں سے ایک جماعت کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہے کہ یہ ائمہ اخذ حدیث میں اس درجہ محتاط تھے کہ صرف انھیں راویوں سے حدیث لیتے تھے جو ان کے نزدیک ثقہ اور قابل اعتماد ہوتے تھے اس طبقہ کے محدثین میں سے امام احمد بن حنبل، بقی بن مخلد، حریز بن عثمان، سلیمان بن حرب، امام شعبہ، عبدالرحمٰن بن مہدی، امام مالک، یحییٰ بن سعید القطان کے اسماء کی تصریح حافظ سخاوی نے فتح المغیث میں کی ہے۔(۱) امام ابوداؤد کا شمار بھی محدثین کے اسی طبقہ میں کیا جاتا ہے چنانچہ حافظ ابن القطان الفاسی اپنی مشہور اور مفید ترین کتاب "بیان الوهم والایهام الواقعین فی کتاب الاحکام" میں لکھتے ہیں "و أبو داؤد إنما یروی عن ثقة عنده" (۲) امام ابواؤد صرف اسی سے روایت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ثقہ ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی حسین بن علی بن الاسود کے تذکرہ میں صراحت کی ہے کہ "إنه (یعنی أبا داؤد) لا یروی الا عن ثقة عنده" (۳) امام ابوداؤد صرف اسی سے روایت کرتے ہیں جو ان کی رائے میں ثقہ ہوتا ہے۔ نیز اس کی تائید خود امام ابوداؤد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے، حافظ آجری کا بیان ہے "سئل أبو داؤد عن سوار بن سهل فقال : لولم أثق مارویت عنه"(۴) امام ابواؤد سے سوار بن سہل البصری کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا اگر میرے نزدیک قابل اعتماد اور ثقہ نہ ہوتے تو میں ان سے روایت نہ کرتا۔

بایں ہمہ ان کی تصانیف میں متعدد ایسے شیوخ موجود ہیں جو امام ابوداؤد کی رائے میں ثقہ نہیں ہیں اور خود انھوں نے ان کی تضعیف کی ہے مثلاً امام ابوداؤد شعیب بن ایوب

(۱) ج:۲،ص:۴۲ طبع وارانسی ہند۔

(۲) ج:۳،ص:۲۶۶، الرقم ۱۲۲۷۔

(۳) تہذیب التہذیب، ج:۲،ص:۳۱۲۔

(۴) سوالات الآجری، ج:۲،ص:۸۰۔

الصُر یفینی کے بارے میں کہتے ہیں "انی لأخاف الله عن الروایة عن شعیب بن أیوب" شعیب بن ایوب سے روایت کرنے میں مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے۔(۱) اور امام مزی لکھتے ہیں "روی عنه أبوداؤد حدیثا واحدا"(۲) امام ابوداؤد نے ان سے ایک روایت کی ہے۔ اسی طرح ہشام بن عبدالملک الحرانی الحمصی کے متعلق امام ابوداؤد کہتے ہیں "شیخ ضعیف"(۳) جب کہ امام مزی کہتے ہیں "روی عنه أبوداؤد" امام ابوداؤد نے ان سے روایت کی ہے(۴) نیز ابراہیم بن العلاء بن الضحاک الحمصی، امام ابوداؤد کے نزدیک "لیس بشيء" ہیں(۵) حالانکہ امام مزی صراحت کرتے ہیں کہ امام ابوداؤد نے ان سے روایت کی ہے۔(٦)

ان کے علاوہ اور بھی متعدد راویانِ حدیث ہیں جو امام ابوداؤد کی رائے میں ضعیف ہیں اور امام مزی نے تہذیب الکمال میں انھیں امام صاحب کے شیوخ میں شمار کیا ہے؛ لیکن تین سو کی کثیر تعداد میں ان کے گنے چنے چند شیوخ کے ضعیف ہونے سے امام ابوداؤد کی یہ خصوصیت کہ "لا یروی الا عن ثقة عنده" متاثر نہیں ہوگی کیونکہ نادر وشاذ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

کتاب "السنن" کی تالیف

امام ابوداؤد مصر میں احمد بن صالح وغیرہ شیوخ مصر سے سماع حدیث کے بعد دیگر بلاد اسلامیہ کے محدثین سے اخذ واستفادہ کرتے ہوئے طرسوس وارد ہوئے اور وہیں بیس سال مقیم رہ کر کتاب السنن کی جمع وترتیب کا عظیم الشان کام انجام دیا۔ امام نووی رقمطراز ہیں:

"ذکر محمد بن صالح الهاشمی قال لنا أبوداؤد: وأقمت بطرسوس عشرین سنة أکتب المسند فکتبت أربعة آلاف حدیث ، ثم نظرت فإذا مدار

(۱) سوالات الآجری، ج:۲،ص:۲۹۹۔ (۲) تہذیب الکمال الرقم ۲۷۲۹۔

(۳) سوالات الآجری، ج:۲،ص:۲۵۱۔ (۴) تہذیب الکمال الرقم ۱۷۸۔

(۵) سوالات الآجری، ج:۲،ص:۲۲۹۔ (٦) تہذیب الکمال رقم الترجمہ ۲۱۸۔

أربعة آلاف علی أربعة أحادیث لمن وقفه الله تعالیٰ‘‘ (۱)

محمد بن صالح الہاشمی نے ذکر کیا کہ ہم سے امام ابوداوٗد نے فرمایا میں طرسوس میں بیس سال مقیم رہا اس مدت میں مسند (یعنی کتاب السنن) کو لکھتا رہا میں نے اس میں چار ہزار حدیثیں درج کیں پھر میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ ان چار ہزار حدیثوں کا مدار چار احادیث پر ہے ایسے شخص کے لیے جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔

امام ابوداوٗد کا طرسوس میں یہ قیام ۲۴۰-۲۴۱ھ کی حدود میں ہوا ہے کیونکہ خود ان کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۲۴۲ھ میں طرسوس میں موجود تھے، حافظ الآجرّی لکھتے ہیں:

”سمعت أبا داؤد یقول: مات حامد بن یحییٰ بطرسوس فی یوم مطیر ما قدرنا أن نخرج فی الجنازة“(۲)

میں نے امام ابوداوٗد سے کہتے ہوئے سنا کہ حامد بن یحییٰ (بن ہانی البلخی ابوعبداللہ نزیل طرسوس) کی وفات تیز بارش کے دن ہوئی جس کی بناء پر ہم ان کے جنازہ میں نہیں جا سکے۔

علمائے رجال بغیر اختلاف کے لکھتے ہیں کہ حامد بن یحییٰ کا انتقال ۲۴۲ھ میں ہوا ہے۔ محمد بن صالح الہاشمی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ”کتاب السنن“ کی تالیف کا کام ۲۶۰ھ کے لگ بھگ انجام کو پہنچا۔

امام خطیب کی روایت پر ایک نظر

لیکن اس کے برخلاف امام خطیب بغدادی لکھتے ہیں: ”ویقال إنه صنفه قدیما وعرضه علی أحمد بن حنبل فاستجاده و استحسنه“(۳) اور کہا گیا ہے کہ امام ابوداوٗد نے کتاب السنن ابتدائی زمانہ میں تصنیف کر لی تھی اور اسے امام احمد المتوفی ۲۴۱ھ

(۱) تہذیب الاسماء واللغات، ج:۲، ص:۲۲۶، حافظ سِلَفی نے بھی اپنے مقدمہ معالم السنن للخطابی میں اپنی سند سے محمد بن صالح الہاشمی کی یہ روایت درج کی ہے۔

(۲) سوالات الآجرّی، ج:۲، ص:۲۵۵۔ (۳) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۶۔

کی خدمت میں پیش کیا تو امام احمد نے کتاب کی خوبی کو سراہا اور اس کی تحسین فرمائی۔

خطیب بغدادی کی اس معلق، بصیغۂ تمریض روایت کو انھیں کے حوالہ سے حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں، امام مزی نے تہذیب الکمال میں، امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے نیز حافظ سِلَفی نے امام خطابی کی شرح معالم السنن کے مقدمہ میں بایں الفاظ اس روایت کا ذکر کیا ہے "حين عُرض كتاب أبي داؤد على أحمد بن حنبل ورآه، استحسنه وارتضاه، وحسبه ذلك فخرا"(۱) جس وقت امام ابوداؤد کی کتاب امام احمد بن حنبل کو پیش کی گئی اور امام صاحب نے اس کو ملاحظہ کیا تو اس کی تحسین کی اور پسندیدگی کا اظہار کیا، امام ابوداؤد کے فخر کے لیے یہ بات کافی ہے۔

مگر اس روایت کی صحت پر اعتماد درج ذیل وجوہ سے مشکل ہے:

(الف) یہ روایت بے سند، بصیغۂ تضعیف ذکر کی گئی ہے۔

(ب) امام ابوداؤد کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور تحصیل علم کے لیے انھوں نے ۲۲۰ھ میں گھر سے قدم باہر نکالا اور علمی اسفار کا آغاز کیا امام احمد بن حنبل کی وفات ۲۴۱ھ کے وقت امام ابوداؤد کی عمر ۳۹ سال کی تھی اور بروایت ابن صالح الہاشمی خود امام صاحب نے یہ صراحت کی ہے کہ کتاب "السنن" کی تدوین وتالیف میں ۲۰ سال صرف ہوئے، لہٰذا امام احمدؒ کی خدمت میں کتاب مذکور پیش کرنے کی یہ روایت اگر صحیح مان لی جائے تو لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ امام ابوداؤد نے ۱۹/برس کی عمر میں کتاب کی تصنیف کا آغاز کر دیا تھا جب کہ ان کی رحلتِ علمیہ اور شیوخ سے سماع حدیث کا یہ دوسرا سال ہی ہے، تعلیم وتحصیل کے ابتدائی مرحلہ میں اس طرح کے کام کا تصور بعید از عقل وقیاس ہے۔

(ج) امام ابوداؤد کے نامور تلمیذ، کتاب "السنن" کے راوی ابوبکر ابن داستہ کا بیان ہے کہ میں نے امام صاحب سے فرماتے ہوئے سنا کہ "میں نے (شیوخ حدیث سے)

(۱) معالم السنن، ج:۴، ص:۳۵۸ طبع مصر ومختصر سنن ابی داؤد للمنذری معہ معالم السنن وتہذیب لابن القیم، ج:۸، ص:۱۴۲۔

آنحضرت ...... کی پانچ لاکھ حدیثیں نقل کیں، کتاب ''السنن'' اسی عظیم ذخیرہ سے منتخب احادیث پر مشتمل ہے جن کی تعداد چار ہزار آٹھ سو ہے نیز اس منتخب مجموعہ میں صحیح، مشابہ صحیح اور صحیح سے قریب حدیثیں ذکر کی ہیں'' (۱)

ظاہر ہے کہ پانچ لاکھ احادیث کا یہ عظیم ذخیرہ تحصیل وتعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں محفوظ نہیں کیا جاسکتا بلکہ بلاد اسلامیہ میں پھیلے شیوخ اور مشرق ومغرب کے مراکز علمیہ سے ایک زمانہ تک اخذ واستفادہ کے بعد ہی اس پر دسترس حاصل ہوسکتی ہے۔ پھر احادیث کے اس بحر ذخار سے مقصد کے مطابق موتیوں کا انتخاب واستخراج، ان کے رجال کی تحقیق اور صحیح و لائق استدلال احادیث کی ضعیف وناقابل استدلال روایتوں سے تمیز، پھر ان سے فقہی احکام ومسائل کا استنباط وغیرہ ایسے امور ہیں جو انتہائی تبحر، طویل بحث ونظر اور ژرف نگاہی کو چاہتے ہیں جن کا تصور ایک ایسے طالب علم سے جو ابھی اخذ وطلب کے ابتدائی مرحلہ میں ہو نہایت بعید ہے ؎

بصرہ کی سکونت

حدیث پاک کی تحصیل کے لیے ۲۲۰ھ میں امام ابوداؤد گھر سے نکلے، مراکز علمیہ اور شیوخ حدیث کی مجالس درس میں حاضری کی غرض سے تقریباً بیس بائیس سال تک بلاد اسلامیہ میں چکر کاٹتے رہے، ان علمی اسفار میں ان کا مرکز ثقل بغداد تھا جہاں گھوم پھر کر پہنچ جاتے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں: "وقدم بغداد غير مرة" بغداد بار بار گئے، اس دوران اگرچہ کبھی کبھی وطن مالوف سجستان کی مراجعت کا بھی اتفاق ہوا، ورنہ لیلائے مطلوب کی طلب وجستجو میں ان کی زندگی کے اکثر ایام دیارِ غربت ہی میں بسر ہوئے۔ طرسوس کے بیس

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص: ۲۰۹-۲۱۰، تہذیب الکمال، ج:۳، ص: ۲۶۴، الرقم ۲۴۷۶، تاریخ بغداد، ج:۹، ص: ۵۷۔

؎ عصر حاضر کے نامور عالم اور مشہور محقق علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ نے بھی "رسالة الإمام ابی داؤد السجستانی إلی أهل مكه فی وصف سننه" کی تحقیق وتعلیق کے مقدمہ میں اس روایت کے داخلی وخارجی وجوہ ضعف پر قریب قریب یہی تنبیہ کی ہے۔ دیکھئے رسالہ مذکور کا مقدمہ، ص: ۱۲-۱۳۔

سالہ قیام اور کتاب ''السنن'' کی تکمیل کے بعد گھوم پھر کر آخری بار وہ پھر بغداد پہنچے، مگر اب امام ابوداؤدؒ اخذ واستفادہ کی منزل سے گزر کر مشیخیت وامامت کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے اور ان کی عظمت ومقبولیت کا آفتاب نصف النہار کی بلندیوں کو چھو رہا تھا، تشنگان علوم حدیث جوق در جوق ان کی خدمت میں آتے اور ان کے چشمۂ فیاض سے خاطر خواہ سیراب ہوتے تھے، ان کی مرجعیت اور ان کے گرد شائقین علوم حدیث کے ازدحام کا یہ عالم تھا کہ خلیفۂ وقت کے بھائی اور صاحب اقتدار ولی عہد ان سے درخواست کرتا ہے کہ آپ مستقل طور پر بصرہ میں سکونت فرمالیں تاکہ آپ کے وجود باجود کی برکت اور آپ کی مجلس درس میں طلبہ کی کثرت سے بصرہ دوبارہ آباد ہو جائے اور اس کی اجڑی ہوئی رونق پھر لوٹ آئے۔ امام خطابی اپنی سند سے لکھتے ہیں:

فقد روى خادمه أبوبكر بن جابر قال : كنت معه ببغداد فصلينا المغرب اذ قرع الباب ففتحته فاذا خادم يقول : هذا الامير أبو أحمد الموفق يستاذن، فدخلت إلى أبى داؤد فاخبرته بمكانه فأذن له، فدخل وقعد ثم أقبل عليه أبوداؤد وقال: ما جاء بالأمير فى مثل هذا الوقت ؟ قال : خلال ثلاث، فقال ماهى؟

قال : تنتقل البصرة فتتخذها وطناً ليرحل إليك طلبة العلم من أقطار الأرض فتعمربك، فإنها قد خربت وانقطع عنها الناس لما جرىٰ عليها من محنة الزنجؑ.

ؑ علی بن عبدالرحیم المعروف بہ صاحب الزنج کا فتنہ ۲۵۲ھ میں رونما ہوا اور ۲۵۵ھ میں اس نے بصرہ پر اپنا ظالمانہ تسلط قائم کر لیا تقریباً ۱۲ ہزار بصریوں کو قتل کیا، بیشمار لوگ جان بچانے کے لیے آبادیوں سے بھاگ کر جنگلوں میں روپوش ہوگئے، جان ومال کے علاوہ عزت وآبرو بھی اس کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی حتیٰ کہ سادات کی عزت مآب خواتین کو لونڈیاں بنا کر برسر عام نیلام کیا، ان مظالم اور تباہ کاریوں کی وجہ سے بصرہ جو اسلامی علوم وثقافت کا ایک اہم مرکز تھا بالکل ویران ہوگیا بصرہ کی عظیم جامع مسجد جو وہاں کی علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی سنسان ہوگئی۔ عراق اور اس کے شہروں کی اس زبوں حالی سے متاثر ہو کر بالآخر خلیفۂ وقت معتمد کا بھائی ابواحمد الموفق اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے خود میدان میں اترا اور شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ زنگی مقابلہ میں ٹھہر نہ سکے اور ۲۷۰ھ میں خود صاحب الزنج یعنی علی بن عبدالرحیم کو قتل کر کے اللہ کی مخلوق کو اس کے ظلم وتشدد سے ہمیشہ کے لیے نجات دیدی اور بصرہ وغیرہ اسلامی شہروں میں پھر سے امن وامان کی فضا بحال کر دی، ''محنۃ الزنج'' کے الفاظ سے اسی فتنہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

فقال هذه واحدة، هات الثانية .

قال: وتروى لأولادى كتاب السنن ، فقال : نعم ، هات الثالثة .

قال و تفرد لهم مجلسا للرواية، فإن أولاد الخلفاء لا يقعدون مع العامة.

فقال : اما هــذه فلا سبيــل إليها لأن الناس شريفهم ووضيعهم فى العلم سواء .

قال ابن جابر فكانوا يحضرون بعد ذلك ويقعدون فى كم حيرى و يضرب بينهم وبين الناس ستر فيسمعون مع العامة. (۱)

امام ابوداؤد کے خادم ابوبکر بن جابر کا بیان ہے کہ میں امام صاحب کے ساتھ بغداد میں تھا نماز مغرب سے فراغت کے بعد دروازہ پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو ایک خادم نے کہا امیر ابواحمد الموفق حاضری کی اجازت چاہتے ہیں، میں نے امام صاحب کو اسکی اطلاع دی، امام صاحب نے انھیں تشریف لانے کی اجازت دی۔ چنانچہ وہ اندر آکر بیٹھے تو امام صاحب ان کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اس وقت امیر نے کیوں تشریف لانے کی زحمت کی؟ تو امیر الموفق نے کہا تین باتوں کے تحت حاضری ہوئی ہے۔ امام صاحب نے فرمایا وہ کیا ہیں؟ (۱) امیر نے کہا آپ بصرہ تشریف لے چلیں اور اسے وطن بنالیں تاکہ اطراف عالم سے طلبہ کوچ کر کے آپ کی خدمت میں آئیں اور بصرہ آپ کے وجود سے آباد ہوجائے کیونکہ وہ زنگیوں کے فساد سے ویران ہوگیا ہے، امام صاحب نے فرمایا یہ پہلی بات ہوئی، دوسری پیش کیجیے۔ (۲) امیر نے کہا میری اولاد کو کتاب السنن پڑھا دیجئے، امام صاحب نے فرمایا ٹھیک ہے، تیسری بات بیان فرمائیں، (۳) امیر الموفق بولے ان کی تعلیم کے لیے الگ مجلس درس کا اہتمام کریں کیونکہ خلفاء کی اولاد عام لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھتی، امام صاحب نے اس تیسری بات پر فرمایا کہ اس کے قبول کیے جانے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے کہ تعلیم کے معاملہ میں شریف و غیر شریف سب برابر ہیں، ابوبکر ابن جابر کا بیان ہے کہ امیر الموفق کے لڑکے پڑھنے کے لیے آتے (اور حریری

(۱) معالم السنن، ج:۱،ص:۱۲،مختصر تاریخ دمشق، ج:۶،ص:۲۴۷، وسیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۱۶

چادر میں بیٹھتے البتہ) ان کے اور عام لوگوں کے درمیان ایک پردہ ڈال دیا جاتا اور سب کے ساتھ ہی حدیث پاک کی سماعت کرتے۔

امیر ابواحمد الموفق کی یہی خواہش بصرہ میں امام ابوداؤد کی مستقل سکونت کا سبب بنی اور وہ ۲۷۱ھ میں بغداد سے منتقل ہوکر بصرہ آ گئے۔ سنن ابوداؤد کے معروف راوی ابن داسہ بصری کے ایک بیان سے (جسے حافظ ابوطاہر السِلَفی نے معالم السنن شرح سنن ابوداؤد کے اپنے مقدمہ میں خود اپنی سند سے روایت کیا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ میں امام ابوداؤد کا قیام قدیمی شہر ''اُبلّہ'' میں تھا۔(۱)

تاریخ وفات اور مقام تدفین

بصرہ کو وطن اور اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا لینے کے بعد انھوں نے کہیں اور کا قصد نہیں کیا اور زندگی کے باقی ماندہ ایام یہیں گزار کر ۱۶؍شوال ۲۷۵ھ بروز جمعہ اس دنیائے بے ثبات سے دار جاودانی کو رحلت کر گئے، ابن المنادی کا بیان ہے "ودخلها (يعني بغداد) أبوداؤد السجستاني مرارا ثم خرج منها آخرمراته في أول سنة إحدى وسبعين إلى البصرة فنزلها ومات بها في سنة ٢٧٥هـ"(۲) امام ابوداؤد سجستانی بارہا بغداد آئے وہاں سے آخری بار ۲۷۱ھ میں نکلے اور بصرہ جا کر مستقل طور پر آباد ہو گئے اور وہیں ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔

وفیات الاعیان میں جمعہ کی اور سیر الاعلام، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب الاسماء واللغات وغیرہ میں تاریخ اور مہینہ کی تصریح موجود ہے۔(۳)

---

(۱) تفصیل وتحقیق کے لیے امام سِلَفی کا مقدمہ معالم السنن مطبوعہ مختصر سنن ابی داؤد للمنذری ومعالم السنن للخطابي وتهذيب لابن القيم، ج:۸،ص: ۱۵۲-۱۵۳ ملاحظہ کیجئے اور "الأُبُلّة" سے متعلق تفصیلات کے لیے ''یاقوت حموی'' کی معجم البلدان، ج:۱،ص:۷۱ دیکھئے۔

(۲) تاریخ بغداد، ج:۹،ص:۵۸-۵۹۔

(۳) وفیات الاعیان، ج:۱،ص:۳۸۳ مطبوعہ بیروت ۱۴۱۷ھ، سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص: ۲۲۱، تذکرۃ الحفاظ، ج:۲،ص:۵۹۳ تہذیب الاسماء واللغات، ج:۲،ص:۲۲۷۔

وفات سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ ”أن یغسله الحسن بن المثنی فإن اتفق، وإلا نظروا فی کتاب سلیمان بن حرب عن حماد بن زید فی الغسل، فعملوا به“(۱) اگر ممکن ہو تو میری میت کو غسل ”حسن بن مثنیٰ“ دیں، ورنہ سلیمان بن حرب کی کتاب میں غسل سے متعلق جو احادیث بروایت حماد بن زید ہیں دیکھ لی جائیں چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔ نماز جنازہ عباس بن الواحد الہاشمی کی امامت میں ادا کی گئی۔(۲) اور امیر المؤمنین فی الحدیث سفیان ثوری کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔(۳)

تلامذہ

امام ابوداؤدؒ مقبولیت و مرجعیت کے جس بلند و بالا مقام پر فائز تھے اور ان کے حلقۂ درس میں طلبۂ علوم کا جس کثرت سے ورود ہوا کرتا تھا اس کا بڑی حد تک اندازہ اوپر مذکور واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ زنگیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد بصرہ کی تعمیر نو اور اس کی گزشتہ علمی رونق کی بازیابی کے لیے حکومت وقت کے اہم ترین رکن نے انھیں بصرہ میں قیام پذیر ہونے کی دعوت دی، لہٰذا بلا تردد کہا جاسکتا ہے کہ امام ابوداؤد کے شاگردوں اور ان سے مستفیدین کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہوگی جنھیں شمار میں لانا مشکل ہے، اس کثیر تعداد میں سے تقریباً سینتالیس کے ناموں کا ذکر امام مزّی نے تہذیب الکمال میں کیا ہے۔(۴) جن میں کچھ ائمہ مشاہیر یہ ہیں:

(۱) تہذیب التہذیب، ج:۴، ص:۱۵۶۔

ـ حسن بن مثنیٰ بن معاذ ابومحمد العنبری المتوفی ۲۹۴ھ اکابر فضلاء محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ ورع و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور زمانہ تھے۔ ابتداء میں حدیث کی روایت سے بچتے تھے بعد میں منامی تنبیہ پر روایت کرنے لگے تھے امام طبرانی کے شیوخ میں تھے۔ سیر اعلام النبلاء ج:۱۳، ص:۵۲۶-۵۲۷= عباس الہاشمی کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔

(۲) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۹ مقدمہ معالم السنن از حافظ سلفی، معالم السنن، ج:۸، ص:۱۵۷، تحقیق احمد محمد شاکر و محمد حامد الفقی دار المعرفۃ بیروت۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج:۱۱، ص:۶۵۔

(۴) تہذیب الکمال، ج:۳۔

امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوعوانہ اسفرائینی، امام ابن ابی الدنیا، امام ابوبشر محمد بن احمد دولابی، امام محمد بن نصر مروزی، امام زکریا ساجی آپ کے خلف الصدق امام ابوبکر عبداللہ سجستانی، عبدالرحمٰن بن خلاد رام ہرمزی، ابوبکر محمد بن یحییٰ صولی وغیرہ، علوم حدیث کی وہ مقتدر اور عظیم المرتبت شخصیات ہیں جن کے نام و کام سے علم حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی ایک حد تک واقفیت رکھتا ہے۔

اور خاص وہ تلامذہ جنھوں نے امام صاحب سے کتاب السنن کی سماعت و روایت کی ان میں معروف یہ ہیں: ابوالحسن علی بن الحسن بن العبد الانصاری، المتوفی ۳۲۸ھ، ابواسامہ محمد بن عبدالملک بن یزید الرواس، ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد المعروف بہ ابن الاعرابی المتوفی ۳۴۰ھ، ابوعلی محمد بن احمد اللؤلؤی المتوفی ۳۳۰ھ، ابوبکر محمد بن بکر بن داسہ التمار المتوفی ۳۴۵ھ، ابوسالم محمد بن سعید الجلودی، ابوعمر واحد بن علی بن حسن البصری، تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی ان ساتوں اصحاب کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "فھؤلاء السبعة رووا عنه سننه" ان ساتوں نے امام ابوداؤد سے ان کی سنن روایت کی ہے۔(۱)

اور سیر اعلام النبلاء میں ابوالطیب احمد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن الاشنانی کے بارے میں راوی السنن ہونے کی تصریح کی ہے نیز ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید الرملی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ امام ابوداؤد کے ورّاق تھے یعنی امام صاحب کی خدمت میں یہی سنن کی قرأت کیا کرتے تھے، اس لیے یہ بھی سنن کے راوی ہوئے اور حافظ ابن حجر نے ان نوؤں اصحاب کا نام شمار کرنے کے بعد لکھا ہے "وھؤلاء رواة السنن عنه" (۲) ان کے علاوہ محمد بن احمد بن یعقوب المتوثی البصری کتاب "الرد علی اہل القدر" کے راوی ہیں اور ابوبکر احمد بن سلیمان النجّاد المتوفی ۳۴۸ھ کتاب الناسخ والمنسوخ کی روایت کرتے ہیں، حافظ ابن کثیر ان کے بارے میں لکھتے ہیں "ھو آخر من رویٰ عنه فی الدنیا" یعنی امام ابوداؤد سے براہ راست روایت کرنے والے یہ دنیا میں آخری راوی تھے۔(۳) نیز ابوعبید

(۱) ج:۲،ص:۲۹۱-۲۹۲۔ (۲) تہذیب التہذیب، ج:۴،ص:۱۵۴۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج:۱۱،ص:۶۵۔

محمد بن علی بن عثمان الآجرّی إجاباته عن سوالات أبی عبید الآجرّی اور تسمیة الإخوة الذین روی عنهم الحدیث کے راوی ہیں۔ اور اسماعیل بن محمد الصفار ''مسند مالک'' کے راوی ہیں۔

امام ابوداؤد کے یہ تیرہ وہ مخصوص تلامذہ ہیں جنھوں نے ان سے کتاب السنن یا ان کی دیگر تصانیف روایت کی ہیں ان کے علاوہ بھی نامور تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے جن کا اس موقع پر ذکر موجب طوالت ہوگا، تفصیل کے طالب تہذیب التہذیب، سیر اعلام النبلاء، تذکرہ الحفاظ اور بطور خاص تہذیب الکمال کی مراجعت کریں۔

ایک عظیم شرف

امام ابوداؤد کے شرف ومجد کے لیے یہی کیا کم ہے کہ ان کے گلستان علم کی خوشہ چیں حفاظ حدیث اور اکابر محدثین کی ایک بڑی جماعت ہے جس میں اصول ستہ کے دو مصنف یعنی امام ابوعیسیٰ؏ الترمذی اور امام@ ابوعبدالرحمٰن النسائی بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ انھیں ایک ایسا عظیم شرف اور اعزاز حاصل ہے جس میں اصحاب ستہ میں سے کوئی اور ان کا شریک وسہیم

؏ امام ترمذی نے اپنی سنن کی کتاب الدعوات کے آخری باب میں ایک حدیث امام ابوداؤد سے بایں سند درج کی ہے: حدثنا ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجزی حدثنا قطن البصری عن انس الخ اسی طرح ''باب ماجاء فی الصائم یذرعہ القیٔ'' میں بواسطہ امام ابوداؤد: امام احمد سے عبداللہ بن زید کی توثیق نقل کی ہے۔

@ امام نسائی نے اپنی سنن (مجتبیٰ) میں متعدد روایتیں حدثنا ابوداؤد کے الفاظ سے بیان کی ہیں اور ظاہر یہی ہے کہ نسائی کے یہ شیخ امام ابوداؤد السجستانی ہی ہیں چنانچہ حافظ مزی لکھتے ہیں ''وروی النسائی فی السنن عن أبی داؤد، عن سلیمان بن حرب، و عبدالله بن محمد النفیلی، و عبدالعزیز بن یحییٰ الحرّانی، وعلی ابن المدینی، وعمرو بن عون الواسطی، ومسلم بن إبراهیم، وأبی الولید الطیالسی، وروی (ای النسائی) فی کتاب ''یوم ولیلة'' عن أبی داؤد عن محمد بن کثیر العبدی والظاهر أن أبا داؤد فی هذا کله هو السجستانی فانه معروف بالروایة عن هٰؤلاء وقد شارکه ابوداؤد سلیمان بن سیف الحرانی فی بعضهم، وروی (ای النسائی) عنه فی کتاب الکنٰی وسماه ولم یکنِه وذکر الحافظ أبوالقاسم فی ''المشایخ النبَل'' أن النسائی أیضا روی عنه'' (تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴، رقم الترجمہ ۲۴۷۶)

حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے بھی امام مزی کی بیان کردہ اس تفصیل کو سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۰۷، اور تہذیب التہذیب، ج:۴، ص:۱۵۴ میں نقل کیا ہے۔

نہیں ہے۔ وہ یہ کہ ائمہ اربعہ کے چوتھے امام، آپ کے استاذ کبیر، امام السنہ احمد بن حنبل بھی آپ سے حدیث پاک کی نقل وسماعت کرنے والوں کی صف میں شامل ہیں۔ خود امام ابوداؤد کو اپنے اس شرف پر ناز تھا اور تحدیث نعمت کے طور سے بیان کیا کرتے تھے۔

چنانچہ حافظ مزی بواسطہ ابوبکر الخلال لکھتے ہیں: ”وسمع أحمد بن حنبل منه حديثًا واحدا كان أبو داؤد يذكره(۱) امام احمد بن حنبل نے ابوداؤد سے ایک حدیث سنی تھی جس کا ذکر امام ابوداؤد (تحدیث نعمت کے طور پر) کیا کرتے تھے، امام خطیب بغدادی نے اس حدیث واحد کو اپنی سند سے بطریق امام ابوداؤد ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:
عن ابى العُشَراء عن أبيه اَن النبى صلى الله عليه وسلم سئل عن العتيرة فحسنها؎“(۲) امام ابوداؤد نے کہا میں نے یہ حدیث امام احمد بن حنبل سے بیان کی تو اسے پسند کیا اور فرمایا کہ یہ ایک غریب ونادر حدیث ہے پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ ذرا بیٹھو اور خود گھر کے اندر سے دوات، قلم اور کاغذ لے کر آئے اور کہا کہ یہ حدیث مجھے لکھا دو (ان کے حکم کے مطابق اس حدیث کا میں نے انھیں املا کرا دیا) پھر ایک دوسرے دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اتفاق سے ابوجعفر ابن ابی سمینہ بھی آگئے تو امام احمد بن حنبل نے ان سے کہا ابوداؤد کے پاس ایک غریب حدیث ہے تم اسے لکھ لو چنانچہ ابو جعفر نے مجھ سے اس حدیث کو املا کرانے کے لیے کہا تو میں نے انھیں بھی لکھوا دی۔

ضروری تنبیہ

یہی اوپر مذکورہ حدیث عتیرہ ہے جس کی روایت امام احمد بن حنبل نے امام ابوداؤد سجستانی سے کی ہے جب کہ علامہ محمود السبکی نے اپنی مشہور ومفید کتاب ”المنہل العذب المورود“ شرح سنن ابی داؤد کے مقدمہ میں اس کا مصداق حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً

(۱) تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴۔
؎ امام ذہبی ابوالعشراء کی اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ”هذا حديث منكر تُكُلِّم فى ابن قيس من اجله“ سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۱۔
(۲) تاریخ بغداد، ج:۹، ص:۵۷-۵۸ وتہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۶۔

مروی حدیث ”لا فرع و لا عتیرۃ الخ“ کو بتایا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث سے متعلق خطیب بغدادی کے کلام سے ان کی نظر چوک گئی ورنہ اس حدیث کا صحیح مصداق سمجھنے میں ان سے یہ غلطی نہ ہوتی۔ چنانچہ محدث کبیر علامہ محمد یوسف بنوری ”بذل المجہود“ کے اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”ھذا ھو حدیث العتیرۃ الذی رواہ عنہ أحمد لاما فھمہ محمود السبکی فی المنھل العذب المورود ، ولعلہ لم یقف علی کلام الخطیب فقال وھو حدیث ”لا فرع و لا عتیرۃ“ ماروٰہ احمد والبخاری ومسلم، فتنبہ“۔

علمی مقام ومرتبہ

امام ابوداؤد ان اکابر محدثین کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے علوم حدیث کی تحصیل میں پوری جانفشانی اور خصوصی توجہ کی اور اس مبارک فن میں درجۂ کمال پر فائز ہوئے۔

یہ ایک مسلم اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ علوم وفنون کے اخذ وتحصیل نیز فہم وادراک میں کسی بھی فن کے علماء ایک درجہ کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں فرق مراتب ہے، اسی طرح علمائے حدیث کے بھی مختلف درجات ہیں، جنھیں عام طور پر تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ علوم حدیث کے تین مرحلے ہیں:

اخذ حدیث کے تین مرحلے

۱- حفظ وجمع اور روایت کا مرحلہ ہے، بہت سے محدثین اسی درجہ پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں اس سے آگے بڑھنے کی ان میں طلب وہمت نہیں ہوتی یا اس کے مواقع حاصل نہیں ہوتے ہیں پھر ان میں بھی روایات کی قلت وکثرت کے لحاظ سے متعدد درجات ہوتے ہیں۔

۲- جمع وحفظ کے ساتھ صحیح وضعیف، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور غیر ثابت روایات کی معرفت اور ان میں فرق وامتیاز کی صلاحیت پیدا کرنا اس درجہ پر پہنچنے کے لیے بہت سارے علوم سے واقفیت درکار ہوتی ہے بالخصوص جرح وتعدیل، اتصال و

انقطاع وغیرہ سے متعلق اصول واحکام کی وافر معلومات ضروری ہوتی ہے اس لیے پہلے درجہ کے بالمقابل اس درجہ کے حاملین کی تعداد کم ہے۔ اس درجہ پر فائز محدثین، صحیح و ضعیف قابل حجت اور نا قابل حجت روایات کی شناخت کر لیتے ہیں مگر ان سے صحیح طور پر شرعی احکام ومسائل کا استخراج ان کے بس میں نہیں ہوتا۔

۳- اس مرحلہ میں ایک محدث پہلے اور دوسرے درجے سے گزر کر احادیث رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے احکام ومسائل کے استنباط واستخراج کی قوت وصلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تاکہ ان احکام پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کے لیے عمل کی راہ ہموار اور آسان کر دے اس درجہ کی تحصیل میں علم وعمل اور تجربات کے وسیع تر میدان سے گزرنا پڑتا ہے اور اسے عبور کرنے کے لیے قدم قدم پر ژرف نگاہی اور روشن ضمیری کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے اس درجہ پر فائز دوسرے درجہ کے حاملین سے بھی کم ہوتے ہیں۔

وہ محدثین عظام جو ان تینوں درجات کے حامل ہیں درحقیقت یہی وہ فقہائے محدثین اور ائمۂ دین ہیں جنھوں نے خدائے حکیم وقدیر کی حکمت بالغہ وتدبیر نافذہ کے تحت اللہ رب العزت کے پسندیدہ دین کی حفاظت وصیانت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور انھیں کی مساعی جمیلہ کا یہ ثمرہ ہے کہ اسلام اپنی اصل اور کامل شکل میں آج بھی انسانیت کی صحیح رہنمائی کر رہا ہے۔

اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی محدثین عظام کے اسی آخری طبقہ کے ایک فرد کامل ہیں۔ وہ حافظ حدیث بھی ہیں، ناقد حدیث بھی اور فقہ حدیث کے زبردست عالم بھی ہیں جس پر ان کی کتاب ''السنن'' شاہد عدل اور روشن دلیل ہے۔

اگر امام یحییٰ بن معین نے اپنے دست خاص سے دس لاکھ حدیثیں لکھیں، امام احمد ابن حنبل نے سات لاکھ سے زائد احادیث سے انتخاب کر کے اپنی مسند تیار کی، امام ابوزرعہ رازی کو چھ لاکھ احادیث محفوظ تھیں[۵]، امام بخاری نے اپنی ''الجامع الصحیح'' کی

[۵] امام احمد اور حافظ ابوبکر محمد بن عمر الرازی سے منقول ہے کہ امام ابوزرعہ کو سات لاکھ احادیث یاد تھیں۔

احادیث کی تخریج چھ لاکھ حدیثوں سے کی ہے، اور امام مسلم نے اپنی صحیح کی تخریج تین لاکھ حدیثوں سے کی ہے، تو امام ابوداؤد نے بھی پانچ لاکھ حدیثوں سے انتخاب کر کے اپنی سنن کی تالیف کی ہے امام ابوداؤد کے تلمیذ رشید اور کتاب السنن کے راوی ابوبکر ابن داسہ کا بیان ہے: ”سمعت أبا داؤد يقول كتبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس مأةِ ألف حديث انتخبت منها ما ضمنته هذا الكتاب. يعنى السنن جمعت فيه أربعة آلاف وثمان مأة حديث وذكرت الصحيح وما يشبهه ويقاربه“(۱)

میں نے امام ابوداؤد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں اور انہی پانچ لاکھوں سے ان احادیث کا انتخاب کیا ہے جو کتاب السنن میں ہیں۔ میں نے اس میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں جمع کی ہیں اور اس میں صحیح، مشابہ صحیح اور قریب صحیح احادیث ذکر کی ہیں۔

تاریخ رجال میں مہارت

دیگر فقہائے محدثین کی طرح امام ابوداؤد کو بھی صحیح وضعیف احادیث کی معرفت اور ان میں فرق وامتیاز کی شدید ضرورت تھی تاکہ وہ لائق احتجاج روایتوں سے مسائل فقہ کا استنباط واستخراج کرسکیں جو ان کی کتاب السنن کا موضوع اور مقصود اصلی ہے چنانچہ وہ اپنے ”رسالہ“ میں جو اہل مکہ کو تحریر کیا تھا سنن میں موجود احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وليس فى كتاب السنن الذى صنفته عن رجل متروك الحديث شيء، وإذا كان فيه حديث منكر بينت انه منكر وليس على نحوه فى الباب غيره“(۲)

میری تصنیف کردہ کتاب السنن میں کوئی روایت متروک الحدیث سے مروی

(۱) تاریخ بغداد، ج:۹،ص: ۵۷ وتہذیب تاریخ دمشق الکبیر، ج:٦،ص: ۲۴۷ وتہذیب الکمال، ج:۳،ص:۲٦۴ رقم الترجمہ ۲۴۷٦۔

(۲) رسالة الامام ابى داؤد السجستانى الى اهل مكة فى وصف سننه، ص:۳۳، مطبوعہ ۱۴۱٦ھ بہ تحقیق الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ۔

نہیں ہے اور جب اس میں کوئی منکر حدیث ہوتی ہے تو میں اس کی نکارت کو واضح کر دیتا ہوں، (اس نوع کی روایت اسی صورت میں لائی گئی ہے کہ) اس باب میں اس کے علاوہ کوئی اور حدیث نہیں تھی۔

چند سطروں کے بعد مزید لکھتے ہیں:

وما كان فی كتابی من حديث فيه وَهن شديد فقد بيّنته ومنه ما لا يصح سنده، ومالم اذكر فيه شيئاً فهو صالح وبعضها اصح من بعض الخ"(۱)

میری اس کتاب کی کسی حدیث میں اگر ضعف شدید اور زیادہ کمزوری ہے تو میں نے اسے بیان کر دیا ہے اور اس میں بعض وہ روایتیں ہیں جن کی سند صحیح نہیں ہے (بلکہ درجۂ حسن کی ہے یا اس میں لائق برداشت ضعف ہے) اور وہ احادیث جن پر میں نے کوئی کلام نہیں کیا ہے صالح ہیں اور ان میں بعض احادیث بعض کے مقابلے میں راجح ہیں۔

کتاب السنن کی احادیث کا یہ انتخاب وانتقاء، ان کے مراتب کی تحدید وتعیین، منکر، معلول اور ضعیف ترین روایتوں کی نشاندہی وغیرہ ایسے امور ہیں جو بتا رہے ہیں کہ امام ابوداؤد صرف حافظ حدیث اور اس کے راوی ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ناقد حدیث بھی تھے اور راویانِ حدیث کے حسب حال ان کے درجات مقرر کرنے پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ سب تاریخ رجال اور فن جرح وتعدیل پر مکمل عبور کے بغیر ممکن نہیں۔

علاوہ ازیں ''سوالات ابوعبید الآجری'' (جو علم جرح وتعدیل کا ضخیم ومعتمد مجموعہ ہے) جس کے جمع وترتیب کی سعادت اگرچہ حافظ ابوعبید محمد بن علی بن عثمان الآجری کے حصہ میں آئی مگر اصالتاً یہ امام ابوداؤد ہی کی کتاب مانی جاتی ہے کیونکہ اس میں مندرج تمام معلومات انھیں کے خزانۂ علمی سے ماخوذ ومستفاد ہیں۔

امام ابوداؤد کے افادات ومعلومات کے اس مجموعہ کی اہمیت اور فن جرح وتعدیل میں ان کے مقبول ومعتمد ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ہر دور کے علمائے

(۱) رسالۃ الامام ابی داؤد، ص: ۳۷۔

رجال واکابر محدثین، مثلاً حافظ عسکری متوفی ۳۸۲ھ، امام خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ، حافظ ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ، حافظ جمال الدین المزی متوفی ۷۴۲ھ، حافظ شمس الدین الذہبی متوفی ۷۴۸ھ، حافظ ابن حجر ۸۵۲ھ، حافظ محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی متوفی ۹۰۲ھ وغیرہ اپنی تصانیف میں اس کے اقتباسات کثرت سے نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فن اسماء الرجال میں امام ابوداؤد کی عبقریت وامامت ہر دور کے محدثین بالخصوص علمائے جرح وتعدیل کے نزدیک مسلم رہی ہے۔ اوراس فن میں ان کا شمار کبار ائمہ حدیث کے طبقہ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ امام ابن حبان البستی ائمہ جرح وتعدیل کے طبقات کا تذکرہ کرتے ہوئے امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی ابن المدینی وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ثم اخذ عن هؤلاء مسلك الانتقاد في الاخبار وانتقاد الرجال في الآثار جماعة منهم محمد بن يحيىٰ الذهلى النيسابورى، وعبدالله بن عبدالرحمن الدارمى، وابوزرعة عبيد الله بن عبدالكريم بن يزيد الرازى، ومحمد بن اسماعيل الجعفى البخارى، ومسلم بن الحجاج النيسابورى، وابوداؤد بن الاشعث السجستانى فى جماعة من اقرانهم الخ(۱)

پھر اُن ائمہ سے حدیث اور رجال حدیث پر نقد کا طریقہ ایک جماعت نے سیکھا ان میں امام ذہلی، امام دارمی، امام ابوزرعہ رازی، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد سجستانی اور ان کے ہم طبقہ محدثین عظام ہیں۔

اسی طرح امام ذہبی نے بھی اپنے رسالہ ”ذكر من يعتمد قوله فى الجرح والتعديل“ میں انھیں امام بخاری، امام ذہلی، امام ابوزرعہ رازی، امام ابوحاتم رازی، ابن وارہ، الجوزجانی، امام مسلم، امام الحربی، ابن ابی خیثمہ وغیرہ اساطین فن رجال کے ساتھ پانچویں طبقہ میں شمار کیا ہے۔(۲)

(۱) المجروحین، ج:۱، ص:۵۷-۵۸۔

(۲) اربع رسائل فی علوم الحدیث تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ص:۱۹۲-۱۹۳۔

فقہ میں تبحر

گزشتہ سطور میں یہ بات گزر چکی ہے کہ امام ابوداؤد کا شمار علماء حدیث کے اس طبقہ میں ہے جنھیں فقہائے محدثین سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس طبقہ کے محدثین عظام علم حدیث میں کامل مہارت اور رسوخ تامہ کے ساتھ فقہ حدیث میں بھی تبحر کے درجہ پر فائز تھے۔ چنانچہ محقق جلیل علامہ محمد زاہد الکوثری متوفی ۱۳۷۱ھ حافظ ابوبکر الحازمی متوفی ۵۸۴ھ کے انتہائی وقیع اور کثیر الفوائد رسالہ ''شروط الائمۃ'' کی تعلیق میں لکھتے ہیں:

وأبوداؤد تفقّه على فقهاء العراق وعظم مقداره فى الفقه وهما (اعنى البخارى وأباداؤد) أفقه الجماعة''(۱)

امام ابوداؤد نے فقہاء عراق سے فقہ حاصل کی تھی اور اس فن میں بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے، اور یہ دونوں بزرگوار یعنی امام بخاری اور امام ابوداؤد تفقہ میں اصحاب ستہ (یعنی امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ) میں سب پر فائق تھے۔

امام ذہبی نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

قلت : كان أبوداؤد مع إمامته فى الحديث وفنونه من كبار الفقهاء فكتابه يدل على ذلك وهو من نجباء اصحاب الإمام احمد لازم مجلسه مدةً وسأله عن دقائق المسائل فى الفروع والاصول''(۲)

میں کہتا ہوں (یعنی حافظ ذہبی) کہ امام ابوداؤد حدیث اور فنون حدیث میں امامت کے ساتھ اکابر فقہاء میں تھے جس پر ان کی کتاب السنن شاہد عدل ہے وہ امام احمد ابن حنبل کے برگزیدہ اور منتخب شاگردوں میں تھے ایک

(۱) ثلاث رسائل فی علم مصطلح الحدیث، ص:۱۷۱، مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ، بیروت ۱۴۱۷ھ

(۲) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۵۔

زمانہ تک ان کی مجلس درس میں بیٹھے اور ان سے اصول وفروع سے متعلق دقیق مسائل دریافت کیے۔(ان مسائل کا مجموعہ مسائل امام احمد بروایت امام ابوداؤد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔)

امام ذہبی کی یہ تصریح کہ امام ابوداؤد فقہائے کبار میں تھے بتارہی ہے کہ وہ فقہ کا اعلیٰ ترین ذوق رکھتے تھے کیونکہ اس ذوق فراواں کے بغیر فقہاء کبار کے درجہ تک نہیں پہنچا جاسکتا ہے۔ امام ابوداؤد کے اسی فقہی ذوق کی کارفرمائی ہے کہ انھوں نے اپنے پیش رو محدثین (امام بخاری ومسلم وغیرہ) کے طریق عمل کی بجائے اپنی کتاب میں صرف احادیث احکام کی تخریج کی اور اس میں فقہی احادیث کا ایسا عظیم القدر ذخیرہ جمع کردیا کہ کتب سنن میں اسے ''ام الاحکام'' کی نہایت وقیع وبالاتر حیثیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ شیخ الاسلام، حافظ العصر ابن حجر العسقلانی ''تلخیص الحبیر'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ''کیف یقال ذلك فی حدیث فی سنن ابی داؤد التی هی ام الاحکام'' (۱)

امام ابی داؤد کے فقہ میں اسی غیر معمولی تبحر اور مرتبہ بلند کی بنا پر شیخ ابواسحاق شیرازی نے انھیں طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے جب کہ اصحاب ستہ میں سے کسی اور بزرگ کو یہ مقام حاصل نہیں ہوسکا۔

مسلک ومذہب

ائمہ حدیث بالخصوص اصحاب ستہ یعنی امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے خود اپنے فقہی مسلک ومذہب کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی ہے۔ بعد کے علماء نے اپنے تتبع اور بحث ونظر کے تحت انھیں مجتہد یا ائمہ اربعہ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ میں سے کسی کا متبع اور مقلد کہا ہے۔ پھر بحث وتحقیق اور فکر ونظر میں اختلاف کا ہونا بالکل ظاہر ہے اس لیے اس سے ماخوذ نتائج کا باہم مختلف ہونا ناگزیر ہے چنانچہ یہی اختلاف امام ابوداؤد کے مسلک کی تعیین میں

(۱) ج:۲،ص:۵۰۶،رقم الحدیث ۵۳۳ ناشر مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز ۱۴۱۷ھ۔

بھی نمایاں طور پر نظر آرہا ہے۔

عصر حاضر کے بلند پایہ ناقد و محقق مولانا عبدالرشید نعمانی نے ''سنن ابن ماجہ'' کے اپنے مقدمہ میں اصول ستہ کے مصنّفین کے مسلک پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے، اس مفصل و مبسوط بحث میں امام ابوداؤد کے مسلک سے متعلق جو اقوال ہیں وہ محقق نعمانی ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں:

(١) فقال الإمام العلامة، الحافظ محمد أنور الكشميرى فى فيض البارى (ج١ ص ٥٨ طبع مصر): "والنسائى و أبوداؤد حنبليان صرح به الحافظ ابن تيمية"، وقال رحمه اللّه في "عرف الشذى": "وأما ابوداؤد والنسائي فالمشهور أنهما شافعيان ولكن الحق أنهما حنبليان. وقد شحنت كتب الحنابلة بروايات ابى داؤد عن احمد والله اعلم" اهـ.

(٢) واما السيد صديق حسن خان ذكر فى كتابه "أبجد العلوم" (ص ٨١٠ طبع الهند) البخارى، و أباداؤد، والنسائى فى الشوافع اهـ

(٣) وقال الشاه ولى اللّٰه المحدث دهلوى فى "الانصاف فى بيان سبب الاختلاف" (ص٧٩-٨٠ طبع دهلى بالهند): "وإمام أبوداؤد والترمذى فهما مجتهدان منتسبان الى احمد واسحق" اهـ

(٤) وقال العلامة ابن القيم فى "إعلام الموقعين" فى الوجه الرابع والاربعين من وجوه رد التقليد (ج ١ ص ٢٣٦ طبع الهند) : "البخارى، ومسلم، وأبوداؤد والأثرم وهذه الطبقة من اصحاب احمد أتبع له من المقلدين المحض المنتسبين اليه" اهـ

(٥) وكذلك ذكر هؤلاء الثلاثة ابن ابى يعلى فى طبقات الحنابلة، واما تاج الدين السبكى فلم يذكر فى طبقات الشافعية الا البخارى وأبا داؤد والنسائى، وأما الحنفية والمالكية فلم يذكروا أحدا منهم فى طبقاتهم.(١)

(١) ماتمس اليہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص:۲۵-۲۶ طبع دیوبند مع سنن ابن ماجہ۔

''امام، علامہ، حافظ محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی املائی کتاب فیض الباری میں کہا کہ امام نسائی اور امام ابوداؤد حنبلی المسلک ہیں، حافظ ابن تیمیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

محدث کشمیری اپنی دوسری املائی تصنیف العرف الشذی میں کہتے ہیں: امام ابوداؤد اور امام نسائی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دونوں بزرگوار شافعی المذہب ہیں لیکن سچی و صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں حنبلی ہیں۔ حنبلیوں کی کتابیں، امام احمد بن حنبل کے اقوال سے جو امام ابوداؤد کی روایت سے ہیں بھری ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم

اور مولانا سید صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی نے ''ابجد العلوم'' میں امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو شوافع میں ذکر کیا ہے۔

مسند ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' میں لکھا ہے کہ امام ابوداؤد اور امام ترمذی دونوں مجتہد ہیں اور علی الترتیب امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ سے منتسب ہیں۔

علامہ ابن القیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام الاثرم اور امام احمد بن حنبل کے تلامذہ کا یہ طبقہ ان کی اتباع زیادہ کرتا ہے بہ نسبت ان خالص مقلدین کے جو ان کی جانب منسوب ہیں۔

اسی طرح ان تینوں ائمہ یعنی امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد کو ابن ابی یعلی نے حنابلہ کے طبقات میں ذکر کیا، جبکہ علامہ تاج الدین سبکی نے امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو طبقات شافعیہ میں شمار کیا ہے البتہ احناف اور مالکیہ ان میں سے کسی کو اپنے طبقات میں ذکر نہیں کرتے۔

ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ محدث کشمیری، حافظ ابن القیم اور ابن ابی یعلی یہ تینوں حضرات امام ابوداؤد کو حنبلی المسلک کہتے ہیں، جب کہ مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی اور علامہ تاج الدین سبکی نے انھیں شوافع میں شمار کیا ہے، یہی رائے برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کی بھی ہے۔ چنانچہ لامع الدراری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''فإن أبا داؤد عندی حنبلی قطعا، متشدد فی مسلك الحنابلة

كالطحاوى فى الحنفية"(۱)

''امام ابوداؤد میرے نزدیک قطعی طور پر حنبلی ہیں حنابلہ کے مسلک میں متشدد ہیں جیسے امام طحاوی مسلک حنفیہ میں متشدد ہیں'' جب کہ علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی اور امام تاج الدین سبکی امام ابوداؤد کو شوافع میں شمار کرتے ہیں اور مسند ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی نظر میں امام ابوداؤد مجتہد منتسب ہیں۔

ان مختلف اقوال کو نقل کرنے کے بعد محقق نعمانی نے ان پر درج ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"فانظر الى هذا التجاذب الذى وقع بين هؤلاء الأعلام فتارة يعدون أحدهم شافعيا وتارة حنبليا وأخرى مجتهدا وهذا كله عندى تخرص وتكلم من غير برهان، فلو كان أحد من هؤلاء شافعيا او حنبليا لأطبق العلماء على نقله ولما اختلفوا هذا الاختلاف، كما أطبقوا على كون الطحاوى حنفياً والبيهقى شافعياً وعياض مالكياً وابن الجوزى حنبلياً، سوى الإمام أبى داؤد فإنه تفقه على الإمام أحمد ومسائله عن احمد بن حنبل معروف مطبوع وذكره الشيرازى فى طبقات الفقهاء من اصحابه"

ان علماء کبار کے مابین پیش آمدہ کشمکش کو دیکھو، کبھی تو ان مذکورہ ائمہ حدیث میں سے کسی کو شافعی بتاتے ہیں اور کبھی حنبلی اور کبھی مجتہد کہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب اٹکل اور بے دلیل باتیں ہیں۔ اصول ستہ (یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ) کے مصنّفین میں اگر کوئی شافعی یا حنبلی ہوتا تو اس اختلاف شدید کی بجائے سارے لوگ اس کے نقل پر متفق ہوتے جس طرح امام طحاوی کے حنفی، امام بیہقی کے شافعی، قاضی عیاض کے مالکی اور امام ابن الجوزی کے حنبلی ہونے کے قول پر سب کا اتفاق واجماع ہے۔ ہاں امام ابوداؤد کے حنبلی ہونے کی

(۱) ص:۱۵، طبع سہارن پور ۱۳۸۹ھ۔

بات اس سے الگ ہے کیونکہ انھوں نے امام احمد سے فقہ کی تحصیل کی ہے اوراس باب میں امام احمد سے ان کے سوالات معروف ہیں اور کتابی شکل میں طبع ہو چکے ہیں، نیز ابواسحاق شیرازی نے انھیں طبقات الفقہاء میں امام احمد بن حنبل کے اصحاب وتلامذہ میں ذکر کیا ہے۔

اس تبصرہ کے بعد لکھتے ہیں:

ولعل الصواب فی هذا الباب مانقله الشیخ طاهر الجزائری في "توجيه النظر إلى أصول الاثر" عن بعض الفضلاء ونصه :

وقد سئل بعض البارعين فی علم الأثر عن مذاهب المحدثين مرادا بذلك المعنى المشهور عند الجمهور، فاجاب عما سئل عنه بجواب يُوَضِّح الحال وإن كان فيه نوع إجمال، وقد أحببنا ايراده مع اختصار.

قال : "اما البخارى و أبوداؤد فإمامان فى الفقه وكانا من أهل الاجتهاد"@(۱)

@ جواب کا بقیہ حصہ یہ ہے۔ وأما مسلم ، والترمذی، والنسائی وابن ماجه و ابن خزيمة، وابو يعلىٰ ، والبزار و نحوهم فهم على مذهب أهل الحديث ليسوا مقلدين لواحد بعينه من العلماء ولاهم من الأئمة المجتهدين على الإطلاق بل يميلون الى قول أئمة الحديث كالشافعی واحمد، واسحاق وابی عبید وأمثالهم وهم إلى مذاهب أهل الحجاز اميلُ منهم الى مذاهب اهل العراق، وأما أبوداؤد الطيالسی فأقدمُ من هؤلاء كلهم من طبقة يحيىٰ بن سعيد القطان، ويزيد بن هارون الواسطی، وعبدالرحمن بن مهدی، وأمثال هؤلاء من طبقة شيوخ الإمام أحمد، وهؤلاء كلهم لا يألون جُهدًا فی اتباع السنة، غير أن منهم من يميل إلى مذهب العراقيين كوكيع ويحيىٰ بن سعيد ، ومنهم من يميل إلى مذهب المدنيين كعبد الرحمن بن مهدی.

وأما الدار قطنی فإنه كان يميل إلى مذهب الشافعی إلا أنه له اجتهاد وكان من أئمة السنة والحديث ولم يكن حاله كحال احدٍ من كبار المحدثين ممن جاء على اثره فالتزم التقليد فی عامة الاقوال إلا فی قليل منها مما يُعَدُّ ويُحصر، فإن الدارقطني اقوىٰ فی الاجتهاد منه وكان افقه واعلم منه (ج۱ص ۳۸ ۴ طبع بیروت ۱۴۱۶ھ بہ تحقیق الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ)

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ ص: ۲۶-۲۷ طبع دیوبند۔

شاید کہ اس باب میں وہ بات درست ہو جسے الشیخ طاہر الجزائری نے ''توجیہ النظر الی اصول الاثر'' میں بعض فضلاء سے نقل کی ہے شیخ جزائری کے الفاظ یہ ہیں:

اصول حدیث میں بعض٭ ماہرین سے محدثین کے مذاہب فقہیہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ صورت حال کو خوب واضح کرتا ہے، اگر چہ اس میں قدرے اجمال ہے۔ مجھے یہ بات پسند آئی کہ اس جواب کو کچھ اختصار کے ساتھ پیش کر دوں۔ انھوں نے کہا کہ ''امام بخاری اور امام ابوداؤد فقہ میں امام ہیں اور دونوں بزرگوار اہل اجتہاد میں سے ہیں''

علامہ طاہر الجزائری کا اس جواب کے متعلق "یوضّح الحال" (جس نے واقعی صورت حال سے پردہ اٹھادیا) کا توصیفی جملہ نیز مسئلۂ زیر بحث میں بطور خاص اسے نقل کرنا بتا رہا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی یہ تحقیق ان کے نزدیک اہمیت رکھتی ہے، واللہ اعلم۔

لیکن محقق نعمانی اس تحقیق کے اُس جزء سے جو امام بخاری اور امام ابوداؤد کے بارے میں ہے متفق نہیں ہیں چنانچہ توجیہ النظر سے مکمل جواب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"وعندی أن البخاری وأبا داؤد ایضاً کبقیة المذکورین لیسا مقلدین لواحد بعینه ولا من أئمة المجتهدین علی الإطلاق بل یمیلان إلی أقوال أئمتهم، ولو کانا مجتهدین لنقل أقوالهما مع سائر الائمة من أهل الإجتهاد والفقه، ولکن نری أن سائر الکتب التی دُوِّن فیها أقوال المجتهدین خالیة عن ذکر مذاهبهما... وإن کان لا ینکر أن أبا داؤد أفقه الستة ولذا ذکره الشیرازی فی طبقات الفقهاء دون غیره"اهـ(۱)

میرے نزدیک امام بخاری اور امام ابوداؤد بھی بقیہ مذکورین یعنی امام مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابویعلی، بزار وغیرہ کی طرح کسی متعین

٭ محقق عبدالفتاح ابوغدہ نے بعض البارعین کی تعیین امام ابن تیمیہ سے کی ہے۔ چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں هو الشیخ الامام ابن تیمیه کما فی مجموع الفتاوی ج:۲۰،ص:۳۹-۴۰

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ ص:۲۶-۲۷ طبع دیوبند۔

امام کے مقلد نہیں ہیں اور نہ ہی مجتہد مطلق ہیں بلکہ اپنے اپنے ائمہ کے اقوال کی جانب میلان رکھتے ہیں، اگر یہ دونوں حضرات مجتہد ہوتے تو دیگر فقہائے مجتہدین کے ساتھ انکے اقوال بھی نقل کیے جاتے؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ساری کتابیں جن میں ائمہ مجتہدین کے اقوال جمع کیے گئے ہیں ان دونوں بزرگوں کے اقوال سے خالی ہیں۔ اگر چہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ائمۂ ستہ میں فقاہت میں بڑھے ہوئے ہیں اسی بناء پر شیرازی نے ان کے علاوہ کسی کا ذکر ''طبقات الفقہاء'' میں نہیں کیا ہے۔

امام ابوداؤد کے مسلک کے سلسلے میں بظاہر اقرب الی الصواب یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بھی دیگر فقہائے محدثین کی طرح عام مسائل واحکام میں حدیث ہی پر عمل کرتے ہیں اور اس عمل بالحدیث میں وہ بسا اوقات اپنے اہم ترین وعزیز ترین استاذ احمد بن حنبل کی (جن سے وہ بیحد متاثر ہیں اور جن کی سیرت وعادت اور وضع زندگی کو اپنے لیے نمونہ سمجھتے تھے) مخالفت کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتے البتہ جن احکام میں ان کے سامنے حدیث نہیں ہوتی ان میں وہ امام احمد کے اقوال کو اختیار کرتے ہیں، اس اعتبار سے انھیں حنبلی المسلک بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

زہد وتقویٰ

امام ابوداؤد کے تذکرہ نویس ان کے علمی فضل وکمال کے ساتھ ان کی دنیا سے بے نیازی، ورع و پرہیز گاری اور خشیت الٰہی کا ذکر بھی خصوصیت سے کرتے ہیں اوپر یہ بات گزرچکی ہے کہ امام سجستانی اپنے شیخ اجل امام احمد بن حنبل سے غایت درجہ متاثر تھے حتیٰ کہ عادت وسیرت، اطوار وکردار اور طرز حیات میں انہی کی موافقت ومماثلت اختیار کرتے تھے۔ امام احمد کی حیات طیبہ کے ساتھ اس موافقت سے ان کی طہارت نفس اور پاکیزگیٔ باطن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ سب حدیث پاک کے ساتھ مخلصانہ اشتغال کی اولین برکت ہے جس سے عام طور پر ائمہ حدیث وفقہ ہم کنار ہوتے ہیں، چنانچہ امام سجستانی

کی بے نفسی اور غیر ضروری چیزوں سے احتراز کا عالم یہ تھا کہ ایک آستین وسیع اور دوسری تنگ بنواتے تھے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا: وسیع آستین تو کتاب رکھنے کے لیے ہے اور دوسری کو وسیع بنانے کی کوئی حاجت نہیں۔(۱)

حکمت ومعرفت

بندۂ مؤمن جب سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق زہد وورع اور صلاح وتقویٰ کو اپنی زندگی کا شعار بنالیتا ہے تو بارگاہ رب العزت سے بطور انعام واکرام اس کے دل پر علم وحکمت کا فیضان ہوتا ہے۔ امام ابوداؤد بھی انہیں خوش بخت بندگان خدا میں شامل ہیں جو حکمت ومعرفت کی دولتِ لازوال سے بہرہ ور تھے، حدیث پاک اور اس سے متعلق علوم وفنون کی تعلیم وتحصیل اور پھر ان کی تبلیغ واشاعت میں غیر معمولی انہماک کی بناء پر اگرچہ انہیں اس علم وہبی کے اظہار وبیان کا موقع نہیں مل سکا پھر بھی خزانۂ دل میں محفوظ علم وحکمت کے کچھ جواہر پارے ان کی زبان پر آکر عالم آشکارا ہو ہی گئے جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱- كان يقول: "الشهوة الخفية حب الرياسة"(۲) **چھپی شہوت ریاست اور بڑائی کی خواہش ہے۔**

۲- قال : "من اقتصر على لباس دون و مطعم دون فقد اراح جسده"(۳) فرمایا جس نے معمولی اور کم تر لباس اور طعام پر اکتفاء کیا اس نے اپنے بدن کو راحت وآرام پہنچایا۔

۳- ان کے بیٹے ابوبکر عبداللہ السجستانی ناقل ہیں کہ میں نے والد ماجد سے فرماتے ہوئے سنا کہ "خير الكلام ما دخل الأذن بغير إذن" (۴) بہترین بات وہ

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۸۔

(۲،۳) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۸۔

(۴) سیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۷۔

ہے جو بغیر اجازت کے کان میں داخل ہوجائے۔ (یعنی اسکے سننے کے لیے متکلم کی یا شریعت کی اجازت درکار نہ ہو)

۴- ایک مرتبہ کسی شیخ کی مجلس میں بیٹھے لکھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کی دوات کے قریب آ کر کہنے لگا کہ میں اس دوات سے روشنائی لینا چاہتا ہوں تو اس کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا: "أما علمت أن من شرع فی مال أخيه بالاستيذان فقد أوجب بالحشمة الحرمان"(۱) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کے مال کو استعمال کرنے کی اجازت لینا شروع کر دیتا ہے وہ وقار اور پسندیدہ سیرت وخصلت سے محرومی کو لازم کر لیتا ہے۔

۵- آپ کے مشہور تلمیذ اور طویل مجلس نشیں حافظ ابوعبید الآجری کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوداؤد سے دریافت کیا: "سمعت من یوسف الصفّار ؟ قال : لا، قلت سمعت من ابن الاصفھانی ؟ قال : لا، قلت سمعت من عمرو بن حماد بن طلحة ؟ قال : لا، ولا سمعت من مُخَوَّل بن ابراهيم، ثم قال هؤلاء کانوا بعد العشرين والحديث رزق ولم اسمع منهم" (۲) کیا آپ نے یوسف الصفار سے حدیث کی سماعت کی ہے؟ فرمایا نہیں، میں نے مزید دریافت کیا کہ کیا جناب نے ابن الاصفہانی سے حدیث سنی ہے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ نے عمرو بن حماد بن طلحہ سے سنا ہے؟ فرمایا نہیں، اور میں نے مخوّل بن ابراہیم سے بھی نہیں سنا ہے پھر ارشاد فرمایا: یہ سب شیوخ حدیث ۲۲۰ھ کے بعد کے ہیں (جو میرا عہد طالب علمی ہے) حدیث پاک اللہ کا رزق ہے (ان بزرگوں کا زمانہ پانے کے باوجود) میں ان سے حدیث نہ سن سکا، مطلب یہ ہے کہ جس طرح روزی اسی کو ملتی ہے جسے مالک کائنات عطا فرمائے انسان کے علم وہنر کا اس میں کوئی دخل نہیں، اسی طرح سماعت حدیث بھی اسی سے سننا نصیب ہوگی جس سے سننے کی توفیق الٰہی میسر آجائے۔

(۱) وفیات الاعیان، ج:۱، ص:۳۸۳۔

(۲) سوالات الآجری، ج:۲، ص:۲۹۵۔

علمی نوادرات

(۱) آپ کے نامور شاگرد اور کتاب السنن کے راوی ابوبکر ابن داسہ کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوداؤد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ...... کی پانچ لاکھ حدیثوں کو تحریراً ضبط کیا ہے کتاب السنن کی چار ہزار آٹھ سو احادیث انھیں کا انتخاب ہیں جس میں صحیح، مشابہ صحیح اور مقارب صحیح روایتیں ہیں اور ایک انسان کے دین کی استواری کے واسطے ان میں سے چار حدیثیں کافی ہیں: (۱) إنما الأعمال بالنيات۔ اعمال کا اعتبار نیتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ (۲) من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه. مرد مسلم کے اسلام کی خوبی سے ہے اس کا بیکار چیزوں کا ترک کردینا۔ (۳) لايكون المؤمن مؤمنا حتى يرضى لأخيه مايرضاه لنفسه. ایک مؤمن اس وقت تک کامل مؤمن نہیں جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (۴) الحلال بيّن، والحرام بيّن، وبين ذلك امور مشتبهات، الحديثؔ.(۱) حلال ظاہر ہے، حرام ظاہر ہے اور حلال و حرام کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں۔

امام ابوداؤد کے اس وقیع علمی قول کی توجیہ کرتے ہوئے زبدۃ المحدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

> ''راقم الحروف می گوید معنی کفایت آنست کہ بعد از معرفت قواعد کلیہ شریعت ومشہورات آں، در جزئیات و وقائع حاجت بہ مجتہدے و مرشدے باقی نمی ماند زیرا کہ در تصحیح عبادات حدیث اول کفایت می کند، و در محافظات اوقات

ؔ حدیث پاک کے باقی الفاظ یہ ہیں لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقىٰ الشبهات فقد استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع فى الشبهات وقع فى الحرام كالراعى يرعى حول الحمى يوشك ان يرتع فيه ان شبہات کو اکثر لوگ نہیں جانتے تو جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور آبرو کو نقص وعیب سے محفوظ و بری کرلیا اور جو شبہات میں پڑے گا وہ (بالآخر) حرام میں پڑے گا اس چرواہے کی طرح جو ممنوع چراگاہ کے اردگرد مویشیوں کو چراتا ہے تو عنقریب وہ اس ممنوعہ چراگاہ میں چرالے گا۔

(۱) تاریخ بغداد، ج:۹ ص:۵۷، تہذیب تاریخ دمشق، ج:۶ ص:۲۴۷، البدایہ والنہایہ، ج:۱۱، ص:۶۴۔

عمر عزیز حدیث دوم، و در مراعات حقوق ہمسایہ و اقارب و دیگر اہل تعارف و معاملہ حدیث سوم، و در دفع شک و تردد کہ بسبب اختلاف علماء یا اختلاف ادلّہ رومی دہد حدیث چہارم، پس ایں ہر چہار حدیث نزد مرد عاقل حکم پیر و استاد ہر دو دارند واللہ اعلم۔"(١)

راقم حروف کہتا ہے کہ ان کے کافی ہونے کے معنی یہ ہے کہ شریعت کے قواعد کلیہ اور مشہور امور کو معلوم کر لینے کے بعد پیش آمدہ جزئی مسائل میں مجتہد و مرشد کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ عبادات کی درستگی کے لیے پہلی حدیث اور عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لیے دوسری حدیث اور ہمسایہ و اقارب اور دیگر اہل تعارف و معاملہ کے حقوق کی رعایت کے لیے تیسری حدیث اور اس شک و تردد کے ازالہ کے لیے جو علماء کے اختلاف یا دلائل کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں چوتھی حدیث کافی ہے۔ لہٰذا یہ چاروں حدیثیں مرد عاقل کے لیے مرشد اور استاذ دونوں کے حکم میں ہیں۔ واللہ اعلم

(٢) حافظ الآجری کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوداوٗد کو کہتے ہوئے سنا کہ "اللیث بن سعد روی عن الزهری، وروی عن خمسة عن الزهری، حدث عن خالد بن یزید، عن سعید بن ابی هلال، عن یزید بن الهاد، عن ابراهیم بن سعد، عن صالح بن کیسان، عن الزهری" (٢)

لیث بن سعد مصری الامام ابن شہاب زہری سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں اور درج بالا پانچ واسطوں سے بھی روایت کرتے ہیں۔

(٣) امام ابوداوٗد کا بیان ہے "شبّرت قثّاء بمصر ثلاثة عشر شبرا، و رأیت اترجّة علی بعیر قطعتین وعملت مثل عِدلین"(٣) میں نے مصر میں ایک

(١) بستان المحدثین مترجم، ص:٦ ٢٨ طبع سعید کمپنی کراچی، پاکستان۔

(٢) سوالات الآجری، ج:٢، ص: ١٦٧-١٦٨ وتہذیب التہذیب، ج:٨، ص: ٤٠٤-٤٠٥، رقم الترجمہ ٥٩١٠، سیر اعلام النبلاء، ج:١٣، ص:٢١٧، چار واسطوں کا ذکر ہے سعید بن ابی ہلال کے بعد یزید بن الہاد کا نام نہیں ہے۔

(٣) تذکرۃ الحفاظ، ج:٢، ص:٥٩٢۔

ککڑی کی پیائش کی تو وہ تیرہ بالشت کی تھی اور اونٹ پر لدا ایک لیمو دیکھا جس کے دو ٹکڑے کر کے گون کی طرح دونوں جانب لٹکا دیئے گئے تھے۔

(۴) امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ "حارثة بن النعمان، و عبد اللّٰه بن عباس، وابو سفيان بن حرب، وجابر بن عبد اللّٰه و حسان بن ثابت، و كعب بن مالك، وابن ام مكتوم، و عِتبان بن مالك، وابو قحافة، والعباس بن عبدالمطلب هؤلاء ذهبت ابصارهم"(۱) یعنی مذکورہ بالا حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نابینا ہو گئے تھے۔

امام ابوداؤد ائمہ حدیث اور اکابر علماء کی نظر میں

ارباب علم وفضل کی نظر میں امام ابوداؤد کا مقام ومرتبہ کیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ العارفین سہل بن عبداللہ التستری المتوفی ۲۸۳ھ (معروف بہ الزاہد المحدث) ایک دن امام ابوداؤد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری ایک حاجت آپ سے وابستہ ہے، امام سجستانی نے کہا ارشاد فرمائیں وہ کیا حاجت ہے؟ شیخ تستری بولے اس شرط پر بیان کروں گا کہ آپ وعدہ فرمائیں کہ اگر اسے پورا کرنے کی قدرت ہوگی تو آپ اس سے دریغ نہیں فرمائیں گے، امام ابوداؤد نے وعدہ کرلیا کہ حتی الامکان اسے پورا کروں گا، تو شیخ تستری نے عرض کیا "اخرج اليّ لسانك الذي حدثت به احاديث رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم حتّٰى اقبّله" اپنی پاکیزہ زبان جس سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرتے ہیں میری جانب نکالیے تاکہ اس کا بوسہ لوں۔ "فاخرج اليه لسانه فقبله" حسب وعدہ امام ابوداؤد نے زبان باہر نکال دی اور شیخ تستری نے اسے چوم لیا۔(۲)

(۱) سوالات الآجری، ج:۱،ص:۱۹۸

(۲) وفیات الاعیان، ج:۱،ص:۳۸۳ رقم الترجمہ ۲۷۲ وتہذیب الکمال، ج:۳،ص:۲۶۵ رقم الترجمہ ۲۴۷۶ وسیر اعلام النبلاء، ج:۱۳،ص:۲۱۳ وص ۲۳۱ مختصراً۔

شیخ تستری جیسے زاہد و عابد (جو دنیا اور اہل دنیا کی سرگرمیوں سے الگ تھلگ زاویۂ خمول میں بیٹھے یاد الٰہی میں مستغرق رہا کرتے تھے) کا امام ابوداؤد کے ساتھ حسن عقیدت اور والہانہ محبت کا یہ معاملہ ارباب فضل وکمال کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت کا پتہ دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابوداؤد کے کمالات وفضائل کے اعتراف واظہار میں ہر دور کے صاحب نظر علماء رطب اللسان رہے ہیں اس موقع پر بنظر اختصار اکابر علماء کے دس فرمودات واقوال نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) امام ابراہیم بن اسحاق الحربی المتوفی ۲۸۵ھ فرماتے ہیں:

"أُلِین لأبی داؤد الحدیث کما ألین لداؤد علیه السلام الحدید" (۱)

ابوداؤد سجستانی کے لیے حدیث نرم کردی گئی جس طرح داؤد نبی علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کردیا گیا تھا، بعینہٖ یہی بات محمد بن اسحاق الصاغانی المتوفی ۲۷۰ھ نے بھی فرمائی ہے۔

(۲) حافظ موسیٰ بن ہارون المتوفی ۲۹۴ھ کا قول ہے:

"خلق أبو داؤد فی الدنیا للحدیث وفی الآخرة للجنة ما رأیت افضل منه"(۲)

امام ابوداؤد دنیا میں خدمت حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے واسطے پیدا کیے گئے ہیں میں نے ان سے افضل و برتر کسی کو نہیں دیکھا۔

(۳) ابوبکر الخلال المتوفی ۳۱۱ھ نے ان الفاظ میں مدح سرائی کی ہے:

"أبو داؤد الإمام المقدم فی زمانه رجل لم یسبق الی معرفته بتخریج العلوم وبصره بمواضعه احد فی زمانه رجل ورع مقدم.(۳)

امام ابوداؤد سجستانی اپنے عہد میں پیشوا اور ایک ایسے مرد کامل تھے کہ احادیث احکام کی تخریج کی معرفت اور مواقع احکام کی بصیرت میں ان کے

(۱) تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۶ وتہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۷

(۲) تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۶ وتہذیب تاریخ دمشق، ج:۶، ص:۲۴۷

(۳) ایضاً

زمانہ میں کوئی عالم ان پر سبقت نہ لے جاسکا نیز وہ ایک مرد پارسا اور برتر شخصیت کے مالک تھے۔

(۴) مسند بغداد امام محمد بن مخلد المتوفی ۳۳۱ھ ان الفاظ میں امام ابوداؤد کی جلالت شان کا اعتراف کرتے ہیں:

”كان ابوداؤد يفى بمذاكرة مأة الف حديث ... اقرّ له اهل زمانه بالحفظ“(۱)

وہ دوران مذاکرہ ایک لاکھ حدیثیں پیش کردیتے تھے ان کے معاصرین نے ان کے حفظ واتقان کی شہادت دی ہے۔

(۵) محدث احمد بن محمد بن یاسین الہروی المتوفی ۳۳۴ھ امام سجستانی کے مناقب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”كان أبوداؤد أحد حفاظ الإسلام لحديث رسول الله صلى الله عليه سلم وعلمه وعلله فى اعلا درجة النسك والعفاف والصلاح والورع من فرسان الحديث“(۲)

امام ابوداؤد رسول خدا......کی احادیث، نیز علم حدیث، علل حدیث کے حفاظ میں سے ایک تھے، عبادت الٰہی، پارسائی وپاکدامنی اور صلاح وپرہیزگاری میں بلند درجہ پر فائز، میدانِ حدیث کے شہ سواروں میں تھے۔

(۶) امام ابوحاتم ابن حبان المتوفی ۳۵۴ھ یوں مدح سرا ہیں:

”كان أبوداؤد أحد ائمة الدنيا فقهاً و علماً و حفظاً ونسكاً و ورعاً واتقاناً جمع وصنّف وذبّ عن السنن“ (۳)

فقہ، حدیث، قوت حافظہ، عبادت گزاری، زہد وپارسائی اور حافظہ کی پختگی

(۱) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۲، ص:۲۴۷ وتہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۹

(۲) تہذیب تاریخ دمشق، ج:۲، ص:۲۴۷ وتہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۴ رقم الترجمہ ۲۴۷۹

(۳) تہذیب الکمال، ج:۳، ص:۲۶۵ وسیر اعلام النبلاء، ج:۱۳، ص:۲۱۲

کے اعتبار سے امام ابوداؤد دنیا کے اماموں میں سے ایک تھے، انھوں نے حدیث رسول اللہ...... کی جمع وتالیف اور حمایت سنت کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

(۷) حافظ ابوعبداللہ بن مندہ المتوفی ۳۹۶ھ نے ان کی عظمت شان کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"الذین أخرجوا و میزوا الثابت من المعلول والخطاء من الصواب اربعة: البخاری، ومسلم و بعدهما ابو داؤد والنسائی" (۱)

بطور خاص جن ائمہ حدیث نے احادیث کی تخریج کی اور ثابت وصحیح کو ضعیف وکمزور سے اور غلط کو درست سے الگ کیا، چار ہیں: امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ابوعبدالرحمٰن النسائی۔

(۸) امام ابوعبداللہ الحاکم النیسا پوری المتوفی ۴۰۵ھ کہتے ہیں:

"أبو داؤد إمام أهل الحديث فی عصره بلا مدافعة" (۲)

امام ابوداؤد بغیر کسی اختلاف کے اپنے عہد میں علمائے حدیث کے امام تھے۔

(۹) امام ابن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ کا بیان ہے:

"کان عالما عارفا بعلل الحدیث ذا عفاف وورع و کان یشبه باحمد بن حنبلؒ"

امام ابوداؤد عالم، حدیث کی علتوں کے پہچاننے والے، پاکبازی و پرہیزگاری سے متصف تھے اور حسن سیرت میں امام احمد بن حنبل سے مشابہ تھے۔

(۱۰) امام النووی المتوفی ٦٧٦ھ رقمطراز ہیں:

(۱) ایضاً

(۲) ایضاً

”اتفق العلماء على الثناء على أبى داؤد و وصفه بالحفظ التام والعلم الوافر والإتقان والورع والدين والفهم الثاقب فى الحديث وغيره“ (١)

امام ابوداؤد کی ستائش اوران کی بھر پور قوت حافظہ،علم کی کثرت،ضبط کی پختگی، پارسائی اور دینداری اور حدیث وغیرہ علوم میں فہم رسا پر علماء کا اتفاق ہے۔

امام ابوداؤد کی تصنیفی خدمات

(١) رسالة الى اهل مكة فى وصف سننه : علماء مکہ نے ایک تحریر کے ذریعہ امام ابوداؤد سے ان کی کتاب السنن کی احادیث کے مرتبہ صحت وغیرہ سے متعلق امور کی وضاحت چاہی تھی اسی کے جواب میں انھوں نے یہ رسالہ قلمبند کیا تھا، یہ رسالہ پہلی بار مطبع الانوار قاہرہ سے ١٣٦٩ھ میں محقق جلیل علامہ محمد زاہد الکوثری کے مقدمہ اور تعلیق وتحقیق کے ساتھ شائع ہوا۔اس کے بعد ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ اور معروف محقق علامہ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیقات وتعلیقات سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

(٢) مسائل الإمام أحمد رواية أبى داؤد : علامہ رشید رضا کے مقدمہ اور استاذ محمد بہجت البیطار کی تصحیح سے مطبع المنار مصر سے پہلی بار ١٣٥٣ھ میں یہ رسالہ شائع ہوا تھا بعد میں اسی نسخہ کی فوٹو کاپی سے بیروت سے اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔

(٣) سوالات الآجرّى : یہ کتاب علم حدیث کے اہم ترین فن معرفۃ الرجال (جرح وتعدیل) کے موضوع پر ہے اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ڈاکٹر محمد علی قاسم العمری کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ١٤٠٣ھ میں طبع ہوا تھا پھر دوسرا فی الجملہ مکمل نسخہ ١٤١٨ھ میں ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے مقدمہ اور تعلیق کے ساتھ مکتبہ دارالاستقامہ مکہ مکرمہ نے شائع کیا ہے جو اصل کتاب کے جزء٢،٣،٤،٥ پر مشتمل ہے۔جزء اول مفقود ہے،اس لیے شامل کتاب نہیں ہوسکا۔

(٤) تسمية الإخوة الذين روى عنهم الحديث : موضوع نام سے ظاہر

(١) تہذیب الاسماء واللغات،ج:٢،ص:٢٢٥

ہے حال ہی میں یہ رسالہ ڈاکٹر باسم فیصل الجوابرۃ کی تحقیق سے شائع ہوگیا ہے۔

(۵) أسئلة لأحمد بن حنبل عن الرواة الثقات والضعفاء : چند سال پہلے یہ رسالہ بھی ڈاکٹر زیاد محمد منصور کی تحقیق سے شائع ہوگیا ہے۔

(٦) المراسیل : امام ابوداؤد کی یہ معروف تصنیف ۱۳۱۰ھ میں مصر سے طبع ہوئی تھی بعد میں بیروت سے دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اور تیسرا ایڈیشن شیخ شعیب الارناؤط کی تحقیق سے شائع ہوا ہے یہ نسخہ سابقہ نسخوں کے لحاظ سے زیادہ مفید و مکمل ہے۔

(۷) الناسخ والمنسوخ : امام ابوداؤد سے اس کتاب کی روایت ابوبکر احمد النّجاد کرتے ہیں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اس کی صراحت کی ہے۔(۱)

(۸) کتاب الزهد : ضیاء الحسن السّلفی کی تحقیق کے ساتھ الدار السّلفیہ بمبئی سے چند سال قبل شائع ہوگئی ہے۔

(۹) کتاب الرد علی اهل القدر : حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ امام ابوداؤد سے اس کی روایت ابوعبداللہ محمد بن احمد بن یعقوب المتوُّثی کرتے ہیں (۲)

(۱۰) کتاب البعث والنشور : الزرکلی نے الاعلام میں اور بروکلمان نے تاریخ الادب العربی میں اس کا تذکرہ کیا، امام ابوداؤد کے خلف الصدق ابوبکر عبداللہ السجستانی کی بھی ایک تصنیف اسی نام سے ہے۔(۳)

(۱۱) المسائل التی حلف علیها الإمام أحمد بن حنبل : اس کتاب کا سو ورق پر مشتمل مخطوطہ الظاہریۃ میں ہے۔

(۱۲) دلائل النبوة

(۱۳) کتاب الدعاء

---

(۱) ج:۴، ص:۱۵۴ رقم الترجمہ ۲۶۲۸

(۲) الاعلام، ج:۳، ص:۱۲۲ و تاریخ الادب العربی، ج:۳، ص:۱۸۹

(۳) تاریخ التراث العربی، ج:۱، ص:۲۳۸

(۱۴) كتاب ابتداء الوحی

(۱۵) كتاب أخبار الخوارج

(۱۶) التفرد فی السنن

(۱۷) فضائل الأنصار

(۱۸) مسند مالك نمبر شمار ۱۲ سے ۱۸ تک سات تصانیف کا ذکر حافظ ابن حجر نے تہذیب کے مقدمہ میں کیا ہے۔

(۱۹) أصحاب الشعبی : اس کتاب کا ذکر سوالات الآجری میں آیا ہے۔

(۲۰) كتاب السنن : امام ابوداؤد کے تصنیفی کاموں میں یہ کتاب شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔امام سجستانی کی یہی وہ عظیم تصنیف ہے جس نے ان کے شرف ومجد کو ثریا کی رفعت وبلندی عطا کی اوران کے نام وکام کو ذکر دوام کی دولت بیکراں سے ہم آغوش کردیا جواپنے زمانۂ تالیف سے آج تک محدثین وفقہاء کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

"ذلك فضل الله یوتیه من یشاء"

☆ ☆ ☆

اجودھیا کے مشاہیر علماء ومشائخ

اجودھیا شہر فیض آباد سے جنوب مشرق میں ۶ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قدیم قصبہ ہے جس کی کل آبادی اس وقت ۳۵ ہزار کے قریب ہے جن میں مسلمان صرف ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ اس قدیم آبادی میں ½۴ ہزار نئے پرانے مندر ہیں اور تقریباً ایک صد سے زائد قدیم مسجدیں ہیں۔ کسی زمانہ میں یہاں بدھوں اور جینیوں کی عبادت گاہیں بھی تھیں مگر اب ان کا کوئی نام ونشان باقی نہیں ہے۔ سرکاری اندراج کے مطابق ۲۷ قبرستان ہیں جن میں سے صرف ۶ قبرستانوں میں بروقت مُردے دفن کرنے کی اجازت ہے۔

مسجدیں بالعموم خستہ حالت میں ہیں جن کی مرمت وتعمیر کی اجازت نہیں ہے جبکہ مندروں کی مرمت وتعمیر پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں ہے۔ اسی جانب دارانہ پالیسی کی وجہ سے مسجدوں کی تعداد گھٹ کر سورہ گئی ہے ورنہ زبانی روایات کے مطابق یہاں ہزاروں چھوٹی بڑی مسجدیں تھیں۔

اجودھیا کی روایتی خصوصیت

مشہور روایت کے مطابق یہ شہر ابوالانسان حضرت آدم علیہ السلام کے صلبی صاحبزادے حضرت ''شیث'' علیہ السلام کا مدفن اور ''رام جی'' کا جنم استھان ہے اسی بناء پر مسلمان اور ہندو دونوں اس سرزمین کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت شیثؑ کا مزار آج بھی متعین ومعلوم طور پر اجودھیا میں موجود ہے اور بلا اختلاف ہندو ومسلمان دونوں اسے متبرک ومقدس سمجھتے ہیں۔

اجودھیا اپنی اسی روایتی خصوصیت کی بناء پر ہمیشہ سے مشائخ وصوفیاء اور سادھوؤں و سنتوں کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی یہاں سیکڑوں مشائخ واولیاء کے مزارات اور ان کی

خانقاہوں کے آثار موجود ہیں اور زبان حال سے اپنی عظمت رفتہ کی شہادت دے رہے ہیں۔

نوابان اودھ کی عملداری اور انگریزوں کے جابرانہ تسلط نے اجودھیا کی اس مرکزیت کو باقی نہیں چھوڑا اوّل الذکر نے اپنے مخصوص مذہبی عقائد ونظریات اور انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی غرض سے یہاں کی اسلامی روایات کو اپنی شاطرانہ چالوں سے پامال کردیا۔ آزادی کے بعد ابنائے وطن کے ایک مخصوص طبقہ نے حکومت کی غیر منصفانہ خاموشی اور در پردہ تعاون سے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور آج صورت حال یہ ہے کہ اس سرزمین پر مسلمانوں کے وجود کو ننگ وعار سمجھا جارہا ہے اور اسلامی عبادت گاہوں (مساجد) کو مندروں میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ حالانکہ جس طرح یہ سرزمین ہندوؤں کے نزدیک رام جنم بھومی ہونے کی وجہ سے پوتر ہے اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک بھی حضرت شیث علیہ السلام کے مدفن اور سیکڑوں اولیاء کی خواب گاہ ہونے کی بناء پر مقدس ومتبرک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ابنائے وطن جن روایات کے سہارے اجودھیا کو رام جی کی جنم بھومی کہتے ہیں ان سے کہیں زیادہ اور مضبوط تاریخی روایات سے اس سرزمین میں حضرت شیث علیہ السلام کا مزار ہونا ثابت ہے دور جدید کی تحقیق کے اعتبار سے اگر یہ روایتیں محل نظر ہیں تو جنم استھان کی روایت اس سے بھی زیادہ کمزور اور عقل وتحقیق سے بعید ہے۔

اس مختصر مقالہ میں ان روایتوں کی تنقیح وتحقیق کی گنجائش نہیں انشاء اللہ کسی اور موقع پر اس اجمال کی تفصیل پیش کی جائے گی اس مختصر تمہید کے بعد چند مشائخ کے حالات ملاحظہ فرمائیں جن سے کچھ نہ کچھ حقیقت حال ضرور منکشف ہوگی۔

(۱) قاضی قدوۃ الدین

قاضی قدوۃ الدین بن میرک شاہ بن ابوالعلی اسرائیلی اودھی متقدمین علمائے ہند میں صاحب کمال بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ علوم وفنون میں مکمل دستگاہ رکھنے کے ساتھ شیخ عثمان ہرونی (مرشد شیخ معین الدین سجزی اجمیری متوفی) سے سلوک وطریقت کی

تحصیل کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوجانے کے بعد یہاں تشریف لائے اور سکونت کے لئے اجودھیا (اودھ) کو منتخب کیا۔

قاضی صاحب نہایت جری اور حق گو تھے امر بالمعروف ونہی عندالمنکر میں امراء و حکام کی بھی مطلق پروانہیں کرتے تھے ۶۰۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔(۱)

بابری مسجد کے سامنے پورب جانب پختہ چبوترہ پر آپ کی قبر آج بھی موجود ہے۔ اور عوام میں ''قاضی قدوہ کا مزار'' کے نام سے مشہور ہے اس قبر کے اردگرد بالخصوص جنوب کی سمت بہت سی قبریں تھی مگر اب انھیں برابر کر کے کھیت بنالیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ اعزالدین اس دیار کے قاضی مقرر ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں بڑی برکت عطا کی اور ان کا سلسلہ اس علاقے میں خوب پھیلا۔ بقول شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی مولف بحر ذخار اس خاندان کے لوگوں نے اجودھیا کے اطراف وجوانب میں تقریباً پچاس گاؤں بسائے۔ چنانچہ سوراپور ضلع فیض آباد، لکھنؤ، نواب گنج ضلع بارہ بنکی وغیرہ میں اس سلسلہ کے لوگ اب بھی موجود ہیں جو اپنے آپ کو انھیں قاضی قدوۃ الدین کی جانب منسوب کرتے ہوئے قدوائی کہتے اور لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر دبیر مؤلف شہر اولیاء اپنی کتاب کے صفحہ ۲۵۹ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

''معتبر کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوہ نامی شخص کا شہر اودھ (اجودھیا) میں بطور حاکم یا قاضی شہر آنا ثابت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر صاحب موصوف اگر تھوڑی سی زحمت گوارا فرما کر بحر ذخار یا نزہۃ الخواطر کو دیکھ لیتے تو اس غلط حاشیہ آرائی سے بچ جاتے۔

(۲) شیخ الاسلام فرید الدین اودھی

شیخ الاسلام فرید الدین اودھی، نحو، لغت، ادب، تفسیر وغیرہ علوم میں امتیازی شان

(۱۰) بحر ذخار بحوالہ نزہۃ الخواطر ج ا ص ۱۹۶۔

کے مالک تھے۔مولانا عبدالحیؒ حسنیؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں ”لم یکن مثله فی زمانه“ احکام فرعیہ میں امام شافعیؒ کے پیرو تھے۔اجودھیا میں شیخ الاسلام کے باوقار منصب پر فائز تھے اور کار منصبی کے ساتھ طلبہ کو درس بھی دیتے تھے۔علامہ شمس الدین بن یحییٰ اور شیخ علاء الدین نیلی جیسے اساطین فن آپ کے خوان علم کے ریزہ چیں تھے۔افسوس کی اس یگانہ دہر کے تفصیلی حالات وسن وفات دستیاب نہیں البتہ مولانا شمس الدین اودھی اور مولانا نیلی کا ان سے تلمذ یقینی طور پر بتاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کے بزرگ ہیں۔(۱)

(۳) شیخ بدرالدین واعظ

شیخ بدرالدین حنفی اودھی صلاح وتقویٰ سے متصف عہد علائی کے زبردست واعظ ومذکر تھے، مستقل قیام اجودھیا ہی میں تھا مگر وعظ وتذکیر کی غرض سے گاہے بہ گاہے دارالحکومت دہلی تشریف لے جاتے اور وہاں مہینوں قیام کر کے خلق خدا کو اپنے مواعظ و نصائح سے مستفید کرتے تھے مورخ برنی اپنی تاریخ میں شیخ کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

> ”شیخ بدرالدین زہد وتقویٰ میں بلند مرتبہ کے حامل تھے گفتگو میں تصنع و تکلف سے پرہیز کرتے تھے،راست گوئی عادت ثانیہ تھی۔ان کی مجلس وعظ میں ہر طبقے کے لوگ حاضر ہوتے تھے وعظ کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سامعین روتے روتے نڈھال ہو جاتے تھے۔“(۲)

مزید تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں ہاں علاء الدین خلجی کے عہد سلطنت کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی کے ابتدائی عہد کے بزرگ ہیں۔کیونکہ شاہ علاء الدین خلجی ۶۹۲ھ میں تخت نشیں ہوا ہے اور بیس سال حکومت کر کے ۷۱۶ھ میں وفات پا گیا۔

(۴) قاضی محی الدین کاشانی

قاضی محی الدین اجودھیا کے ایک ذی اثر خاندان کے فرد فرید تھے سلسلۂ نسب یوں

(۱) نزہۃ الخواطر ج۲ص ۱۰۸۔ (۲) تکملہ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۲ و نزہۃ الخواطر ج۲ ص ۱۶۔

بیان کیا جاتا ہے، قاضی محی الدین کاشانی، بن قاضی جلال الدین، بن قاضی قطب الدین، از اولاد زید بن اسود بن سید ابراہیم، بن سید محمد، بن سید قاسم، بن ابراہیم طباطبا، بن اسمٰعیل، بن ابراہیم، بن عمر بن حسن حسنی بن حضرت حسن بن علی بن ابی طالب۔(۱)

قاضی کاشانی حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں زہد وتقویٰ اور علمی تبحر میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ ابتداء میں حکومت سے متعلق رہے لیکن جس وقت شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سرکاری وثیقہ کو پارہ پارہ کر کے فضا میں بکھیر دیا۔ اور ریاست وامارت کے بجائے فقر ومسکنت کی زندگی اختیار کر لی۔ بالآخر سلطان المشائخ نے قاضی صاحب کے عمدہ احوال کو دیکھ کر اپنے دست خاص سے خلافت نامہ لکھ کر عنایت فرمایا۔ خلافت نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

می باید کہ تارک دنیا باشی۔ بسوئے دنیا وارباب دنیا مائل نہ شوی ودیہ قبول نہ کنی وصلۂ بادشاہان مگیری واگر مسافران بتو رسند و بر تو چیزے نباشد ایں حال را غنیمتی و نعمتی شمری از نعمتہائے الٰہی فان فعلت وما امرتك وظني بك ان تفعل كذالك فانت خليفتي وان لن تفعل فالله خليفتي على المسلمين.(۲)

تارک دنیا رہنا، دنیا اور دنیا والوں کی طرف مت جھکنا، بادشاہوں کی جاگیر اور انعام قبول نہ کرنا اگر مسافر تمہارے مہمان ہوں اور تمہارے پاس کچھ بھی نہ ہو تو اس حالت کو غنیمت سمجھنا اور اسے اللہ کی نعمت باور کرنا۔ اگر تم میرے حکم کے مطابق عمل پیرا رہے اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہی کرو گے تو تم میرے خلیفہ ہوا گر بالفرض تم نے ان باتوں پر عمل نہیں کیا تو پھر مسلمانوں پر میرا قائم مقام اللہ تعالیٰ ہے۔

قاضی صاحب حسب ہدایت شیخ پوری استقامت کے ساتھ دنیا واہل دنیا سے کنارہ

(۱) دہلی کے ۲۲ خواجہ ص ۱۸۰۔

(۲) سیر الاولیا ص ۲۹۵۔

کش ہوکر یادالٰہی اور عبادت وریاضت میں مشغول رہے۔ کچھ دنوں کے بعد تنگ دستی اور فقر وفاقہ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ ان کے گھر والے بلبلا اٹھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر قاضی صاحب کے ایک شناسا نے اس کا تذکرہ سلطان علاء الدین خلجی سے کردیا۔ سلطان نے اجودھیا کا منصب قضا (جوان کا موروثی منصب تھا اور اپنے علم وفضل کی بناء پر یہ اس کے اہل بھی تھے) کا پروانہ ان کے نام بھیج دیا۔ قاضی صاحب حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض رسا ہوئے کہ یہ عہدۂ قضا بغیر کسی طلب کے مرے سپرد کیا جارہا ہے۔ اس بارے میں حضرت کا منشا کیا ہے؟ یہ سن کر سلطان المشائخ نے ناخوش ہوکر فرمایا پہلے تمہارے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا ہوگا جب ہی تو ایسا ہوا ہے۔ اور خلافت نامہ ان سے واپس لے لیا۔ تقریباً ایک سال تک شیخ ان سے کبیدہ خاطر رہے بالآخر امیر خرد کی سفارش پر راضی ہوئے اور تجدید بیعت کر کے خلافت نامہ واپس فرمادیا۔ سلطان المشائخ کی حیات ہی میں قاضی صاحب ۷۱۹ھ میں وفات پاگئے۔(۱)

(۵) شیخ تقی الدین علم بخش

شیخ تقی الدین علم بخش اودھی اپنے عہد کے علمائے کبار ومشائخ عظام میں سے تھے آپ شیخ داؤد ماہی متوفی ۶۸۰ھ خلیفہ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کے برادرزادہ اور شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے ماموں تھے۔(۲)

گم گشتہ حالات اجودھیاء میں مولوی عبدالکریم اودھی متوفی ۱۳۰۷ھ نے شیخ تقی الدین کو بھی شیخ فریدالدین مسعودؒ کا خلیفہ بتایا ہے مگر یہ بات تشنۂ تحقیق ہے اس لئے لائق اعتماد نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی آپ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

(۱) قاضی کے حالات کیلئے سیر الاولیاء از میر خسرو، اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق دہلوی، خزینۃ الاصفیاء غلام سرور لاہوری، تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمان علی، نزہۃ الخواطر ج۲، اور تاریخ مشائخ چشت پروفیسر خلیق نظامی دیکھی جائیں۔

(۲) منبع الانساب از مولوی معین بن شہاب جھوسوی۔

بغایت متقی بود کار او آں بود کہ کتاب اورادے داشت آنرا می گرفت و در آخر شب از خانہ بیروں می آمد تمام روز در جائے مشغول می بود چوں پارۂ از شب می گذشت بخانہ می آمد۔

بڑے متقی تھے ان کا معمول تھا کہ اپنی وظائف کی کتاب لے کر رات کو پچھلے پہر آبادی سے باہر نکل جاتے اور پورے دن وہیں یاد الٰہی میں مشغول رہتے اور کچھ رات گئے وہاں سے گھر واپس آتے۔(۱)

آپ کے چچا شیخ داؤد پالہی کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد جنگل میں چلے جاتے اور وہیں دن بھر عبادت حق میں مستغرق رہتے۔(۲) ممکن ہے شیخ تقی الدین نے اپنے عم محترم سے یہ طریقہ اخذ کیا ہو۔

جس خوش قسمت کو آپ کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کی توفیق مل جاتی وہ ان کی انفاس قدسیہ کی برکت سے علم کی دولت سے مالا مال ہو جاتا تھا اس لئے لوگ آپ کو علم بخش کہا کرتے تھے۔ مولوی عبدالکریم اودھی اپنے والد مولوی عبدالرؤف کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ والد ماجد کہا کرتے تھے کہ میرے بچپن کے وقت تک طلبہ اور شائقین علم پنجشنبہ کو آپ کے مزار پر حاضر ہو کر ترقیٔ علم وافزائش حفظ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔(۳)

ماہ رجب ۷۲۶ھ میں آپ نے دار دنیا کو الوداع کہا۔(۴)

مزار اجودھیا میں ایٹوا تالاب (جو اس وقت ستیہ ساگر کے نام سے مشہور ہو گیا ہے) کے اوپر ہے۔(۵)

لطائف اشرفی کی اس نشاندہی کی بنیاد پر آپ اس وقت مزار تک پہنچنا چاہیں تو کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ بیان اب سے تقریباً چھ ساڑھے چھ سو سال پہلے کا ہے اگر چہ ایٹوا تالاب نام کی تبدیلی کے ساتھ سہی اب بھی موجود ہے مگر اس کے حدود اربعہ یکسر بدل چکے

(۱) اخبار الاخیار ۱۷۱۔
(۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۱۳۔
(۳) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۵۔
(۴) ایضاً۔
(۵) لطائف اشرفی ملفوظات ومکتوبات مخدوم اشرف سمنانی کچھ چھوی۔

ہیں اور ایک ایٹوا تالاب کی کیا تخصیص ہے اب تو پورے اجودھیا کے آسمان و زمین کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں اس لئے اس نابغۂ عصر اور مرد کامل کے مزار تک پہنچنے کے لئے درج ذیل تفصیلات پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

محلّہ نوگزی (اس محلّہ میں وہ قدیم قبرستان ہے جو نبی نوح سے موسوم ہے اور اس قبرستان میں وہ مشہور و معروف قبر ہے جو نوگزی کہی جاتی ہے مگر پیمائش میں چودہ گز سے زیادہ لمبی ہے اسی قبر کے نام پر یہ محلّہ نوگزی کہلاتا ہے) سے جانب مشرق تقریباً ۳۰،۳۲ میٹر کے فاصلے پر ''کیوڑا مسجد'' ہے، مسجد کی پشت سے ایک راستہ اتر کو جاتا ہے اس راستہ کو تھوڑی دور طے کرنے کے بعد ایک سڑک ملے گی۔ اس سڑک سے پورب جانب ۲۰،۲۲ میٹر چلنے پر ''چھوٹی کٹیا'' — نامی ایک مندر ملے گا۔ یہ مندر ایک وسیع احاطہ کے اندر ہے۔ احاطہ میں داخلہ ایک بلند پھاٹک سے ہوتا ہے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی پھاٹک سے متصل داہنے ہاتھ ایک چبوترے پر آپ کو ایک قبر نظر آئے گی۔ یہی حضرت شیخ تقی الدین علم بخش اودھی کی آرام گاہ ہے۔ مندر کا یہ احاطہ آج سے ایک صدی قبل مسلمانوں کا قبرستان تھا جس میں بے شمار قبریں تھیں مگر اب شیخ تقی الدین کے علاوہ کسی قبر کا نام و نشان باقی نہیں ہے۔ ''مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے''۔

قبر اگرچہ کافی بوسیدہ ہوگئی ہے مگر مندر کے پجاری اس پر سفیدی کراتے رہتے ہیں اور قبر کے ارد گرد حصے کو ستھرا رکھتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندر کے بیراگیوں کے دل میں اس کی عزت و حرمت باقی ہے۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے برائے فاتحہ درگاہ علم بخش کی تلاش میں ادھر آجاتا ہے تو پجاری اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور اسے مزار تک پہنچا دیتے ہیں۔ (۱)

(۶) شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں علمی تبحر، زہد

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۵۔

وتقویٰ اور درس وافادہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔سید محمد علوی (میر خرد) لکھتے ہیں۔

کار علم وتبحر خدمت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بجائے کشید کہ اوستادانِ شہر بخدمت ایں بزرگ بزانوے ادب بنشستند وتلمذ کردند... بیشتر علمائے شہر منسوب بہ شاگردئ ایں بزرگ اند وسند علم ہائے ظاہری وتحقیق دینی نسبت بداں بزرگ کنند وفخر ومباہات بمجلس رفیع آں بزرگ دانند، کسے کہ بہ شاگردئ ایں بزرگ منسوب است میاں علماء بغایت معظم ومبجل ومکرم است۔(۱)

مولانا کا علمی تفوق اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ دہلی کے اساتذہ ان کے سامنے زانوئے ادب بچھاتے ہیں دہلی کے اکثر علماء ان کے شاگرد ہیں اور علوم وفنون وتحقیقات دینیہ میں مولانا ہی سے استناد کرتے ہیں۔اور آپ کی علمی مجلس کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔جسے بھی آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوجاتا ہے وہ علماء میں نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

آپ کے خواجہ تاش اور تلمیذ رشید شیخ نصیر الدین چراغ دہلی متوفی (۷۵۷ھ) نے آپ کی علمی سرگرمیوں کی مدح سرائی ان الفاظ میں کی ہے۔

سألت العلم من احياك حقا فقال العلم شمس الدين يحيىٰ(۲)

میں نے علم سے پوچھا کہ واقعتاً (اس زمانہ میں) تجھے کسی نے زندگی عطا کی تو علم نے جواب دیا شمس الدین یحییٰ نے۔

مولانا آزاد بلگرامی اپنے محتاط انداز میں یوں رقمطراز ہیں۔

ثم اقام مولانا شمس الدين فى ظل شيخه بدهلى فانارسوادها الاعظم بالتدريس و منّ على العالم الدراسة بالتاسيس وانتهت اليه رياسة التدريس بدار الخلافه.(۳)

---

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۲۶۔ (۲) سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی ص ۲۹۔

(۳) سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی ص ۲۹۔

بعدازاں اپنے شیخ (نظام الدین اولیاء) کے زیر سایہ دہلی میں مقیم ہوگئے اور درس وتدریس کے ذریعہ دہلی میں ایک بہت بڑی جماعت کو علم کی روشنی سے منور کردیا اور تدریسی مسئلہ میں استحکام پیدا کرکے اس پر احسان فرمایا دارالخلافہ دہلی میں تدریس کی ریاست آپ پر ختم ہوگئی۔

شیخ شمس الدین اودھی نے علوم وفنون کی تحصیل شیخ الاسلام فریدالدین شافعی اودھی اور شیخ ظہیرالدین بھکری وغیرہ اساتذہ سے اودھ اور دہلی میں کی تھی۔ تکمیل درس کے بعد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں رہ کر سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کیں اور خلافت سے مشرف ہوئے۔ سلطان المشائخ نے جو خلافت نامہ عطا فرمایا تھا اس پر کتابت کی تاریخ ۲۰/ذی الحجہ ۷۲۴ھ درج ہے۔(۱) سلطان المشائخ خلافت نامہ میں لکھتے ہیں۔

ثم ان الولد الاعز التقی والعالم المرضی المتوجه الی رب العالمین شمس الملة والدین محمد بن یحییٰ افاض اللّٰه الواحد انواره علی اهل التقویٰ والیقین. لما صح مقصده الینا ولبس خرقة الارادة واستوفیٰ حظه من صحبتنا اجزت له اذا استقام علی اتباع سید الکائنات واستغرق الاوقات بالطاعات ودافت القلب عن هواجس النفس والخطرات واعرض عن الدنیا واسبابها ولم یرکن الی ابنائها وارباىها وانقطع الی اللّٰه بالکلیة واشرقت فی قلبه الانوار القدسیة واسرار الملکوتیة وانفتح باب الفهم لتعریفات الالٰهیة ان یلبس الخرقة المریدین ویرشدهم الی مقامات الموقنین الخ(۲)

صاحب تقویٰ، پسندیدہ عالم، پروردگار عالم کی جانب متوجہ رہنے والا عزیز فرزند شمس الدین محمد بن یحییٰ نے (اللہ تعالیٰ اس کے انوار سے اہل یقین اور اصحابِ تقویٰ کو مستنیر کرے) جب اپنی نیت ہماری جانب درست کرلی

(۱) سیرالاولیاء ص ۲۳۱۔

(۲) سیرالاولیاء ص ۲۳۰۔

اور ارادت کا خرقہ پہن لیا اور ہماری صحبت سے پوری طرح مستفید ہو گیا (اور میں نے یہ محسوس کیا کہ) وہ سید کائنات کی پیروی میں ثابت قدم ہے اور اپنے اوقات یاد الٰہی میں مصروف رکھتا ہے۔ اور نفسانی توہمات سے اپنے قلب کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا اور اسباب دنیا سے رخ موڑ لیا ہے اور ارباب دنیا کی جانب مائل نہیں ہوتا اور پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہے اور اس کے قلب میں عالم قدس کے انوار درخشاں اور عالم ملکوت کے اسرار چمک رہے ہیں اور معرفت الٰہیہ کا باب اس پر کھل گیا ہے تو میں نے اسے اجازت وخلافت دے دی کہ وہ مریدین کو بیعت وارادت کا خرقہ پہنائے اور انہیں اہل یقین کی راہ دکھائے۔

سلطان المشائخ نے آپ کے لئے جن وقیع احوال کا ذکر کیا ہے ان سے طریقت ومعرفت میں آپ کی علوشان کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کے مزاج میں بڑی سادگی تھی۔ تکلّفات اور رسم ورواج کے بالکل پابند نہیں تھے۔ حتیٰ کہ نکاح بھی نہیں کیا تھا اور پوری زندگی تجرد میں بسر کر دی۔ امراء واغنیاء کے دربار میں حاضری گوارا نہ تھی اور نہ اپنے پاس ان کی آمد ورفت پسند تھی۔ تصوف کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود سجادۂ مشیخیت پر بیٹھنے سے گریز کرتے تھے اس لئے جلد کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر خلافت نامہ پر حضرت سلطان المشائخ کے دستخط نہ ہوتے تو میں اسے ہرگز اپنے پاس محفوظ نہ رکھتا۔ فتوح نامی ایک خادم تھا وہی آپ کے خانگی معاملات کا منتظم تھا۔ آپ کے کھانے پینے کے انتظام کے علاوہ واردین و صادرین کی تواضع وخاطرداری اسی کے سپرد تھی۔ خود ہر کام سے فارغ البال رہ کر درس و افادہ، تصنیف وتالیف اور ذکر ومراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ (۱)

سلطان محمد بن تغلق جس زمانہ میں علماء ومشائخ کو دہلی سے دعوت وتبلیغ کے نام پر ملک کے دور افتادہ خطوں میں بھیج رہا تھا اس موقع پر اس نے شیخ اودھی کو بھی طلب کیا اور کہا

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۲۵۔

کہ آپ جیسے عالم وفاضل کا یہاں کیا کام آپ کو تو شہر جا کر اشاعت دین کی سعی کرنی چاہئے۔ اور چند لوگوں کو متعین کر دیا کہ وہ شیخ کو جلد از جلد کشمیر روانہ کر دیں۔ حکم سلطانی کے بموجب سامان سفر درست کرنے کے لئے شیخ گھر واپس آئے۔ اس وقت وہاں جوارادت مند حاضر تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''اینہا چہ می گویند من بندگی شیخ را خواب دیدہ ام کی مراطلبند من بخدمت خواجہ بروم ایشاں مرا کجا می فرستادند'' یہ لوگ کیا بکواس کرتے ہیں میں نے خواب دیکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ مجھے بلا رہے ہیں میں تو اپنے شیخ کے پاس جا رہا ہوں یہ لوگ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن شیخ کے سینہ میں ایک پھوڑا نکل آیا اور اسی عارضہ میں جان جان آفریں کے حوالہ کر دی اور اپنے شیخ سلطان المشائخ کے حظیرہ میں اندرونی گنبد کے سامنے مدفون ہوئے۔(۱) مولوی رحمٰن علی نے سن وفات ۷۴۷ھ لکھی ہے۔

شیخ اودھی کثیر التصانیف عالم تھے چنانچہ ان کے قریب ہم عصر میر خرد لکھتے ہیں ''چندیں تصانیف درعلوم دینی از خدمت آں بزرگ درعالم یادگار ماندہ است'' (۲) مولانا بلگرامی لکھتے ہیں ''مولانا تصانیف دارد اما دریں عصر کم یافت می شود''۔(۳) مولانا صاحب تصانیف ہیں مگر اس وقت ان کی کتابیں کم یافت ہیں۔

گردش لیل ونہار نے اس فاضل اجل کی علمی یادگاروں کو اس طرح گم کر دیا ہے کہ آج ''شمس العوارف'' اور ''شرح مشارق الانوار'' کے علاوہ دیگر کتابوں کے نام کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آپ کا تذکرہ سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، سبحۃ المرجان، مآثر الکرام، خزینۃ الاصفیاء، حدائقہ حنفیہ، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطرج ۲ وغیرہ میں موجود ہے۔

(۷) شیخ جلال الدین اودھی

شیخ جلال الدین اودھی نحو، فقہ اور اصول فقہ کے زبردست عالم اور زہد وتقویٰ سے

(۱) ایضاً ص ۲۲۸۔ (۲) سیر الاولیاء ص ۲۲۶۔

(۳) مآثر الکرام ص ۱۸۳۔

متصف بزرگ تھے۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ حسب تصریح میر خرد علمائے اودھ میں سب سے پہلے آپ ہی حضرت سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تھے۔ اسی بناء پر تمام علمائے اودھ آپ کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر خرد یہ دلچسپ واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ ''یارانِ اودھ'' جو سب کے سب عالم وفاضل تھے اور ان میں سے اکثر ایک عرصہ تک علمی اشتغال میں اپنی عمر بسر کر چکے تھے۔ مگر سلطان المشائخ سے بیعت ہو جانے کے بعد آگے علمی مشاغل جاری نہ رہ سکے۔ اس لئے سب نے متفق ہو کر شیخ جلال الدین کو تیار کیا کہ سلطان المشائخ سے ہم سب کی طرف سے یہ درخواست کریں کہ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے علمی گفتگو اور بحث وتکرار کی اجازت ہو جائے۔ چنانچہ شیخ جلال الدین کی قیادت میں یہ سب لوگ سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ جلال نے حسب قرارداد مدعا پیش خدمت کیا، شیخ نے سن کر فرمایا ''من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است وایشاں ہمچوں پیاز پوست در پوست اند'' میں کیا کروں میرا مقصد تو انہیں مغز بنانا ہے مگر یہ لوگ پیاز کی طرح چھلکے ہی چھلکے ہیں۔ سلطان المشائخ کے اس جواب کا اثر یہ ہوا کہ شیخ جلال الدین نے دنیا کے تمام بکھیڑوں سے یکسو ہو کر ترک وتجرید کی زندگی اختیار کر لی اور بقیہ زندگی عُزلت میں گزار دی۔ میر خرد آخر میں لکھتے ہیں کہ چند روز بیمار رہ کر یہ فرشتہ صفت بزرگ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میر صاحب نے تاریخ وفات کی تصریح نہیں کی ہے چونکہ خود میر خرد کی وفات ۷۷۰ھ میں ہوئی ہے اس لئے لازمی طور پر شیخ جلال الدین کی رحلت اس سے پہلے ہوئی ہے۔(۱)

(۸) مولانا قوام الدین اودھی

مولانا قوام الدین معروف بہ یکدانہ شیخ شمس الدین بن یحییٰ کے تلمیذ اور سلطان المشائخ کے مرید تھے سلطان المشائخ انہیں ''مرد صالح'' کہا کرتے تھے۔ خادم ونوکر کے قطعاً محتاج نہیں تھے۔ اپنا سارا کام خود اپنے ہاتھوں کر لیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات ذکر

(۱) سیر الاولیاء ص ۳۰۵-۳۰۶ ونزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۲۳۔

ومراقبہ میں مشغول رہتے، مجاہدہ وریاضت کا عالم یہ تھا کہ کھانے میں آس (پیچھ) پر اکتفا کرتے تھے۔ تفصیلی حالات دستیاب نہیں سیر الاولیاء میں بس یہی چند سطریں ہیں۔

(۹) مولانا جمال الدین اودھی

شیخ جمال الدین اودھی سلطان المشائخ کے مرید اور متبحر عالم تھے۔ میر خسرو اپنے والد اور چچا کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا جمال الدین اودھی جس زمانہ میں مرید ہوکر خانقاہ میں مقیم ہوئے اسی زمانہ میں ایک خراسانی عالم (جو کثرت مباحثہ کی وجہ سے مولانا بحاث کے نام سے مشہور تھے) خانقاہ میں آئے اور وہاں موجود علماء مولانا وجیہہ الدین پائلی وغیرہ کی موجودگی میں ''بزدوی'' کے کسی مسئلہ پر بحث شروع کردی۔ بعض علماء کو ساکت بھی کردیا جس کی بناء پر دوسرے علماء کو ان سے گفتگو کی ہمت نہ ہوئی۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر مولانا جمال الدین سامنے آئے اور مولانا بحاث سے بحث شروع کردی اور بالآخر انہیں لاجواب کردیا۔ مولانا جمال الدین کی اس کامیابی پر خانقاہ کے علماء بہت خوش ہوئے انہیں مبارک باد اور دعائیں دیں کہ آج آپ نے مولانا بحاث کے سر سے ہمہ دانی کا غرور دور کردیا۔ اس مجلس میں سلطان المشائخ کے خادم خاص خواجہ اقبال بھی تھے انھوں نے اس واقعہ سے متاثر ہوکر حضرت سلطان المشائخ کے سے عرض کیا کہ جمال الدین عالم وفاضل ہیں، شیخ نے فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ انھوں نے سارا واقعہ سنادیا۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ نوجوان کو بلاؤ، چنانچہ شیخ جمال الدین احباب کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے۔ شیخ نے انہیں دیکھ کر فرمایا ''رحمت برآمدن تو کہ علم خودرا نہ فروختی''، تمہارے آنے پر خدا کی رحمت ہو کہ تم نے اپنے علم کو دنیا کے بدلے فروخت نہیں کیا۔

سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوجانے کے بعد علمی مشغلہ قائم نہیں رہا اور اب سارا وقت یاد الٰہی میں گزرنے لگا تھا، سماع سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ (۱)

تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی صاحب گم گشتہ نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار اجودھیا کے

(۱) سیر الاولیاء ص ۳۱۹۔

محلّہ قضیانہ میں قاضی لطف اللہ کی مسجد کے سامنے ہے۔ گری ہوئی عمارتوں اور بنیادوں کے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ وسیع خانقاہ رہی ہوگی۔ (۱) اب یہ آثار بھی مٹ گئے اور ان کی جگہ دوسرے مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''

(۱۰) علامہ کمال الدین اودھی

علامہ کمال الدین حامد بن عبدالرحمٰن بن محمد حنفی اودھی شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے اور اہم خلفاء میں تھے آپ کی ولادت ونشوونما اجودھیا میں ہوئی یہیں کے علماء سے اکتساب علم کیا بعد ازاں دہلی جا کر اپنے ماموں چراغ دہلی سے بیعت ہوئے اور سلوک کے مراحل طے کر کے درجۂ تکمیل وارشاد پر فائز ہوئے۔

علامہ کمال الدین تمام علوم وفنون میں مہارت کا درجہ رکھتے تھے۔ بالخصوص فقہ، اصول فقہ، حدیث اور تفسیر میں تو یگانۂ عصر تھے اور علمی حلقوں میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے۔ شجرۃ الانوار میں ہے۔

> تا ابتدائے جوانی از فنون علمی بہرہ یاب گشتہ وعلم را مرور ایام تمام وکمال ساختہ ہیچ علمے از وباقی نماندہ بود کہ دردے کمالے بہم نرسانیدہ۔ ودر علم تفسیر و فقہ وحدیث حظے وافر داشت۔ درمیان علماء مفسران وفقہاء ومحدثان وغیرہ کہ دراں زماں علم علمی افروشتہ بودند بعلامہ شہرت یافتہ۔ (۲)
>
> نوعمری ہی میں علمی فنون سے بہرہ یاب ہو گئے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ علمی ترقی کرتے رہے اور کوئی فن ایسا باقی نہیں بچا تھا جس میں انھوں نے کمال حاصل نہ کیا ہو بالخصوص تفسیر، فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس عہد کے سر برآوردہ مفسرین، فقہا اور محدثین میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے۔

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۴۷۔

(۲) شجرۃ الانوار بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۰۹۔

اپنے شیخ حضرت چراغ دہلی کی تجویز کے مطابق علامہ کمال نے اپنی علمی سرگرمیوں اور دعوت وارشاد کا مرکز گجرات کو بنایا اور طویل عرصہ تک وہاں مقیم رہ کر علم ودین کی روشنی پھیلاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دیار میں انہیں بڑی مقبولیت عطا کی ہر خاص و عام انہیں عظمت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھتا۔ ۷۲۵ھ کے حدود میں بعہد فیروز شاہ پھر دہلی واپس آ گئے تھے۔ تکملہ سیر الاولیاء میں ہے کہ جس وقت علامہ کمال الدین گجرات سے دہلی آئے تو ان کے ساتھ تیس اونٹ مال واسباب سے لدے ہوئے تھے۔ چراغ دہلیؒ نے اس مال واسباب کو دیکھ کر فرمایا۔ اس قدر دنیا اپنے ساتھ کیوں لائے ہو۔ علامہ نے عرض کیا کہ راستے میں اطلاع مل گئی تھی کہ سلطان المشائخ کی رحلت ہوگئی ہے اور ان کی جگہ آپ سجادۂ مشیخیت پر رونق افروز ہیں اس لئے خیال ہوا کہ اگر خالی ہاتھ جاؤں گا تو لوگ بدگمانیوں میں مبتلا ہوں گے (ورنہ مجھے اس مال واسباب کی کوئی ضرورت نہیں) اب میں اس سارے مال کو علماء وصوفیاء پر تقسیم کردوں گا۔ چنانچہ سارا اثاثہ اللہ کے نام پر بانٹ دیا۔(۱) دہلی ہی میں ۷۵۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

علامہ کمال اگرچہ خود تو دہلی آ گئے تھے مگر اپنی اولاد کو گجرات ہی میں مقیم رہنے کی ہدایت کر آئے تھے تا کہ رشد وہدایت کا جو سلسلہ انھوں نے قائم کیا تھا وہ چلتا رہے۔ چنانچہ ان کی اولاد میں برابر ایسے فرد کامل پیدا ہوتے رہے جنھوں نے علامہ کی مسند دعوت و ارشاد کو سونی نہ ہونے دیا۔ علامہ کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ سراج الدین نے سجادۂ مشیخت کو زینت بخشی یہ بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ فیروز شاہ بہمنی ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا اسی بناء پر اس نے انہیں دکن آنے کی دعوت دی مگر شیخ سراج نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ''حق تعالیٰ مرا در گجرات ہر چہ ضرورت است عطا می فرماید'' اللہ تعالیٰ کی عطا سے یہاں ساری ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں (پھر دکن آنے کی کیا ضرورت ہے)'' ۸۱۷ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

اس کے بعد شیخ سراج کے صاحبزادے شیخ علم الحق مسندِ ارشاد پر بیٹھے۔ ان کی

(۱) تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۵۔

نیک نفسی اور للّٰہیت کا اندازہ صاحب شجرۃ الانوار کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ جو بھی کافر، فاسق اور منکر خدمت میں حاضر ہوتا اور کچھ دیر بیٹھ کر آپ کی باتوں کو سنتا وہ اسی مجلس میں تائب ہو کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو جاتا تھا۔(۱)

شیخ علم الحق کے بعد ان کے بیٹے شیخ راجن سجادہ نشین ہوئے۔ پھر علی الترتیب شیخ جمال الدین عرف جمن، شیخ حسن محمد اور شیخ یحییٰ مدنی نے مسند ارشاد کو رونق بخشی۔ تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں علامہ کمال کی خانقاہ کے صاحب سجادہ شیخ محمود تھے جو علامہ ہی کی اولاد میں سے تھے۔(۲)

علامہ کمال الدین اودھیؒ کے حالات کے لئے شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیاء، تذکرۂ علمائے ہند، حدائقہ حنفیہ، نزہتہ الخواطر ج ۲، مزارات اولیائے دہلی، تاریخ مشائخ چشت وغیرہ دیکھی جائیں۔

(۱۱) شیخ نصیر الدین اودھی (چراغ دہلی)

شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبداللطیف معروف بہ چراغ دہلی کا مولد ومنشا اور آبائی وطن اجودھیا ہی ہے آپ زبردست عالم وفاضل ہونے کے ساتھ اپنے دور کے سرتاج اولیاء تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔

شیخ نصیر الدین محمود، بن یحییٰ، بن عبداللطیف، بن یوسف، بن عبدالرشید، بن سلیمان، بن احمد، بن یوسف، بن محمد، بن شہاب الدین، بن سلطان، بن اسحٰق، بن مسعود، بن عبداللہ، بن واعظ اصغر، بن واعظ اکبر، بن اسحٰق، بن شیخ ابراہیم، بن ادہم بلخی، بن سلیمان بن ناصر، بن حضرت عبداللہ بن عمر فاروق رضی اللہ عنہم۔(۳)

---

(۱) شجرۃ الانوار ص ۲۶ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰۔

(۲) تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰۔

(۳) دہلی کے ۲۲ خواجہ ص ۴۷۔

مگر شیخ ابراہیم ادھم بلخیؒ کے بارے میں ابن اثیر، امام بخاری، ابن حجر عسقلانی، سید مرتضیٰ بگرامی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ عمری نہیں تھے بلکہ تمیمی اور بقول بعض عجلی تھے (تفصیل کے لئے الکامل لابن اثیر جلد ۶، تہذیب التہذیب، اتحاف السعادۃ المتقین شرح احیاء العلوم دیکھی جائیں) اس لئے اس شجرہ نسب پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ نصیر الدین کے دادا شیخ عبداللطیف نے اپنے آبائی وطن یزد سے ہجرت کر کے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر آپ کے والد شیخ یحییٰ نے لاہور کی وطنیت ترک کر کے اجودھیا کو اپنا مسکن بنالیا۔ اجودھیا ہی میں شیخ نصیر الدین کی ولادت ہوئی ابھی عمر کی صرف نو بہاریں دیکھ پائے تھے کہ والد ماجد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ اس لئے والدہ ماجدہ کی زیر نگرانی تعلیم و تحصیل کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتداء سے لے کر ہدایہ تک کی کتابیں مولانا عبدالکریم شیروانی سے پڑھیں۔ اس کے بعد مولانا افتخار الدین محمد گیلانی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ان ہر دو اساتذہ کے علاوہ شیخ فخر الدین ہانسوی، قاضی محی الدین کاشانی اور شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی سے بھی آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے، ۲۵ برس کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔

تعلیمی مشغلہ سے فراغت کے بعد عبادت و ریاضت کا داعیہ پیدا ہوا۔ اس لئے مکان ہی میں عزلت نشین ہو کر ذکر و اوراد میں مشغول رہنے لگے۔ پھر چالیس سال کی عمر میں اجودھیا سے رخت سفر باندھا اور دہلی جا کر حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ بگوش ہو گئے بالآخر حضرت سلطان المشائخ نے اپنی خلافت سے سرفراز فرما کر چراغ دہلی کے لقب سے امتیاز بخشا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایک دن شیخ نصیر الدین نے امیر خردؒ کے ذریعہ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ بندہ اودھ (اجودھیا) میں رہتا ہے لیکن وہاں لوگوں کے ازدحام اور کثرت آمد و رفت کی وجہ سے ذکر و مراقبہ میں خلل پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو کسی جنگل میں تنہا رہ کر یاد حق میں مشغول رہوں، سلطان المشائخ نے امیر خرد سے فرمایا کہ نصیر الدین سے کہہ دو ”ترا درمیان خلق می باید بود و جفائے

خلق می باید کشید و مکافات بہ بذل وعطا می باید کرد۔‘‘ (۱)

تمہیں خلق خدا کے درمیان رہنا اور ان کے جور وستم سہنا چاہئے اور ان کی زیادتیوں کا بدلہ داد ودہش سے دینا چاہئے۔

پیرو مرشد کے اس فرمان پر شیخ نصیر الدین آخر دم تک عمل پیرا رہے اور ہر ظلم وستم وجور وجفا کا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے انہیں طرح طرح سے پریشان کیا اور اذیتیں دیں جس کی کچھ تفصیل سیر الاولیاء میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن دہلی کا یہ روشن چراغ ظلم وجبر کے تیز وتند طوفانوں کی زد میں بیٹھ کر اپنی ضیا پاشیوں سے ظلمت کدۂ ہند کو منور کرتا رہا اور پیرو مرشد نے آپ سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں اپنا خونِ جگر دے کر انہیں پورا کر دکھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ فقر وصبر اور تسلیم ورضا کے پیکر اور مہر ومحبت کے مجسمہ تھے سخت سے سخت ناگوار اور اذیت ناک برتاؤ کو نہ صرف مسکراتے ہوئے برداشت کر لیتے تھے بلکہ اس کے عوض ایثار ومروت اور حسن سلوک کا معاملہ فرماتے تھے۔ آپ کی بلندیٔ اخلاق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ کے مجموعہ ملفوظات خیر المجالس کے تکملہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ، ایک دن بعد نماز ظہر حجرہ میں تنہا بیٹھے تھے موقع پا کر ’’تراب‘‘ نامی ایک قلندر اندر گھس گیا اور نہایت بیدردی کے ساتھ چاقو سے آپ پر وار کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے جسم میں بارہ زخم لگائے مگر آپ نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ جسم سے خون نکل کر نالی کے راستہ باہر بہنے لگا جسے دیکھ کر مریدین گھبرائے اور اندر جا کر دیکھا تو ان کی نگاہوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ یہ بیباک قلندر شیخ کو چاقو سے مار رہا ہے اور شیخ ساکت اور خاموش بیٹھے ہیں۔ مریدین نے اسے پکڑ کر سزا دینی چاہی لیکن شیخ نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی قلندر کو اپنے پاس ہی روک لیا۔ اور اپنے مرید خاص مولانا عبد المقتدر تھانیسری، شیخ صدر الدین طبیب اور خادم خاص و بھانجہ شیخ زین الدین علی کو اپنے پاس بلا کر قسم لی کہ قلندر کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائیں گے پھر قلندر کو بیس تنکہ

(۱) اخبار الاخیار ص ۸۷۔

(اس عہد کا سکہ) یہ کہہ کر عطا فرمایا کہ شاید چاقو مارنے میں ہاتھ کو تکلیف پہنچی ہو۔(۱)

تسلیم و رضا اور مہر و وفا کا یہ تاجدار ۱۸؍رمضان المبارک ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۹ء کو پیوند خاک ہو گیا(۲)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لعین تو نے یہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

حضرت سلطان المشائخ کے دامن سے وابستگی کے بعد اگرچہ اجودھیا سے بود و باش کا تعلق نہیں رہا تھا پھر بھی اس سرزمین سے کسی نہ کسی حد تک رابطہ قائم رہا اور گاہے بہ گاہے اعزاء و اقربا سے ملاقات کے لئے یہاں آتے رہتے تھے۔ غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں۔

صاحب اخبار الاولیاء می فرمایند کہ شیخ نصیر الدین را در خطہ اودھ خواہرے بود از وے کلاں وعفیفۂ زماں او نیز دو پسر داشت یک مولانا زین الدین علی دوم کمال الدین حامد شیخ نصیر الدین گاہ گاہ از حضرت شیخ اجازت گرفتہ برائے زیارت ہمشیرہ مکرمہ در اودھ تشریف بردے و بعد حصول ملاقات وے باز آمدے۔(۳)

اخبار الاولیاء کے مؤلف لکھتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین کی عفت مآب بڑی بہن اجودھیا میں رہتی تھیں ان کے دو صاحبزادے مولانا زین الدین علی اور مولانا کمال الدین حامد تھے (مولانا کمال الدین کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) شیخ نصیر الدین ہمشیرہ کی ملاقات کی غرض سے باجازت حضرت سلطان المشائخ اجودھیا تشریف لاتے اور ملاقات کے بعد پھر دہلی واپس چلے جاتے تھے۔

اجودھیا ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر فاصلے پر جانب مغرب وشمال شیخ نصیر الدین کی ایک ہمشیرہ کا مزار ہے جسے عوام عقیدت واحترام میں ''بڑی بوا'' کا مقبرہ کہتے ہیں۔(۴)

---

(۱) تکملہ خیر المجالس ص ۳۱۴، ۳۱۵۔ (۲) اخبار الاخیار۔

(۳) خزینۃ الاصفیا ص ۳۵۴۔ (۴) گم گشتہ حالاتِ اجودھیا ص ۴۔

لیکن یہ تحقیق نہیں ہوسکی کہ یہ انہیں خواہر کلاں عفیفۂ زماں کا مزار ہے یا کسی دوسری بہن کا البتہ بڑی بوا کے عرفی نام سے ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ یہ انہیں ہمشیرہ کلاں کا مزار ہے جن کی ملاقات کے لئے شیخ دہلی کی طویل مسافت طے کرکے اجودھیا آتے تھے۔ اسی مقبرہ کے قریب اجودھیا اور فیض آباد کے مسلمانوں نے بڑی بوا کے نام سے ایک یتیم خانہ جاری کیا ہے جس میں یتیم بچوں کی تعلیم وتربیت کا مفت انتظام ہے۔

کوشلیا گھاٹ اور محلّہ مدار کے درمیان جو آبادی ہے وہ آج سے پچاس سال پہلے تک محلّہ چراغ دہلی سے موسوم تھی مگر آج کل اسے عالم گنج کٹرہ کہتے ہیں، اسی محلہ میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کا آبائی مکان تھا جسے بعد میں آپ نے شیخ فتح اللہ اودھی کو دے دیا تھا۔ شیخ فتح اللہ اسی مکان میں رہتے تھے اور اسی کے متصل ان کا مزار بھی ہے(۱) تفصیل آگے آرہی ہے۔ شیخ کے تفصیلی تذکرہ کے لئے سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیاء وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱۲) شیخ علاء الدین نیلی صاحب ''مامقیماں''

شیخ علاء الدین نیلی اودھی اپنے وقت کے زبردست عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے، شیخ الاسلام فریدالدین اودھی شافعی کے تلمیذ اور شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی کے رفیق درس تھے، تفسیر کشاف کی تعلیم کے وقت قرأت یہی کرتے تھے۔ شیخ شمس الدین اور دیگر رفقاء درس سامع ہوتے تھے۔

کشاف اور مفتاح العلوم سکاکی کے غوامض کی توضیح وتشریح میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی تقریر انتہائی دل نشیں اور مؤثر ہوتی تھی بڑے بڑے علماء وفضلاء آپ کی تقریر کے دلدادہ تھے۔(۲)

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں شامل

(۱) گم گشتہ حالاتِ اجودھیا ص ۱۳۱۔

(۲) سیر الاولیاء ص ۲۷۵۔

ہو گئے تھے۔اور شیخ کے اہم خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔سلطان المشائخ کی خصوصی مجلسوں میں تصوف کے اسرار ورموز پر بحکم شیخ آپ کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ ہر جمعہ کو آپ کا عمومی وعظ ہوا کرتا تھا جس کی اثر انگیزی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور بعض تو بے ہوش تک ہو جاتے تھے۔ابن بطوطہ اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے کہ میں ایک مرتبہ ان کی مجلس وعظ میں حاضر تھا۔قاری نے قرآن مجید کی آیت "یٰایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلة الساعة شیء عظیم" کی تلاوت کی۔بعد میں مولانا نیلی نے اسی آیت کو پڑھا جسے سن کر مسجد کے گوشہ سے ایک شخص کی چیخ بلند ہوئی۔مولانا نے پھر اسی آیت کی تلاوت کی اس شخص نے دوبارہ چیخ ماری اور اسی کے ساتھ جاں بحق ہو گیا۔ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں اس مرد حق آگاہ کی تجہیز وتکفین اور جنازے میں شریک رہا۔(۱)

مولانا نیلی کے مزاج میں بے پناہ تواضع تھی۔تصوف کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے اور سلطان المشائخ کے اہم ترین خلفاء میں شمار ہونے کے باوجود نہ صوفیانہ خرقہ زیب تن کیا اور نہ مدت العمر کسی کو مرید بنایا۔کہتے تھے کہ اگر حضرت شیخ حیات سے ہوتے تو اس خلافت نامہ کو حضرت کی خدمت میں پیش کر کے مؤدبانہ عرض کرتا کہ حضرت نے اگرچہ ازراہ بندہ نوازی اس عاجز کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا ہے مگر بندہ اپنے اندر اس بار امانت کے اٹھانے کی طاقت نہیں پاتا۔(۲)

آخر میں سلطان المشائخ کے ملفوظات ''فوائد الفواد مرتبہ حسن سجزی'' کا ایک نسخہ دستِ خاص سے لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اور اکثر اوقات اسی کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس ہر علم وفن کی مستند ومعتبر کتابیں موجود ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ صرف ''فوائد الفواد'' ہی کا مطالعہ کرتے ہیں؟ فرمایا سلوک اور دیگر فنون کی کتابوں سے دنیا بھری ہے لیکن سلطان المشائخ کے ملفوظات روح افزا جن سے مری

(۱) نزہۃ الخواطر ج۲۔

(۲) سیر الاولیاء ص۲۷۶۔

نجات وابستہ ہے کہاں ملیں گے۔

مرا نسیم تو باید صبا کجا است کہ نیست　　کجا ست زلف تو مشک خطا کجا است کہ نیست (۱)

بالآخر اپنے عہد کا یہ مرد کامل اور عالم بے بدل حیات مستعار کے دن پورے کر کے ۷۶۲ھ میں رہگرائے عالم جاودانی ہوا۔(۲) اور سلطان المشائخ کے مقبرہ کے احاطہ میں اپنے خواجہ تاش، رفیق درس اور ہم وطن شیخ شمس الدین بن یحییٰ اودھی کے جوار میں ابدی نیند سو رہا ہے (۳)

''گم گشتہ حالات اجودھیا'' اور ''شہر اولیاء'' کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ آپ کا مزار اجودھیا کے مشہور قبرستان ''خرد مکہ'' میں ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس مقبرہ میں شیخ علاء الدین حسینی، ان کے صاحبزادے شیخ ماہ رو اور ان کی اولاد امجاد کی قبریں ہیں۔ نام کی یکسانیت سے یہ اشتباہ ہوا ہے۔

سر دست مولانا نیلی کی صرف ایک تصنیف ''ما مقیماں'' کا پتہ چل سکا ہے۔ ما مقیماں فارسی زبان کی مشہور ترجیع بند مثنوی ہے اور ایک عرصہ تک مدارس کے نصاب درس میں شامل رہی ہے اور اب بھی بعض مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ آپ کے حالات سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیاء، بحر ذخار قلمی، نزہۃ الخواطر ج ۲، تاریخ مشائخ چشت وغیرہ میں مذکور ہیں۔

(۱۳) شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین فریادرس بن نظام الدین اودھی مشہور مشائخ ہند میں ہیں علوم دینیہ کی تحصیل مولانا رفیع الدین اودھی سے کی اور طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہیں سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ بعد میں شیخ اشرف سمنانی

(۱) سیر الاولیاء ص ۲۷۸۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۶۱۔

(۳) سیر الاولیاء ص ۲۷۸۔

کچھوچھوی کی جانب رجوع کیا اور انہیں سے خلافت پائی۔ آپ مخدوم سید اشرف کچھوچھوی کے خلفائے کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ لطائف اشرفی میں ہے کہ شیخ سمنانی فرماتے تھے ''اشرف شمس و شمس اشرف است'' یعنی دونوں حقیقتاً ایک جان اور ظاہراً دو قالب ہیں۔ اس سے شیخ شمس الدین کے درجہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لطائف اشرفی میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ جب مخدوم سمنانی پہلی مرتبہ کچھوچھہ تشریف لائے تو اپنے احباب واصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ ''اجودھیا سے دوست کی خوشبو آرہی ہے'' کچھ عرصہ کے بعد آپ اجودھیا کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر حسب عادت ایک مسجد میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی آمد کی خبر پاکر شہر کے علماء وا کابر خدمت میں حاضر ہوئے، ان حاضرین میں شمس الدین نامی ایک نوجوان بھی تھا جو علوم دینیہ کی تکمیل کر چکا تھا۔ اور اب کسی شیخ کامل کی اسے ضرورت تھی مخدوم سمنانی نے اس نوجوان کو دیکھتے ہی فرمایا شمس الدین میں تمہاری تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ (۱)

الحاصل انہیں بیعت کر کے اوراد و وظائف کی تلقین کی اور خلوت میں بیٹھنے کا حکم دیا شیخ شمس الدین نے مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور شیخ کی توجہ خاص کی بدولت سلوک کے مراحل بہت جلد طے کر لئے، تکمیل کے بعد شیخ نے اپنی خلافت سے نوازا۔ اس عرصہ میں شیخ سمنانی اجودھیا ہی میں مقیم رہے۔ شیخ شمس الدین کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے بعد یہاں سے روانہ ہوئے اور سدھور، لکھنؤ، جائس ہوتے ہوئے کچھوچھہ واپس آگئے۔

شیخ سمنانی کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اجودھیا کے منصب دار ''سیف اللہ خاں'' اپنے ندیموں کے ساتھ کچھوچھہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپ کی بزرگی وجلالت شان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی سفر میں آپ سے بیعت ہوگئے۔ کچھ دن خانقاہ میں قیام کے بعد جب واپس جانے لگے تو شیخ سے درخواست کی کہ اہلِ اجودھیا کی اصلاح کے لئے آپ کی دعوت وارشاد کا ایک مرکز خود اجودھیا میں بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ

(۱) سیرت اشرف ص ۳۰۔

ان کے اصرار پر شیخ سمنانی نے ایک خانقاہ اجودھیا میں بھی قائم کی اور اپنے محبوب و مراد خلیفہ شیخ شمس الدین کو اپنا جانشین بنا کر اہل اجودھیا کی اصلاح و تربیت کی خدمت ان کے سپرد کی۔ شیخ شمس الدین اسی خانقاہ میں بیٹھ کر زندگی بھر تہذیب اخلاق، وتزکیۂ نفوس کی اہم ترین خدمت انجام دیتے رہے۔(۱)

قلب کی طہارت اور روح کی پاکیزگی نے شیخ شمس کی دعاؤں میں ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ جس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے آگے دستِ دعا دراز کرتے خدائے قاضی الحاجات اسے پورا کر دیا کرتا تھا اپنی اسی خصوصیت کی بناء پر عوام وخواص میں ''فریادرس'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ صاحب بحر ذخار شیخ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''شیخ شمس الدین فریادرس کے لقب سے مشہور ہوئے ان کا مزار اجودھیا میں مرجع خلائق ہے۔''

حسب تحقیق مولوی عبدالکریم اودھی چمنستان اجودھیا کا یہ گل تازہ اپنے شیخ مرشد کی حیات ہی میں ۷/محرم ۷۹۰ھ یوم جمعہ کو اس جہان خزاں آباد کو الوداع کہہ کر راہیٔ باغ رضوان ہوا۔(۲)

لیکن مولانا عبدالحی حسنی کے اس جملہ ''تصدّر للارشاد بعدہ''یعنی مخدوم سمنانی کے بعد مسند ارشاد کے صدر نشیں ہوئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مخدوم سمنانی کے بعد نہ صرف حیات رہے بلکہ ان کی اصلاحی سرگرمیاں حضرت مخدوم کی وفات کے بعد ہی بام عروج پر پہنچیں۔ واللہ اعلم۔

آپ کا مزار محلّہ بکسر ٹولہ اجودھیا میں ایٹوا تالاب (موجودہ ستیہ ساگر) کے گوشۂ شمال مغرب بلندی پر واقع ہے۔ اب سے پچاس سال پہلے مزار کے چاروں سمت پختہ چہار دیواری تھی مگر امتدادِ زمانہ اور شکست وریخت کی مرمت نہ ہونے کی وجہ سے مغربی دیوار زمیں بوس ہو گئی ہے اور بقیہ تین جانب کی دیواریں بھی نہایت خستہ و بوسیدہ ہو گئی ہیں اگر انہیں اسی حال میں چھوڑ دیا گیا تو وہ بھی چند سالوں میں بے نام ونشان ہو جائیں گی۔

(۱) سیرت اشرف ص ۳۴۔ (۲) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۰۔

گم شدہ حالات اجودھیا کے مصنف کا بیان ہے کہ مقبرہ کی مرمت اور اس کے دیگر مصارف کے واسطے سلاطین دہلی نے ستر بیگھہ آراضی بطور معافی دی تھی مگر جن صاحب کے نام سند معافی تھی ان کی ناخلف اولاد نے نہ صرف مقبرہ کی اس معافی کو اپنی ذاتی جاگیر بنالیا بلکہ مزار کے احاطہ میں مولسری وغیرہ کے جو پُرانے درخت تھے انہیں بھی بیراگیوں کے ہاتھ فروخت کردیا اور قیمت ذاتی مصارف میں خرچ کر ڈالی انہیں لوگوں کے استحصال سے آج مقبرہ بالکل ویران ہے۔(۱)

بہ تربت ماتمی ہے ان حجازی شہ سواروں کی ‏ ‏ ‏ مسلمانوں نے مٹی بیچ لی جنکے مزاروں کی

شیخ شمس الدین نے اپنے پیچھے مرید و مسترشدین کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ تین صاحبزادے چھوڑے۔ شیخ بدیع الدین جن کی نسل سے موضع کولا ضلع فیض آباد کے شیوخ ہیں۔ دوسرے شیخ جہانگیر ان کے صاحبزادے شیخ علاء الدین تھے، جن کے نام پر موضع علاء الدین پور ضلع فیض آباد آباد ہوا۔ یہیں شیخ علاء الدین کی اولاد بھی ہے اور مزار بھی۔ تیسرے صاحبزادے شیخ احمد تھے جن کے متعلق کچھ صحیح تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۴) شیخ فتح اللہ اودھی

شیخ فتح اللہ بن نظام الدین اپنے عہد کے زبردست عالم اور بلند پایہ شیخ تھے۔ نحو، فقہ، اصول فقہ میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کا آبائی وطن بدایوں تھا۔ تحصیل علم کی غرض سے دہلی گئے اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی سرپرستی میں اساتذۂ دہلی سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مسند درس وافادہ کو زینت بخشی اور طویل عرصہ تک جامع مسجد دہلی متصل مینارہ شمسی (قطب مینار) میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، بعد ازاں حضرت چراغ دہلی کے خلیفۂ خاص شیخ صدر الدین احمد حکیم دلہا متوفی ۷۵۹ھ سے بیعت ہوکر مجاہدۂ و ریاضت میں لگ گئے ساتھ ہی تدریسی مشغلہ بھی جاری رہا۔ لیکن مجاہدۂ بسیار و ریاضت شاقہ کے باوجود دل کی گرہیں نہ کھلیں اور سوز دروں

(۱) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۹۔

کی جو کیفیت حاصل ہونی چاہئے تھی وہ میسر نہ ہوئی۔تو شیخ سے عرض حال کی پیر ومرشد حکیم دلہانے فرمایا تدریسی سلسلہ بند کردیں اور کتابوں کو اپنے پاس سے علاحدہ کردیں۔ چنانچہ پیر روشن ضمیر کی تجویز کے مطابق درس کو موقوف کردیا اور چند اہم وپسندیدہ کتابوں کے علاوہ پورا اپنا کتب خانہ دوسروں کے حوالہ کردیا پھر بھی قلب معرفت کی چاشنی سے نا آشنا ہی رہا۔ شیخ سے دوبارہ رجوع کیا۔ انھوں نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال سے بالکلیہ انقطاع نہیں ہوا ہے۔ "العلم حجاب الاکبر" جب تک یہ پردہ درمیان میں حائل ہے معرفت کی روشنی قلب تک نہیں پہنچ سکتی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شیخ فتح اللہ ان عمدہ کتابوں کو جنھیں حرز جان بنائے ہوئے تھے ان کے ایک ایک جز کو الگ کرکے پانی کے کنارے بیٹھے انہیں دُھل رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ ''اورا دیدند کہ برلب آب نشست اجزا را می شست وآب از چشم اومی رفت'' بالآخر لوحِ دل ماسوی اللہ کے نقش سے بالکل صاف ہوگئی، نورِ معرفت سے سینہ جگمگا اٹھا اور حضرت حکیم دلہانے خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا۔

مقام ارشاد پر فائز ہونے کے بعد حضرت چراغ دہلی اور اپنے پیر ومرشد کے منشاء سے اجودھیا تشریف لائے اور حضرت چراغ دہلی کے آبائی مکان میں فروکش ہوئے جسے حضرت چراغ دہلی نے انکی تحویل میں دے دیا تھا۔ شیخ فتح اللہ زندگی کے آخری لمحے تک اسی میں رہے جو رہائش کا بھی کام دیتا تھا اور بندگان خدا کی اصلاح وتربیت کیلئے خانقاہ کا بھی۔

شیخ فتح اللہ کا ہندوستان کے مشائخ کبار میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے فیض تربیت سے ہزاروں گم کردہ راہ صراط مستقیم سے آشنا ہوئے۔ شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری، شیخ سعد الدین اودھی، شیخ قاسم اودھی، شیخ درویش اودھی جیسے بلند مرتبہ مشائخ چشت ان کے دامن تربیت سے وابستہ اور مرید وخلیفہ تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں ''از کاملین وقت گشت و ہزارہا طالبان حق را بحق رسایند چنانچہ شیخ قاسم دہلوی (اودھی) از خلفائے وے است ونیز شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری مرید وخلیفہ او بود'' (۱) مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی

(۱) خزینۃ الاصفیاء ص ۳۸۰ ج ۱۔

۸۳۷ھ بھی شیخ اودھی کی خدمت میں بغرض بیعت اجودھیا حاضر ہوئے تھے۔ لیکن شیخ ردولوی مشرب عشق ومحبت کے دلدادہ تھے اور شیخ فتح کی روش زہد وفقر اور تسلیم ورضا کی تھی اس لئے مناسبت پیدا نہ ہوسکی(۱) اسی موقع پر شیخ ردولوی نے اجودھیا میں کئی ماہ کا قیام کر کے چلہ کشی کی تھی۔

شیخ فتح اللہ جب دہلی سے رخصت ہوکر اجودھیا کے لئے عازم سفر ہوئے تو ان کے شیخ حضرت طبیب دلہا نے اپنے دو صاحبزادوں شیخ یحییٰ اور شیخ نور کو بغرض تعلیم وتربیت ان کے حوالہ کر دیا تھا۔ شیخ اودھی نے دونوں مخدوم زادوں کو علوم ظاہر وباطن سے آراستہ کر کے بغرض دعوت وتبلیغ اجودھیا سے جانب مشرق تقریباً ۳۰-۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر بھیج دیا جہاں پہنچ کر ان دونوں حضرات نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ مقام آج کل ''اونچا گاؤں'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میں دونوں حضرات کے مزارات ہیں اور ان کی اولاد اب بھی یہاں موجود ہے۔ مولانا عزیز احمد قاسمیؒ بی، اے استاذ دارالعلوم دیوبند اسی اونچا گاؤں کے رہنے والے اور شیخ یحییٰ کی نسل سے تھے مولانا موصوف کا شجرۂ نسب شیخ صدرالدین حکیم دلہا تک یہ ہے۔

مولانا عزیز احمد، بن محمد فاروق، بن الٰہی بخش، بن محمد اشرف، بن راحت علی، بن عباداللہ، بن خدا بخش، بن محمد ہادی، بن محمد زاہد، بن اللہ دیا، بن ابوبکر، بن عبدالملک، بن مخدوم یحییٰ، بن شیخ صدرالدین حکیم دلہا۔(۲)

۲۶؍ربیع الاول ۸۲۱ھ کو شیخ فتح اللہ کا وصال ہوا، مزار اجودھیا میں ہے۔(۳)

مکاتب شیخ فتح اللہ کے نام سے آپ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ کسی مرید نے جمع کیا تھا جو شائع بھی ہوا تھا مگر اس وقت نایاب ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بعض مکاتیب کے اجزا اخبار الاخیار میں نقل کئے ہیں۔

---

(۱) اخبار الاخیار ص۱۹۴-۱۹۵۔

(۲) از خاندانی شجرہ مولانا عزیز احمد قاسمی۔

(۳) نزہۃ الخواطر ج۳ ص۱۲/۱۳۔

شیخ اودھی کا مقبرہ محلّہ چراغ دہلی (موجودہ عالم گنج کٹرا) اجودھیا میں خود انہی کی خانقاہ کے احاطہ میں ہے۔ مزار آج بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے، مزار اور خانقاہ کی مرمت حسب تصریح صاحب گم گشتہ حالاتِ اجودھیا اب تک تین بار ہو چکی ہے، سب سے پہلے واجد علی ناظم اودھ نے اس کی شکست وریخت کو درست کرایا۔ کچھ دنوں کے بعد خانقاہ کا ایک حصہ گر گیا تو شیخ رمضان علی تاجر فیض آباد نے اس کی مرمت کرائی اور گرے ہوئے حصہ کو ازسرنو تعمیر کرادیا پھر تیسری بار ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶÷ میں خواجہ برکات اللہ اعظم گڈھی نے مرمت کرائی اور خانقاہ ومزار کے اردگرد چہار دیواری قائم کردی۔ اور خانقاہ کی مسجد کی مرمت ڈیڑھ صدی قبل سید محمد بخش کرنالی رسالہ دار نے کرائی تھی اس کے ایک عرصہ کے بعد رسالہ دار موصوف کے برادر زادہ سید جعفر کرنالی نے دوبارہ اس کی اصلاح ومرمت کرائی۔

خانقاہ کے احاطہ کی مشرقی دیوار کے متصل آپ کے خلیفۂ خاص شیخ قاسم اودھی کا مدفن ہے، شیخ قاسم بن برہان الدین دہلوی اودھی عالم وفقیہ اور ولیٔ کامل تھے۔ سلوک کی تحصیل پہلے اپنے والد شیخ برہان الدین سے کی پھر شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور انہیں کی رہنمائی میں طریقت کی راہیں طے کرکے درجہ ارشاد وتلقین کو پہنچے۔ (۱)

(۱۵) شیخ سعد اللہ اودھی

شیخ سعد اللہ اودھی کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔ ممکن ہے مرأۃ الاسرار یا بحر ذخار میں ان کا تذکرہ اور تفصیلی حالات ہوں۔ مگر اس وقت یہ کتابیں پیش نظر نہیں ہیں۔ مولانا عبدالحئ حسنی نے شیخ محمد بن قاسم (المعروف بہ شیخ درویش) کے تذکرہ میں ضمناً گلزارِ ابرار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ شیخ فتح اللہ اودھی کے خلیفہ تھے (۲) تذکرۃ العابدین کے مصنف لکھتے ہیں کہ ''آپ خلیفہ شیخ فتح اللہ اودھی کے ہیں۔ آپ بہت بڑے مشائخِ طریقت تھے

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۹۔

(۲) نزہۃ ج ۳ ص ۱۴۵/ ۱۴۶۔

مگر اپنا حال ہمیشہ پوشیدہ رکھا۔ کسی پر یہ ظاہر نہ ہوا کہ آپ کا کیا حال اور طریق ہے۔ وفات آپ کی ۱۷/ ذی قعدہ ۸۵۰ھ میں ہوئی اور مزار اودھ میں ہے۔ بلفظہٖ (۱)

(۱۶) شیخ جمال گوجری

شیخ جمال الدین گوجری اودھی عظیم المرتبت، صاحب نسبت اور بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے۔ پانچ واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب شیخ نجم الدین کبریٰ سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اپنے زہد وورع، مجاہدہ وریاضت اور کریم النفسی وشفقت علی الخلق کی بناء پر شیخ الاولیاء کے لقب سے مشہور تھے (۲) شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ فرماتے ہیں ''از بھکر تا پنڈوہ مسافرت کردم باہیچ مسلمانے ملاقات نہ شد اِلاّ در اودھ یک بچہ دیدم واشارت بشیخ جمال گوجر کرد'' (۳) بھکر سے پنڈوہ تک سفر کیا مگر کسی (کامل) مسلمان سے ملاقات نہیں ہوئی البتہ اودھ میں ایک شخص جمال گوجر کو دیکھا۔

شیخ جمال سلسلۂ فردوسیہ کے مشہور و بلند پایہ بزرگ شیخ مظفر بلخی متوفی ۸۰۳ھ کے مرید وخلیفہ تھے اور انھیں کے حسب منشاء اجودھیا میں سکونت پذیر تھے حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں شیخ احمد عبدالحق ردولوی بھی اجودھیا میں اقامت گزیں تھے۔ ان بزرگوں کے اجتماع سے اجودھیا دارالاولیاء بن گیا تھا۔ مفتی غلام مسرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ جمال گوجر شیخ ردولوی کی مجلس کے حاضر باش اور ان کے دامِ محبت میں گرفتار تھے۔ محدث دہلوی بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ احمد ردولوی اجودھیا میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ ایک کتیا بھی تھی۔ اس نے جب بچہ جنا تو شیخ نے اس کی تقریب میں تمام اعیان واکابر اور امراء شہر کی دعوت کی لیکن شیخ جمال گوجر کو مدعو نہیں کیا۔ انھیں شیخ کی اس بے اعتنائی پر حیرت ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن ان سے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ کل کی دعوت میں آنجناب بندہ

(۱) تذکرۃ العابدین ص۱۰۲۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۲۱۔

(۳) اخبار الاخیار۔

کو بھول گئے۔ شیخ ردولوی نے یہ سن کر فرمایا: جمال الدین میز بانئ سگ بود، سگاں را طلبید یم کہ ''الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب'' تو از جملۂ آدمیانی ترا چوں طلبم'' (۱) جمال الدین یہ تو کتے کی میز بانی تھی اس لئے کتوں کو دعوت دی گئی کیونکہ (حسب ارشاد نبی پاکؐ) دنیا مُردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں تم تو ایک آدمی ہو اس میں تمہیں کیسے مدعو کر سکتا تھا۔

شفقت علی الحق کے جذبہ سے شیخ جمال بسا اوقات کھچڑی کی دیگ تیار کرا کے خود اپنے سر پر لئے اجودھیا کے گلی کوچے میں گھومتے پھرتے جہاں کہیں کوئی بھوکا مل جاتا اسے وہ کھچڑی دیدیتے۔ ایک دن حسبِ عادت شیخ جمال کھچڑی کی ایک دیگ سر پر لئے کسی اور طرف جانے کے بجائے اتفاقاً سید سلطان موسیٰ عاشقان کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ اور دیگ شیخ عاشقان کے آگے رکھ دی، اس وقت ان کے یہاں تین دن سے فاقہ چل رہا تھا۔ شیخ جمال کی بروقت اس پیش کش پر سید عاشقان بیحد ممنوع ہوئے اور جزاک اللہ کہتے ہوئے فرمایا ''جمال تو دیگِ طعام (برنگِ گوجراں کہ سبوے شیر برسر گرفتہ می فروشند) گرفتہ می گردی لیکن بہ بہائے عشق می فروشی'' اے جمال تم گوجروں کی طرح (جو دودھ کی ٹھلیا سر پر رکھے بیچتے پھرتے ہیں) کھانے کی دیگ سر پر لئے گھومتے ہو لیکن (سچ تو یہ ہے کہ اسے) عشق ومحبت کی قیمت کے عوض فروخت کرتے ہو۔ کہتے ہیں کہ اسی دن سے شیخ جمال گوجر کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ اور پھر اسے اتنی شہرت ہوئی کہ نام کا جزو بن گیا۔ آپ کی فوات ۸۵۸ھ میں ہوئی (۲)

مزار محلّہ بکسریا ٹولہ اجودھیا میں ایک احاطہ کے اندر تھا مگر عرصہ ہوا احاطہ کی دیواریں گر کر بے نشان ہوگئی ہیں۔ البتہ کچھ شکستہ قبریں اب بھی موجود ہیں جن میں سے ایک کے بارے میں اجودھیا کے لوگ کہتے ہیں کہ یہی شیخ جمال اولیاء کا مدفن ہے۔ (۳) واللہ اعلم۔ صاحبِ گم گشتہ حالات اجودھیا و مرتب شہر اولیاء دونوں نے مزار جمال اولیاء

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۱۹۶۔

(۲) خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۲۱۔

(۳) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۲ و شہر اولیاء ص ۲۱۵۔

کے عنوان سے اوپر کی تفصیلات تحریر کی ہیں لیکن یہی دونوں حضرات دوبارہ اپنی کتابوں میں مزار جمال گوجری کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں ''شاہ مظفر کی مسجد سے دکھن جانب حضرت شاہ جمال گوجری کا مزار ہے۔گم گشتہ ص ۳۹ وشہر اولیاء ص ۲۵۲ جبکہ جمالِ اولیاء اور جمال گوجری دونوں ایک ہی بزرگ ہیں جیسا کہ خود صاحبِ گم گشتہ کی بیان کردہ تفصیلات سے بھی ظاہر ہے۔ان دونوں حضرات کی یہ تحریریں دیکھ کر بے ساختہ نوکِ قلم پر غالب کا یہ مصرعہ آ گیا'' یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے''

صاحبِ گم گشتہ نے شیخ جمال کے چار خلفاء کا نام ذکر کیا ہے۔ مولانا کمال[۱] الدین جو شیخ جمال کے برادر خرد تھے۔ان کا مزار شیخ جمال کے مزار کے متصل ہے۔شاہ[۲] جانی، شاہ درویش[۳]۔ان دونوں بزرگوں کا مرقد اترولہ ضلع گونڈہ میں ہے۔اور چوتھے مولانا عبدالکریم اودھی جن کا مقبرہ محلّہ قضیانہ اجودھیا میں ہے،مزار کے گرد پختہ چہار دیواری تھی،مگر عرصہ ہوا اسی محلّہ کے ایک عاقبت فراموش نے (اس دعویٰ سے کہ میرے دادا نے ان دیواروں کو تعمیر کیا تھا) انھیں توڑ کر ساری اینٹیں فروخت کر دیں۔(۱)

''بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کا مدفن تم ہو''

(۱۷) شیخ سید سلطان موسیٰ عاشقان

سیّد سلطان موسیٰ عاشقان، شیخ حاجی صدرالدین چراغ ہند متوفی ۷۹۵ھ کے مرید و خلیفہ تھے۔انھیں کے ہمراہ ملتان سے ظفر آباد (جون پور) آئے،اور پھر وہاں سے شیخ کے حکم سے اجودھیا میں سکونت پذیر ہو گئے تھے،اجودھیا میں جس جگہ آپ کی رہائش تھی وہ محلّہ سیّد واڑہ کے نام سے مشہور ہے۔ افسوس کہ سیّد عاشقان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔صاحب تاریخ شیرازِ ہند نے بحوالہ مرأۃ الاسرار جو کچھ لکھا ہے انھیں کے الفاظ میں وہ تفصیلات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

''آپ درویش اہلِ دل اور تنہائی پسند تھے حضرت مخدوم چراغِ ہند سے بیعت تھی۔

(۱) گم گشتہ ص ۱۲۔

اور آپ ہی کے ہمراہ بسلسلۂ جہاد (دعوت وتبلیغ) ظفرآباد تشریف لائے تھے۔ ریاضت ومجاہدات میں محنت شاقہ برداشت فرمائی تھی۔ جب آپ کو مقام قطبیت حاصل ہوگیا تو بحکم پیرومرشد ولایت ملک اودھ آپ کو عطا کی گئی۔ آپ نے وہیں قیام فرمایا۔لباس میں محض ستر عورت کا اہتمام کرتے زیادہ تر ننگے سر رہتے تھے۔کبھی کبھی جذب اور وجد کی کیفیت طاری رہتی۔ہجوم کو ناپسند کرتے اور تنہائی سے وحشت ہوتی،صدہا فقراء ومساکین آپ کی خانقاہ میں رہتے تھے لنگر خانہ جاری تھا۔(۱)

گم گشتہ حالات اجودھیا میں تاریخ وفات ۸/صفر لکھی ہے مگر سن ندارد ہے۔ پہلے عرس بھی ہوتا تھا۔سیّد عاشقان کے تین صاحبزادے تھے۔ایک صاحبزادہ کی اولاد قصبہ سیدن پور ردولی میں اب بھی موجود ہے۔دوسرے صاحبزادہ نے موضع ملہار پور کلاں ضلع جون پور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ان کی اولاد بھی اب تک اس موضع میں مقیم ہے۔ بڑے صاحبزادے جو والد بزرگوار کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے اجودھیا ہی میں مقیم رہے۔ان کے سلسلۂ نسب سے ایک بزرگ سیّد سلطان علی عرف سیّد سلطان بخش تھے جو نہایت متوکل اور صبر ورضا کے مالک تھے۔اکثر خانہ نشیں رہتے تھے۔اگر کبھی گھر سے باہر نکلتے تو اولیائے کرام کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے ضرور جاتے۔۷۵ سال کی عمر میں ۱۲۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔اور اپنے آباء واجداد کے مقبرہ میں دفن ہوئے(۲)

شہر اولیاء میں شیخ عاشقاں کے مزار کی نشاندہی اور اس کی موجودہ کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

''گوکل پھول مندر کے پاس سے ایک کچا راستہ دکھن سمت گیا ہے جو آگے جاکر فیض آباد اجودھیا روڈ کے سامنے ختم ہوجاتا ہے۔اس کے راستے پر دکھن جانب تقریباً سو سوا سو میٹر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ ایک قطعہ اراضی نظر آئے گی جس میں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔اسی قطعۂ اراضی میں عام راستہ سے ۲۰، ۲۵ قدم ہٹ کر قدرے اونچے

(۱) تاریخ شیراز ہند ص ۱۹۱ از سید اقبال جونپوری طبع قدیم۔
(۲) گم گشتہ ص ۵۰۔

ایک چبوترے پر چند دوسری قبروں کے ساتھ سید سلطان موسیٰ عاشقاں صاحب کا مزار ہے۔مزار کے پاس کافی گندگی ہے اور کوڑا کباڑ کا انبار ہے۔(۱)

فاعتبروا یااولی الابصار

(۱۸) قاضی شہابُ الدین اودھی

قاضی شہابُ الدین مداری اودھی المقلب بہ پرکالۂ آتش، قاضی قدوۃ الدین اسرائیلی کی اولاد میں تھے۔علومِ دینیہ بالخصوص فقہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے اور اودھ کے قاضی تھے۔ ہندوستان کے مشہور صوفی شیخ بدیع الدین مدار متوفی ۸۴۰ھ جس وقت کالپی سے جونپور جارہے تھے اسی سفر میں قاضی شہابُ الدین ان کی زیارت سے مشرف ہوئے۔اور پہلی ہی ملاقات میں شیخ مدار سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیعت ہوکر ان کے حلقۂ خدّام میں شامل ہوگئے۔(۲)

پھر پیرومرشد کی محبت کا ایسا غلبہ ہوا کہ علمی مشغلہ ترک ہوگیا، تمام کتابوں کو دریابرد کردیا اور منصبِ قضا سے بھی دست بردار ہوگئے۔شیخ مدار کی خدمت یا ذکر ومراقبہ بس یہی زندگی کا مشغلہ رہ گیا۔(۳) شیخ مدار سے اس درجہ تعلق ہوگیا تھا کہ سفر وحضر کسی وقت بھی ان کی صحبت سے جدائی گوارا نہیں تھی۔شیخ مدار کو بھی ان سے انس خاص تھا اور زیادہ تر خدمت انھیں سے لیتے تھے۔ چنانچہ شیخ مینا لکھنوی متوفی ۸۷۰ھ کو شاہ مدار نے اپنا مصلیٰ قاضی شہابُ الدین پرکالۂ آتش ہی کے ذریعہ سے بھیجا تھا(۴)

الحاصل پیر ومرشد کی توجہ خاص سے درجۂ تکمیل کو پہنچ کر خلافت سے مشرف ہوئے۔شیخ مدار کے کل ستر (۷۰) خلفاء تھے جن میں قاضی سیّد اجمل بہرائچی، مولانا حسام الدین ملامتی جون پوری، مولانا محمد جہندہ بدایونی، قاضی محمود کشوری، اور شیخ

---

(۱) شہر اولیاء ص ۲۶۵ ڈاکٹر دبیر فیض آبادی۔
(۲) انتصاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۹۶۔
(۳) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۸۷۔
(۴) انتصاح عن ذکر اہلِ الصلاح ص ۹۶۔

شہابُ الدین پر کالۂ آتش اجلّ خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔(۱)

پر کالۂ آتش لقب سے متعلق مولانا عبدالحیٔ حسنی لکھتے ہیں ”لقبه الناس لذكاوته پر كالۂ آتش“ ان کے ذہن ثاقب کی بناء پر لوگوں نے انھیں پر کالۂ آتش کا لقب دیدیا تھا۔(۲) بعض لوگوں نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ”حرارت شوق الٰہی چناں غالب می بود کہ از آتش انفاس خود مرغ می پخت واز کثرتِ جلال خلق اورا پر کالۂ آتش می گفت“،عشقِ الٰہی کی حرارت اس قدر تیز تھی کہ سانس کی گرمی سے چڑیا پک جاتی تھی۔اور کثرتِ جلال کی وجہ سے لوگ انھیں پر کالۂ آتش کہتے تھے۔واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

سنِ وفات معلوم نہ ہوسکا ان کے شیخ ومرشد مخدوم مدار کی وفات ۸۴۰ھ میں ہوئی ہے، اس لئے اندازہ ہے کہ خود ان کی وفات نویں صدی ہجری کے آخر میں ہوئی ہوگی۔ مقبرہ موضع جملائی میں ہے جسے اب بڑا گاؤں کہتے ہیں، جو اجودھیا سے ۲۰، ۲۵ کلومیٹر بر جانبِ مغرب واقع ہے اور معمولی درجے کا ریلوے اسٹیشن ہے جس پر صرف پسنجر گاڑیاں رُکتی ہیں۔

شیخ بدیع الدین مدار کے اجودھیا میں ایک خلیفہ اور بھی تھے جو شیخ جودھن مداری اودھی کے نام سے مشہور تھے۔صاحب انتصاح نے شیخ مدار کے خلفاء کی فہرست میں لکھا ہے ”وحضرت شاہ جودھن کہ در شہر اودھ مسکن گرفتہ“ اور شاہ جودھن جو شہر اجودھیا میں مدفون ہیں۔لیکن ان کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے اور نہ مقبرہ کی نشاندہی ہوسکی کہ کس محلے میں تھا۔اجودھیا میں شاہ مدار نام سے ایک محلّہ ہے، ممکن ہے ان کا قیام اسی جگہ رہا ہو جس کی مناسبت سے یہ نام پڑ گیا ہو۔

(۱۹) شیخ محمد درویش اودھی

آپ کا نام نامی محمد اور لقب درویش ہے والد ماجد کا اسم گرامی قاسم بن برہان

(۱) تذکرۃ المصنّفین ج۲ص۴۵ مع زیادہ۔

(۲) نزہۃ ج۳ص۸۷۔

الدین اودھی ہے۔ صاحبِ نزہۃ نے آپ کے تذکرہ کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے ”الشیخ الصالح الفقیہ محمد بن قاسم بن برھان الدین اودھی احد المشائخ المشھورین“ شیخ، صالح، فقیہ محمد بن قاسم بن برہان الدین اودھی مشہور مشائخ میں سے تھے۔ تذکرۃ الرشید ص ۸۶ میں شیخ درویش بن محمد قاسم درج ہے جو صحیح نہیں ہے۔ احدالمشائخ المشہورین میں ہونے کے باوجود آپ کا تفصیلی تذکرہ دستیاب نہیں ہے، خود نزہۃ میں صرف چار پانچ سطریں آپ کے بارے میں ہیں۔ اسی طرح شیخ یٰسین بنارسی متوفی ۱۰۷۶ھ نے مناقب العارفین میں شیخ محمد بن عیسیٰ بن تاج الدین جونپوری متوفی ۸۷۰ھ کے خلفاء کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ درویش کا ذکر کیا ہے مگر درج ذیل چند جملوں کے اور کچھ نہیں لکھا ہے۔ ”واز جملۂ خلفاءِ حضرت مخدوم درویش قاسم اودھی است بسیار بزرگ بود شیخ عبدالقدوس گنگوہی را از ایشاں جامۂ خلافت رسید(۱) اور منجملہ خلفاء کے حضرت مخدوم درویش بن قاسم اودھی ہیں۔ بہت بڑے بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو ان سے جامۂ خلافت ملا ہے۔

تذکرۃ العابدین میں یہ چند سطریں ہیں ”آپ خلیفہ شیخ سعد اللہ کے اور پیر حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے ہیں۔ آپ بہت بڑے عالم بہ علوم ظاہری و باطنی ومقبول و عاشقِ خدا تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر ریاضت ومجاہدہ میں صرف کی اور جابجا مشائخ کی خدمت میں گئے اور کئی طریق سے سلسلۂ طریقت حاصل کیا اور مخلوقِ خدا کو فیض یاب کیا(۲)

صاحبِ تذکرۃ العابدین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ درویش کو اپنے عہد کے بہت سے مشائخ سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ راقم الحروف کو تلاش وجستجو کے بعد چھ ایسے مشائخ کا علم ہوا جن سے آپ نے اخذ فیض کیا اور خلافت پائی۔ تفصیل اس طرح ہے۔ (۱) اپنے والد محترم شیخ قاسم اودھی (۲) شیخ سعدالدین اودھی (۳) شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری، یہ تینوں بزرگ شیخ فتح اللہ اودھی کے مرید وخلیفہ تھے۔ ان تینوں مشائخ سے

---

(۱) مناقب العارفین قلمی ص ۱۵۔

(۲) تذکرۃ العابدین ص ۱۰۳۔

واسطہ کے بغیر براہِ راست (۴) شیخ فتح اللہ سے بھی آپ کو خلافت حاصل تھی چنانچہ مولانا عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں "قال المندوی فی گلزار ابرار انه اخذ الطریقة الچشتیة عن والده وعن الشیخ سعد الدین اودهی کلاهما عن الشیخ فتح اللّٰه. واخذ عن الشیخ فتح اللّٰه بلا واسطة(۱)

صاحبِ گلزار ابرار کا بیان ہے کہ شیخ درویش نے طریقۂ چشتیہ اپنے والد اور شیخ سعدالدین اودھی خلیفہ شیخ فتح اللہ سے حاصل کیا۔ اور خود شیخ فتح اللہ سے بغیر واسطہ کے بھی اخذ فیض کیا۔ (۵) شیخ میاں بن حکیم اودھی خلیفہ سید صدرالدین اودھی سلسلۂ چشتیہ کے ان پانچوں مشائخ کے علاوہ سلسلۂ مداریہ سہروردیہ میں (۶) شیخ بدھن بہرائچی خلیفہ شیخ اجمل بہرائچی سے بھی خلافت یافتہ تھے۔ اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ ان تمام سلسلوں میں شیخ درویش کے مجاز و خلیفہ تھے۔ مناقبُ العارفین میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی شیخ درویش کی خدمت میں حاضری اور پھر شیخ سے ان کی گرویدگی کا بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

پہلے پہل جب مولانا عبدالقدوس شیخ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو گدڑی پوش تھے۔ شیخ نے انھیں اس لباس میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو اس لباس میں دیکھ کر اگر کوئی یہ کہے کہ یہ درویش جا رہا ہے، تو یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچے گی یا نہیں؟ مولانا نے جواب دیا ہاں پہنچے گی۔ شیخ نے فرمایا کانوں سے گزر کر دل تک جائے گی؟ مولانا نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ شیخ نے پھر سوال کیا کہ دل اس بات کی طرف متوجہ ہوگا یا نہیں؟ مولانا نے عرض کیا ہاں متوجہ ہوگا۔ شیخ درویش نے یہ سن کر فرمایا "چرا روشے اختیار باید کرد کہ مشغولی از دست برود" ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی وجہ سے خدا کی یاد سے دل غافل ہو جائے۔

شیخ کی اس لطیف تنبیہ سے مولانا عبدالقدوس گنگوہی اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھیں کی صحبت میں رہ پڑے تا آنکہ شیخ درویش نے انھیں جامۂ خلافت اور فن تصوف میں اپنی

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۵/ ۱۴۶۔

تصنیف ''آدابُ السالکین'' دے کر رخصت کیا۔(۱)

شیخ درویش کی تصنیف آداب السالکین کا ذکر مولانا عبدالحیٔ حسنی نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں ''له كتاب آداب السالكين كتاب مفيد فى السلوك'' شیخ درویش کی فنِ سلوک میں آداب السالیکن مفید کتاب ہے۔ شیخ فتح اللہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں ''اخذ عنه محمد بن قاسم اودهى صاحب آداب السالكين''. ان سے اخذ سلسلہ کیا محمد بن قاسم آداب السالکین کے مصنف نے (۲)

علاوہ ازیں اپنی مشہور تصنیف ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' میں بھی آدابُ السالکین کو شیخ محمد درویش کی تصنیف بتایا ہے۔(۳)

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے بھی شیخ فتح اللہ اودھی کے تذکرہ میں ضمناً آداب السالکین کا ذکر کیا ہے اور نصف صفحہ سے زائد اس کا اقتباس بھی دیا ہے، لیکن کتاب کی نسبت شیخ درویش کے بجائے ان کے والد شیخ قاسم کی طرف کی ہے لکھتے ہیں ''شیخ قاسم اودھی از مریدان اوست رسالہ دارد مسمّٰی بہ آداب السالکین'' (۴) شیخ قاسم اودھی دہلوی ان (شیخ فتح اللہ) کے مریدوں میں سے ہیں جن کا آداب السالیکن نامی ایک رسالہ ہے۔

یوم پنجشبہ ۱۶/محرم ۸۹۶ھ کو شیخ درویش کا وصال ہوا۔ محلّہ چراغ دہلی اجودھیا (عالم گنج کٹرا) میں شیخ فتح اللہ کے حظیرہ میں مشرقی دیوار کے متصل اپنے والد بزرگوار کے پائیں آسودہ خواب ہیں۔(۵)

منشی محبّ اللہ فریدآبادی سپرنٹنڈنٹ نے مولانا محمد علی خلیفہ مولانا سید امیر علی شہید کے حکم سے شیخ قاسم و شیخ محمد درویش کے مزاروں کی مرمّت اب سے تقریباً ۷۰/۸۰ برس پہلے کرادی تھی اس لئے دونوں قبریں ابھی درست حال میں ہیں۔ (٦) مگر یہ آج سے

(۱) مناقب العارفین ص ۱۱۵۔

(۲) نزہۃ ج ۳ ص ۱۴٦، ایضاً ج ۳ ص ۱۲۔

(۳) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند اردو ترجمہ ص ۲۷۳۔

(۴) اخبار الاخیار ص ۱۷۴۔

(۵) نزہۃ ج ۳۔ (٦) گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۳۵۔

پچاس سال پہلے کی اطلاع ہے۔اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ نشانات محفوظ ہیں یا نہیں؟

(۲۰) شیخ علاء الدین حسینی اودھی

مولانا سید علاؤالدین اودھی سید شریف احمد ماہر و بغدادی کی اولاد سے اور حسینی سیّد تھے۔علم وصلاح سے متصف صاحبِ ذوق وحال بزرگ تھے۔ ہندوستانی سنگیت اور موسیقی کے ماہر تھے۔ شیخ عبدالسلام بن سعد الدین بجنوری کے مرید وخلیفہ تھے۔ فارسی زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے۔نمونہ کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار درج ہیں۔

ندانم آں گل خنداں چہ رنگ و بو دارد — کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد
بجستجوئے نیابد کسے مراد و لے — کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد
نشاط بادہ پرستاں بہ منتہا برسید — ہنوز ساقیٔ مابادہ درسو دارد
حدیثِ عشقِ تو تنہا نہ من ہمی گویم — کہ ہر کہ ہست ازیں گونہ گفتگو دارد
متاعِ دل بکف دلبرے بدہ تو علا — کہ ایں متاعِ گرانمایہ او نکو دارد

آپ کے خلفاء میں سیّد علی تلہری اور صاحبزادے سید ماہ رَو بطورِ خاص شہرت کے مالک ہوئے۔ باختلافِ روایت ۹۶۸ھ یا ۹۷۰ھ میں وفات پائی۔(۱)

اجودھیا کے مشہور قبرستان ''خرد مکہ'' میں محوِ خوابِ راحت ہیں۔اسی میں آپ کے صاحبزادے سیّد ماہ رَو اور دیگر اہلِ خاندان و متعلقین کے مزارات ہیں۔سید علاؤالدین کے مزار کے سرہانے ایک سیاہ پتھر نصب تھا،مگر ۶۰/۷۰ سال کا عرصہ ہوا، کچھ نامعلوم افراد رات کو وہ پتھر وہاں سے اُکھاڑ لے گئے اور اسی کے ساتھ بہت سی قبریں بھی کھود ڈالیں۔ بعد میں بذریعہ پولیس تحقیقات کرائی گئی مگر کچھ سُراغ نہ ملا کہ کن لوگوں کی یہ حرکت تھی۔اور کن اغراض کے تحت ایسی مذموم حرکت کی گئی(۲)

''خرد مکہ'' قبرستان پر مودین کٹیا کے پورب ۳۰/۴۰ میٹر کے فاصلہ پر اس مشہور

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۳۲۔

(۲) گم گشتہ ص ۱۷(۵)

مقبرہ (جس میں بڑے بڑے علماء، اولیاء، عباد، زہاد مدفون ہیں) کی ناگفتہ بہ حالت کو ڈاکٹر دبیران الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''گندگی اور غلاظت سے بھرا ہوا ایک باغ ہے جس میں خودرو جنگلی پودے اُگے ہوئے ہیں۔ کبھی یہ باغ ایک وسیع احاطہ کے اندر رہا ہوگا۔ کیونکہ قدیم ترین چہار دیواری کے باقیات اب بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ باغ کا یہی احاطہ ''خرد مکہ'' کہلاتا چلا آرہا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک اس میں ہزاروں پختہ وخام قبریں موجود تھیں۔ جس زمانہ میں ''راجہ درشن سنگھ'' نے نالا کھودوایا بہت سی قبریں اس نالہ میں آکر تلف ہوگئیں۔ اس کے علاوہ بہت سی قبریں فیض آباد، گھورکھپور روڈ بننے کے وقت سڑک اور فٹ پاتھ میں آکر تلف ہوگئیں۔''(۱)

(۲۱) شیخ عاشقِ شاہ اودھی

شیخ غلام المعروف بہ عاشق شاہ اجودھیا کے علمائے عظام و مشائخ کبار میں سے تھے۔ ابتداء میں علماء کی روش پر درس وتدریس میں مشغول رہے۔ بعد میں جاذب حقیقی نے اپنی طرف کھینچا تو علمی مشغلہ سے دل اُچاٹ ہوگیا اور مرشد کامل کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ گھومتے پھرتے شیخ عبدالباسط الہٰ آبادی متوفی ۱۱۹۶ھ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ شیخ عبدالباسط پر ان کی نظر جیسے ہی پڑی ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ اور وارفتگی کے عالم میں بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ بعد میں افاقہ ہوا تو شیخ الہٰ آبادی نے انھیں اجودھیا واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ حکم کے مطابق واپس تو آگئے مگر شیخ کی نگاہ کیمیا اثر نے دل کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وطن مالوف میں سکون نہ ملا اور جملہ اسباب و مال ومتاع نذر فقراء ومساکین کرکے دیوانہ وار شیخ الہٰ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اور مسلسل کئی سال تک صحبت میں رہ کر ریاضتِ شاقہ میں مشغول رہے۔ تا آنکہ شیخ نے خلافت اور عاشق شاہ

(۱) شہر اولیاء ص۲۰۷/۲۰۸ مع اختصار۔

کے خطاب سے نواز کر اجودھیا رخصت کیا۔ کثرتِ ذکر کی وجہ سے جذب وسکر کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔اس لئے مدتوں سرگشتہ اور اِدھر اُدھر گھومتے۔ بالآخر اس کیفیت میں کچھ کمی آئی تو وطن عزیز واپس آئے اور محلّہ کاغذی ٹولہ کی مسجد میں فروکش ہوگئے۔ کسی معتقد نے مسجد کے غسلخانہ کے اوپر ایک حجرہ تعمیر کرادیا تھا۔ اسی حجرہ میں زندگی کے بقیہ دن گذار دیئے۔ مریدین وطالبین کی اصلاح وتربیت کے ساتھ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ شیرازی کا درس بھی دیتے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد نوابی ۱۲۱۲ھ میں وفات پائی۔ محلّہ کاغذی ٹولہ میں معماروں کے امام باڑہ کے متصل آپ کی قبر ہے۔اسی مناسبت سے مولوی سیّد محمد علی اودھی نے مصرعہ تاریخِ وفات یوں کہا ہے:-

آستانِ امام شد جائش

۱۲ ۱۲

مزار کی عالیشان عمارت اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔(۱)

☆ ☆ ☆

---

(۱) فصول مسعودیہ ص۱۳۴ وگم گشتہ حالات ص۴۸۔

شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری

شرقی عہد۸۰۴ھ سے مغل بادشاہ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ تک دارالخیو رشہر جونپور علماء ومشائخ کا مرکز رہا ہے۔ جون پور کی علمی تاریخ میں پچاسوں مدرسوں خانقاہوں کا پتہ چلتا ہے جن میں بیک وقت سیکڑوں علماء وفضلاء اور مشائخ تعلیم وتزکیہ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

(۱) ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۸ھ (۲) قاضی نظام الدین جونپوری مرتب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ متوفی ۸۵۸ھ (۳) شیخ ابوالفتح جونپوری متوفی ۸۵۸ھ (۴) شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری ۸۵۸ھ (۵) ملالہ داد جونپوری محشی ہدایہ ومدارک وغیرہ متوفی ۹۲۳ھ (۶) شیخ قطب بینائے دل جونپوری متوفی ۹۲۵ھ (۷) شیخ معروف جون پوری ۹۴۰ھ (۸) شیخ بہاء الدین چشتی متوفی ۹۴۷ھ (۹) میر سید عبدالاول محدث جون پوری متوفی ۹۶۲ھ (۱۰) شیخ مبارک جونپوری متوفی ۹۸۳ھ (۱۱) شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری متوفی ۱۰۵۲ھ (۱۲) استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ (۱۳) ملامحمود جونپوری مصنف شمس بازغہ وغیرہ متوفی ۱۰۶۲ھ (۱۴) شیخ دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۰ھ (۱۵) قاضی خوب اللہ محدث متوفی ۱۱۰۰ھ (۱۶) مفتی محمد جمیل جونپوری از مرتبین فتاویٰ عالمگیری متوفی ۱۱۲۳ھ (۱۷) ملاحفیظ جونپوری متوفی ۱۱۲۸ھ وغیرہ اپنے اپنے دور میں یہاں کے مشائخ کبار اور علماء عظام میں گذرے ہیں۔ جن میں الشیخ، الامام، العالم الکبیر، العلامہ محمد بن عیسیٰ حنفی جونپوری اپنے معاصر علماء ومشائخ میں خاص شہرت اور مقام ومرتبہ کے مالک ہیں۔ آج کی بزم شرقی میں سے انھیں کا تذکرہ زیرعنوان ہے۔

شیخ محمد کے تذکرہ کے ماخذ و مراجع

(۱) ہماری تحقیق میں ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار خود انھیں کے پڑپوتے شیخ مصطفیٰ جونپوری ہیں جو عہد اکبری میں جونپور کے علماء و امراء میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔ شہنشاہ اکبر نے انھیں دہلی بلاکر بڑی عزت افزائی کی اور قاضی القضاۃ کا منصف جلیل عطا کرکے لاہور بھیجا، لیکن یہ اکبر کی دینی بے اعتدالیوں سے بددل ہوکر حج کی رخصت پر جونپور چلے آئے اور پھر کسی عہدہ کو قبول نہ کیا۔

انھیں شیخ مصطفیٰ نے اپنے اسلاف کے حالات میں ایک رسالہ لکھا تھا جس میں اپنے پردادا شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کے سوانح تفصیل سے لکھے ہیں جو بعد کے تذکروں کے مقابلہ میں زیادہ مفصل اور مستند ہے لیکن یہ رسالہ اب بالکل نایاب ہے اس لئے براہ راست اس سے استفادہ نہیں کیا جاسکا ہے البہ شیخ یٰسین بنارسی نے مناقب العارفین میں اس رسالہ کے اکثر حصہ کو بعینہٖ نقل کردیا ہے، زیر نظر مقالہ میں زیادہ تر مواد شیخ یٰسین کی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

(۲) اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے شیخ جونپوری کا تذکرہ اخبار الاخیار کے ص ۱۸۶ پر کیا ہے، مگر اس میں ان کی ولدیت بیان کرنے میں محدث دہلوی سے چُوک ہوگئی ہے جس کی تفصیل آیندہ آرہی ہے۔

(۳) مناقب العارفین قلمی: مولفہ شیخ یٰسین بنارسی متوفی ۱۰۷۶ھ خلیفہ شیخ طیب بنارسی، بزرگانِ چشت کے ذیل میں مؤلف نے شیخ جونپوری کے حالات شیخ مصطفیٰ جونپوری کے حوالہ سے بالتفصیل درج کئے ہیں، یہ قلمی کتاب شیخ طیب بنارسی اور ان کے خانوادہ کے حالات میں نہایت مستند اور گرانقدر ذخیرہ ہے۔

(۴) گنج ارشدی: یہ شیخ محمد ارشد بن شیخ دیوان محمد رشید جونپوری المتوفی ۱۱۱۳ھ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے خلیفہ شیخ شکر اللہ نے جمع اور شیخ غلام محمد رشید بن شیخ محبّ الدین بن شیخ ارشد نے مرتب کیا ہے۔

دیوان محمد رشید کے مشائخ کے ضمن میں شیخ جونپوری کا مختصر سا تذکرہ ہے۔

(۵) مرأۃ الاسرار قلمی: مصنف شیخ عبدالرحمٰن چشتی یہ ایک جامع تذکرہ ہے جس میں تصوف کے تمام مشہور سلسلوں کے قابل ذکر بزرگوں کے حالات مذکور ہیں، شیخ چشتی نے مرأۃ الاسرار کے ص ۴۲۵ پر شیخ جونپوری اوران کے خلفاء کا ذکر کیا ہے۔

(٦) اعلام الانام لوفیات الاعلام قلمی: مولفہ شیخ محمد یحیٰی خوب اللہ الہ آبادی متوفی ۱۱۴۴ھ علماء وصوفیاء کے حالات میں یہ ایک اہم کتاب ہے جسے مؤلف علاّم نے سنین کی بجائے شہور کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ابھی تک یہ کتاب طبع نہیں ہوسکی ہے دائرہ اجمل شاہ الہ آباد کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے شیخ الہ آبادی نے ماہ ربیع الاول کے تحت ص ۳۵۲ پر شیخ جون پوری کے حالات درج کئے ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ بحر زخار قلمی، اخبار الاصفیاء قلمی، تجلی نور، تذکرۃ العلماء (جونپور نامہ) تذکرہ علماء ہند، نزہۃ الخواطر جلد سوم اور تاریخ شیراز ہند وغیرہ میں بھی شیخ جونپوری کا ذکر ہے مگران میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔تقریباً سب نے مذکورہ بالا کتابوں کی باتیں دہرائی ہیں البتہ تذکرۃ العلماء میں ایک نئی بات ہے جواپنے موقع پر بیان ہوگی۔

اس مقالہ کی ترتیب میں مذکورہ بالا سبھی کتابوں سے مدد لی گئی ہے مگراصل ماخذ کی حیثیت مناقب العارفین ہی رکھتی ہے۔

تاریخ ولادت اورنام ونسب

شیخ محمد بن قاضی عیسیٰ بن شیخ تاج الدین بن شیخ بہاء الدین کی ولادت ماہ صفر ۸۰۷ھ میں دہلی میں ہوئی سلسلہ نسب اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوسکا، البتہ صاحب نزھۃ الخواطر نے منہج الانساب کے حوالہ سے صدیقی النسل ہونے کی صراحت کی ہے۔

اس موقع پرایک بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ جونپوری کے والد کا نام ''احمد'' تحریر فرمایا ہے بعد کے بہت سے تذکرہ نویسوں نےان کے بیان پراعتماد کرتے ہوئے اسی کو لے لیا ہے لیکن گنج ارشدی، مناقب

العارفین اورنزھۃ الخواطر وغیرہ میں والد کا نام ''قاضی عیسیٰ'' مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے۔ شیخ احمد شیخ جونپوری کے چھوٹے بھائی ہیں نہ کہ والد جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا۔

شیخ جونپوری کے آباء واجداد دہلی کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے، جدامجد شیخ تاج الدین معلم الثقلین کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ ان کے درس میں انسانوں کے ساتھ جنّات بھی حاضر ہوتے تھے۔

والد بزرگوار قاضی عیسیٰ حضرت مخدوم جہانیان جہانگشت میر سید جلال الدین بخاری متوفی ۷۸۵ھ کے مرید وخلیفہ اور عالی مرتب صوفی تھے۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد مجھے حجرہ کے دَروازہ پر جہاں طلبہ اپنی جوتیاں نکالتے ہیں دفن کیا جائے، حسب وصیت انھیں اسی مقام پر دفن کیا گیا۔

اس وصیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عیسیٰ کے دل میں علم وعلماء کی کتنی عظمت وعزت تھی۔(۱)

دہلی سے جونپور آمد

فتنۂ تیموری کے وقت دہلی جو کبھی رشکِ بغداد اور غیرت مصر تھی۔ جہاں چپہ چپہ پر خانقاہیں اور قدم قدم پر درس گاہیں تھیں ایسی تباہ وبرباد ہوئی کہ دُور دُور تک خاک اڑنے لگی، علمی وروحانی محفلیں اُجڑ گئیں گھر کے گھر بے نور وبے چراغ ہوگئے۔ اسی ہنگامۂ رست وخیز میں قاضی عیسیٰ نے اپنے دونوں بیٹوں شیخ محمد وشیخ احمد کو ہمراہ لے کر دہلی کو بصد حسرت ویاس خیر باد کہا اور جونپور کا رُخ کیا جو اس وقت تاجدار سلطنت شرقیہ ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ کے حسن انتظام، علم دوستی اور علماء نوازی کی بناء پر مرجع ارباب کمال بنا تھا، صاحب مناقب بحوالہ رسالہ مصطفائیہ لکھتے ہیں۔

ووے درایام فتور فعل از حضرت دہلی بجانب جونپور آمد واقامت فرمود

حضرت مخدوم خواجہ محمد وخواجہ احمد ہر دو برادر ہمراہ وے آمدند(۲)

(۱) مناسب العارفین ص ۱۰۷۔ (۲) ایضاً۔

(بزمانہ ہنگامہ قاضی عیسیٰ دہلی سے جونپور چلے آئے اور یہیں اقامت پذیر ہو گئے ان کے ساتھ شیخ محمد وشیخ احمد دونوں بھائی بھی جونپور آئے)

محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

درفترتے کہ از آمدن امیر تیمور بصوب دہلی افتاد اکثرے اکابر بجونپور رفتند او نیز دَراں میاں بود۔(۱)

(امیر تیمور کے حملہ سے دہلی میں جو ہنگامہ ہوا اس کی وجہ سے اکثر اکابر جونپور چلے گئے، ان جانے والوں میں قاضی عیسیٰ بھی تھے)

تعلیم وتربیت

محدث دہلوی کی تصریح کے مطابق اس وقت شیخ محمد جونپوری کی عمر آٹھ برس کی تھی۔(۲)

شیخ جونپوری نے ایسے گہوارہ میں آنکھیں کھولیں جو علم وفضل کا مرکز تھا۔آپ کے والد قاضی عیسیٰ صوفی المشرب ہونے کے ساتھ عالم، فقیہ اور قاضی بھی تھے، علاوہ ازیں اس زمانہ میں شاہ شرقی کی قدر شناسی اور علم پروری کی بدولت جونپور مدرسوں اور خانقاہوں کا ایک عظیم مرکز تھا۔ یہاں کی علمی و دینی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا خیر الدین سیر الملوک کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

از متعلقات الہ آباد شہریست کہ سلطان فیروز دہلوی آنرا درسنہ ہفت صد وہفتاد و ہجری بنانہادہ بہ جون پور موسوم ساختہ درعہد سلاطین شرقیہ دارالسلطنت گردیدہ صدہا مدارس ومساجد درشہر وحوالئ آں بنا یافتہ وعلماء وفقراء از اقالیم دراں بلدہ رسیدہ(۳)

(متعلقات الہ آباد کا ایک شہر ہے جسے فیروز شاہ دہلوی نے ۷۷۲ھ میں جون پور کے نام سے آباد کیا۔سلاطین شرقیہ کے عہد میں دارالحکومت ہو گیا۔سیکڑوں مدرسے اور مسجدیں شہر اور اس کے اطراف میں تعمیر ہو گئیں اور علماء ومشائخ مختلف شہروں سے وہاں پہنچ گئے۔)

(۱) اخبار الاخیار ص۱۸۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تذکرۃ العلماء ص۴۔

علم اور روحانیت کے اس دور شباب میں شیخ مخدوم محمد جونپوری پروان چڑھے خود ان کا گھر علم وفضل کا نمونہ تھا۔

شیخ جون پوری نے پہلے اپنے والد ماجد سے اکتساب فیض کیا۔ بعد ازاں ملک العلماء قاضی شہاب الدین متوفی ۸۲۹ھ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔اور خداداد صلاحیت کی بدولت تھوڑے ہی دنوں میں استاذ کے منظور نظر بن گئے یہاں تک کہ قاضی صاحب نے ان کی تعلیم کے لئے بطور خاص اصول بزدوی کی شرح لکھی۔

نزہۃ الخواطر میں ہے:

فکان القاضی یحبه حبا مفرطا صنف له شرحا علی اصول البزدوی الی مبحث الامر عند قرأته ذالك الکتاب.(۱)

''قاضی دولت آبادی آپ سے انتہائی محبت رکھتے تھے آپ کیلئے اصول بزدوی کی باب الامر تک شرح لکھی۔جس وقت آپ اس کتاب کو پڑھ رہے تھے۔''

اس زمانہ میں علم ظاہری کے ساتھ تصوف میں کمال حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر علماء مشائخ اور مشائخ علماء ہوتے تھے،خود شیخ کے والد زبردست صاحب تدریس عالم،فقیہ اور قاضی ہونے کے ساتھ مخدوم جہانیان جہاں گشت کے مرید وخلیفہ تھے،اس لئے طلب علم ہی کے زمانہ سے شیخ کا دل سلوک وطریقت کی طرف مائل تھا۔اور نوعمری ہی میں شیخ ابوالفتح جونپوری متوفی ۸۵۸ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے لیکن تعلیم وتحصیل میں انہماک کی وجہ سے طریقہ صوفیہ کے اخذ وکسب کی جانب پوری توجہ نہ ہوسکی اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد حسب منشاء ادھر متوجہ ہوئے اور شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ سے بیعت ہوکر عبادت وریاض میں لگ گئے۔

تجلی نور میں ہے۔

درصغرسنی اولاً حضرت شیخ ابوالفتح دریافت سپس از حضرت شیخ فتح اللہ اودھی

(۱) نزہۃ الخواطر ج۳ص۱۵۲۔

ارادت آوردو بیعت نمود۔ (۱)

بچپن میں پہلے شیخ ابوالفتح کی خدمت میں پہنچے بعدازاں شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور بیعت کی۔

کثرت ریاضت اور اس کے اثرات

شیخ اودھیؒ کی صحبت میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ بچپن کی دبی ہوئی چنگاری شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی اور شیخ کی پوری زندگی اسی کی نذر ہوگئی، سارے مشاغل وتعلقات سے یکسو ہوکر عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے اور اس میں انہماک اس درجہ بڑھا کہ بارہ برس کی طویل مدّت میں نہ زمین سے پیٹھ لگایا اور نہ نماز پنج وقتہ کے علاوہ حجرہ سے باہر قدم نکالا، کثرت مراقبہ سے گردن کی ہڈیاں اوپر کو نکل آئیں اور ٹھوڑی سینہ سے لگ گئی تھی۔

مولانا عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں۔

واخذ الطریقة الشیخ فتح اللّٰه اودهی وجاهد فی اللّٰه حق جهاده حتی قبل ان ظهره لم یمس الارض اثنتی عشر سنة(۲)

سلوک کی تعلیم حضرت شیخ فتح اللہ اودھی سے حاصل کی اور اس راہ میں جدوجہد کا حق ادا کردیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بارہ سال تک لیٹنے کی نوبت نہ آئی۔

مراقبہ اور ذکر وفکر کی کثرت نے عشق ومحبت کی ایسی کیفیت پیدا کردی کہ اسی کی حلاوت اور لذت میں شیخ ہر آن سرمست اپنے گردوپیش سے بالکل بے خبر رہتے تھے بیان کرنے والوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ شیخ کے حجرہ کے متصل ایک درخت اُگ آیا تھا مگر مدّت دراز تک انھیں اس کا علم نہ ہوسکا۔ ایک دن اتفاقاً اس کی چند پتیاں ہوا سے اُڑکر حجرے میں آگئیں تو حیرت سے دریافت کرنے لگے یہ پتیاں کہاں سے آگئیں۔ بتانے والوں نے بتایا کہ دروازہ کے قریب جو درخت ہے یہ اسی کی پتیاں ہیں تو نہایت

(۱) تجلی نور ج۲ص۱۵۲۔ (۲) نزہۃ الخواطر ج۳ص۱۵۲۔

متعجب ہوکر فرمایا کیا یہاں کوئی درخت ہے۔“(۱)

شانِ استغنا

شیخ جونپوری نبی کریم ...... کے اس فرمان پر شدت سے عامل تھے جس میں علماء اور ارباب فضل وکمال کو امراء واغنیاء کے یہاں بلاضرورت آمد ورفت سے منع کیا گیا ہے۔ اوران سے تعلق رکھنے کوعلماء کے حق میں فتنۂ عظیم بتایا گیا ہے۔

ان کا معمول تھا کہ نہ خود کسی امیر ورئیس کے یہاں جاتے اور نہ اسے موقع دیتے کہ وہ آپ کی مجلس میں حاضر ہو۔ چنانچہ ایک بار سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ازراہ نیازمندی کچھ نقد اور خلعت خدمت میں پیش کیے تو بکمال استغناء اسے واپس کردیا اور یہ رباعی پڑھی۔

من دلق خود با اطلس شاہاں نمی دہم
من فقہ خود با ملک سلیماں نمی دہم
از رنج فقر درد ل گنج کہ یافتم
ایں رنج را براحتِ سلطاں نمی دہم

شیخ کے استغناء کے سلسلے میں شیخ مصطفیٰ جونپوری نے ایک عجیب وغریب واقعہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن سلطان حسین شاہ شرقی نے شیخ کے صاحبزادہ شیخ حبیب اللہ سے نہایت اصرار کے ساتھ یہ درخواست کی کہ مخدوم زادہ اگر کچھ زمین قبول فرمالیں تو اہل خانقاہ کے صرف وخرچ میں آسودگی وآسائش ہوجاتی۔ شیخ حبیب اللہ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے، سلطان حسین ایک دیہات کی جاگیر کا پروانہ خانقاہ کے کسی خادم کو دے کر چلا گیا، کچھ دنوں کے بعد جاگیر کی پیداوار لے کر اس گاؤں کے کاشتکار خانقاہ میں حاضر ہوئے دیہات کے لوگ آداب خانقاہ سے ناواقف اس لئے کچھ شور وشغب ہوگیا، شیخ کے کان میں اس کی آواز پہنچی تو پوچھا کیا ہنگامہ ہورہا ہے کسی نے عرض کیا ”مخدوم زادہ کی جاگیر سے غلہ آیا ہے اسے وزن کیا جارہا ہے“ یہ سنتے ہی شیخ کا تیور بدل گیا، غضب

(۱) تجلی نور ص ۲۳۔

ناک ہوکر فرمایا۔

حبیب اللہ ایں رانہ نخورد خلیفہ اور خواہد خورد طعام خود می رسد حبیب اللہ ایں را چرا قبول کرد وساکت ماند۔

حبیب اللہ اسے نہ کھا سکے گا بلکہ اس کا قائم مقام کھائے گا طعام تو خود سے پہنچتا ہے حبیب اللہ نے اسے کیوں قبول کرلیا اور خاموش رہا۔

انجام کار شیخ نے جو فرمایا تھا وہی ہوا، اس واقعہ کے تیسرے دن شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہو گیا اور اس غلہ کو وہ نہ کھا سکے۔(۱)

شیخ اور تعمیر مسجد جامع جونپور

شاہان شرقیہ کو شیخ سے غایت درجہ عقیدت وارادت تھی وہ ہمہ وقت ان کی خدمت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے، اگر چہ شیخ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے...شیخ کی خانقاہ کے قریب کوئی جامع مسجد نہ تھی اس لئے جمعہ وعیدین کی ادائیگی کیلئے خانقاہ سے کافی فاصلہ پر محلّہ خالص پورہ کی مسجد میں جانا پڑتا تھا، آخر عمر میں ضعف ونقاہت کی وجہ سے دشواری پیش آنے لگی تو سلطان محمود شرقی کو شیخ کی رضاء حاصل کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ اگر حضرت پسند فرمائیں تو خانقاہ سے قریب ہی ایک جامع مسجد تعمیر کرادی جائے۔ شیخ نے فرمایا ''خوب است'' چنانچہ ۸۴۲ میں ان کے مکان سے قریب مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی اور دس سال میں تعمیر مکمل ہوگئی۔ مسجد جامع الشرق تکمیل کی تاریخ ہے۔(۲)

مسجد کے مکمل ہو جانے کے بعد شیخ اسی میں جمعہ وعیدین کی نماز ادا کرنے لگے۔ آج کل یہ مسجد ''بڑی مسجد'' کے نام سے مشہور ہے اور سلاطین شرقیہ کی عظمت رفتہ کی ایک عظیم یادگار ہے۔

(۱) مناقب العارفین ص۱۰۸۔

(۲) تذکرۃ العلماء، ص۳۹۔

درس وتدریس

شیخ کی زندگی کا روحانی پہلو اتنا پرکشش اور نمایاں رہا کہ تذکرہ نگاروں نے عام طور سے ان کی اسی حیثیت کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ دوسرے مشائخ چشت کی طرح ظاہری علوم کا درس بھی دیتے تھے۔

ملا خیر الدین لکھتے ہیں۔

درحضور پدر بتدریس طلبۂ علوم پرداخت وغوامض مسائل را دراندک تأمل منکشف ساخت۔(۱)

اپنے والد کی موجودگی میں طلبہ کو درس دیتے تھے اور دقیق مسائل علمیہ کو ادنیٰ غور وفکر سے حل کر دیا کرتے تھے۔

لیکن ان طلبۂ علوم میں سے دو کے علاوہ کسی اور کا نام باوجود تلاش بسیار کے معلوم نہ ہوسکا۔ ان میں ایک شیخ بہاء الدین عمری جونپوری ہیں جنھوں نے جملہ علوم شرعیہ کی تحصیل وتکمیل آپ ہی سے کی، دوسرے شیخ بدہ حقانی ہیں جن کے بارے میں شیخ یٰسین بنارسی لکھتے ہیں، درخدمت مخدوم بعضے کتب تحصیل نمود۔(۲)

مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے بہت افسوسناک رہا ہے کہ ان کے روحانی درجات ومراتب اور کرامات وتصرّفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب کے رہ گئی ہے کچھ یہی معاملہ شیخ جون پوری کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کے جملہ تذکرہ نگار اُن کے روحانی فضل وکمال کو تو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں، مگر ان کے علمی مقام ومرتبہ کی جانب کسی نے توجہ نہ دی۔

تصنیف وتالیف

شیخ کے کسی تذکرہ نویس نے ان کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور شیخ کے مجموع

(۱) تذکرۃ العلماء، ص۲۱۔ (۲) مناقب العارفین ص۱۰۴۔

حالات بھی یہی بتاتے ہیں کہ انھیں اس جانب توجہ مبذول کرنے کی نوبت نہ آئی ہوگی، مگراس کے علی الرغم ملا خیرالدین الہ آبادی نہ جانے کہاں سے لکھتے ہیں ''او صاحب تصانیف کثیرہ است''یعنی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے اور صاحب بحر ذخار نے ان تصانیف کثیرہ کی تعداد'' یک صد'' بتائی ہے مگر یہ تصریح محل نظر ہے کیونکہ اگر شیخ کی کوئی تصنیف ہوتی تو کم ازکم ان کے پر پوتے مصطفیٰ جون پوری اس کا ضرور تذکرہ کرتے جبکہ انھوں نے شیخ کی معمولی سے معمولی خدمت کو بھی ذکر کیا ہے، واللہ اعلم۔

قبول عام

شیخ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت عطا کی تھی اور ہر طبقہ کے لوگ ان کے فضل وکمال کے معترف تھے، محدث دہلوی لکھتے ہیں:

وهو ممن يتفق على ولايته وعظمته و كرامته. (۱)

شیخ جونپوری ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی ولایت، عظمت اور کرامت پر سب کا اتفاق ہے، اور تو اور خود ان کے استاذ اجل ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی آپ کی اس حیثیت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اپنے آڑے وقتوں میں طالبِ توجہ بھی ہوتے تھے، صاحبِ گنج ارشدی لکھتے ہیں کہ ایک بار قاضی صاحب کا ملا خیراتی سے دربارِ شاہی میں مناظرہ طے پا گیا قاضی صاحب نے آخر عمر میں درس وتدریس کا مشغلہ کچھ کم کردیا تھا اس لئے انھیں تشویش ہوئی تو خانقاہ میں حاضر ہوئے اور کامیابی کی دعا چاہی شیخ نے عرض کیا آج رات کو اپنے کتب خانہ کی جس کتاب پر پہلے نظر پڑے اسی کا مطالعہ فرمائیں انشاء اللہ فتح وکامرانی نصیب ہوگی۔ شیخ کی تجویز کے مطابق قاضی صاحب کتب خانہ پہنچے تو ان کی نظر اپنی ہی تصنیف کردہ کتاب ''الارشاد فی النحو'' پر پڑی، قاضی صاحب نے اسی کا مطالعہ کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ شیخ کی دعا کی برکت سے کامیاب ہوئے۔

(۱) اخبارالاخیار ص ۱۸۶۔

وفات ومدفن

شیخ جونپوری کی تاریخ وفات میں تذکرہ نگاروں کا سخت اختلاف ہے۔ شیخ مصطفیٰ نے اپنے رسالہ میں ۱۴/ربیع الاول ۸۷۰ لکھا ہے۔ صاحب مناقب اور گنج ارشدی نے اسی قول کو ترجیح دیا ہے۔(۱) لیکن اس کے برخلاف صاحب تجلی نور لکھتے ہیں کہ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں سن وفات ۸۴۵ھ درج کیا ہے، میرے سامنے اخبار الاخیار کا جو نسخہ ہے اس میں سن وفات مرقوم نہیں ہے ممکن ہے زیدی مرحوم کے نسخے میں اس کی تصریح رہی ہو، اخبار الاصفیاء قلمی میں ۸۶۹ درج ہے۔(۲)

شیخ خوب اللہ الہ آبادی نے ۸۹۹ تحریر کیا ہے(۳) ان سبھی حضرات کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیاء میں ۹۱۱ لکھتے ہیں۔ ان سبھی اقوال میں صحیح شیخ مصطفیٰ اور گنج ارشدی ہی کا قول ہے، چنانچہ تاریخ اسلامیٔ ہند کے محقق مولانا عبدالحئی مرحوم نے نزہۃ الخواطر میں اسی قول کو لیا ہے۔

گذشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان محمد شاہ شرقی نے شیخ جونپوری کی رضا جوئی میں ۸۴۲ھ میں جامع الشرق کی بنیاد رکھی اور دس سال (۸۵۲ھ) میں تعمیر مکمل ہوئی اور شیخ نے نماز جمعہ وعیدین اسی نو تعمیر مسجد میں ادا کرنی شروع کر دی اس لئے لازمی طور سے ۸۵۲ھ کے بعد تک شیخ کا موجود رہنا ضروری ہے۔ اس طرح ۸۴۵ھ والی روایت غلط ہو جاتی ہے، رہیں مفتی لاہوری اور شیخ الہ آبادی کی بیان کردہ روایتیں تو وہ اس لئے صحیح نہیں کہ شیخ مصطفیٰ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ شیخ کے پر پوتے شیخ فضل اللہ بن شیخ نعم اللہ کی ولادت کے بعد شیخ جونپوری صرف چھ ماہ بقید حیات رہے اور شیخ فضل اللہ کی پیدائش ۸۶۹ھ میں ہوئی ہے۔

---

(۱) مناقب العارفین ص ۱۰۹۔

(۲) اخبار الاصفیاء قلمی، ص ۷۶۔

(۳) اعلام الانام لوفیات الاعلام قلمی، ص ۳۵۲۔

مقبرہ جامع الشرق (بڑی مسجد) کے قریب محلّہ ارزن میں بعمارت پختہ آج بھی موجود ہے اور زیارت گاہِ خلائق ہے، مقبرہ اور خانقاہ کی پختہ سنگین تعمیر ''جنید برلاس'' نے کرائی تھی جو عہد بابری میں جون پور کا حاکم تھا، اس کے بعد محمد شاہ کے دورِ حکومت میں شیخ ہی کے خانوادہ کے ایک بزرگ شیخ محمد ماہ جونپوری نے اس کی شکست وریخت کی مرمت کرائی، مقبرہ کے صدر دروازہ پر اب تک یہ عبارت موجود ہے ''خاکروب ایں درگاہ محمد ماہ''۔

شیخ کے چند ملفوظات

شیخ کے چند ملفوظات درج کئے جاتے ہیں جو حقیقتاً رُوحِ تصوّف اور خلاصۂ سلوک ہیں۔ ان سے شیخ کے انداز تربیت کا بھی کچھ اندازہ ہوگا۔

(۱) اپنے متعلقین سے بتاکید فرماتے رہتے تھے ہمہ وقت اللہ کو حاضر وناظر جانو اور تدریجاً اس بات کی کوشش کرو کہ ''اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی''(کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہے ہیں) کا تصور دل میں اس طرح جاگزیں ہوجائے کہ ایک لمحہ بھی دل اس خیال سے غافل نہ ہو۔

(۲) اوراد واشغال سے مقصود اصلی یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوجائے اور دل میں یہ یقین راسخ ہوجائے کہ انه ارحم به من نفسه وانصح له من نفسه ومن الناس اجمعین، یعنی اللہ تعالیٰ میری ذات پر خود مجھ سے زادہ مہربان ہے اور خود مجھ سے اور تمام لوگوں سے زیادہ میرا خیر خواہ ہے۔

(۳) سعی اس بات کی ہونی چاہئے کہ قلب یادحق میں اور قالب کارحق میں مشغول رہے۔

(۴) جو کام بھی کیا جائے صرف اللہ کی رضا کیلئے کیا جائے اور ہر امر میں فعال حقیقی اسی کو سمجھا جائے۔(۱)

☆ ☆ ☆

(۱) مناقب العارفین، ص ۱۱۸۔

قاضی خاں ظفرآبادی

ظفرآباد کی مختصر تاریخ

ظفرآباد جون پور سے ۶ میل پورب اور دکھن میں واقع ہے۔ یہ قدیم اور تاریخی مقام ایک زمانہ میں علماء اور مشائخ کا مرکز رہ چکا ہے۔

اس کا اصل اور قدیم نام منیچ تھا۔ جب مسلمانوں کی آمد اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس علاقہ پر ان کا قبضہ ہوگیا اس وقت سے منیچ کے بجائے ظفرآباد کے نام سے مشہور ہوا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۵۸۹ھ میں سلطان شہاب الدین غوری کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے گوالیار، بدایوں اور کالپی وغیرہ کی تسخیر کے بعد منیچ پر حملہ کیا اس وقت یہاں کا راجہ اودے پال نامی ایک راجپوت تھا۔ اودے پال، ایبک کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا اور اپنے خاندان کو لے کر مارواڑ کی جانب بھاگ گیا۔

ایبک فاتحانہ شہر میں داخل ہوا اور چند دن یہاں قیام کر کے انتظامات درست کیے اور اپنی جانب سے اودے پال کے وزیر جیت سنگھ کو شہر کا حاکم بنا کر خود دلی چلا گیا۔ اس تاریخ سے منیچ اسلامی قلمرو میں شامل ہوگیا۔ لیکن عملاً حکومت جیت سنگھ اور اسکی اولاد کے قبضے میں رہی، یہ لوگ برابر سالانہ خراج دہلی بھیجتے رہے اور اپنی نیازمندی اور ماتحتی کا اقرار کرتے رہے۔

لیکن جیت سنگھ کی پانچویں پشت میں سکیٹ سنگھ نامی ایک ایسا راجہ ہوا جو ناعاقبت اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متعصب بھی تھا۔ اس نے ایک طرف تو شاہان دہلی کی برتری کا انکار کر کے خودمختاری کا اعلان کر دیا اور دوسری جانب جو مسلمان اس کی حدود سلطنت میں تھے ان کے درپئے آزار ہوگیا۔ اور نت نئے مظالم ان پر توڑنے لگا۔ اس کے

تعصب کی پیاس جب ان مظالم سے نہ بجھ سکی تو اعلان کر دیا گیا کہ کوئی مسلمان اس کی حدودِ سلطنت میں رہنے نہ پائے جو مسلمان اس اعلان کے بعد اپنی مجبوریوں سے ہجرت نہ کر سکے وہ اس کی جارحیت و بربریت کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوئے۔(۱)

انھیں ایام میں جبکہ سکیٹ سنگھ مسلمانوں پر جبر و تشدد کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ شیخ سید(۲) اسدالدین آفتاب ہند المتوفی ۷۹۳ھ جو اس عہد کے اولیائے کاملین میں تھے اپنے شیخ مخدوم رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے حکم سے دیارِ پورب میں مقیم تھے انھیں جب سکیٹ سنگھ کی زیادتیوں کی اطلاع ملی تو وہ مسلمانوں کی مدد اور انھیں ظلم و ستم کے خونیں پنجے سے نجات دلانے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اور فوراً ایک خط اپنے پیر و مرشد شیخ ملتانی کی خدمت میں ارسال کیا۔ انھیں راجہ کے ظلم و تعصب سے باخبر کر کے اجازت چاہی تا کہ منہج جا کر مسلمانوں کی نصرت و حمایت کی جائے اور راجہ کو ظلم و عدوان سے روکا جائے۔

مخدوم آفتاب ہند نے اس سلسلہ میں جو مکتوب شیخ رکن الدین ملتانی کی خدمت میں بھیجا تھا اس مکتوب سے راجہ کی جارحیت اور مسلمانوں کی مظلومیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مکتوب ملاحظہ ہو۔

کمترین بندگان اسد حسین حسینی اُمید وار برکت مخدوم مداللہ ظلال جلالہ
برآں جملہ کہ ایں بندہ بعد آئے آداب بجماعت در دعا مشغول می ماند رجاءً
کہ مددے درکار بندہ با خدائے تعالیٰ اسباب دینی و دنیوی ساختہ گرداند۔
دیگر عرض می اُفتد چوں بندۂ بندگان بحکم آں مخدوم زمان در جہاد بنادیٰ

(۱) تاریخ ظفر آباد، ص ۱۹۔

(۲) شیخ مخدوم سید اسدالدین ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے کڑا مانک پور میں شیخ ضیاء الدین زاہد کڑوی سے علوم وفنون کی تعلیم بیس سال کی عمر میں مکمل کی، پھر ملتان جا کر شیخ رکن الدین ابوالفتح بن محمد ملتانی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔ آپ فقہ اصول فقہ اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ سبعہ کے قاری بھی تھے۔ ملتان سے واپس آ کر حضرت سلطان الاولیا شیخ نظام الدین بدایونی سے بھی کسب فیض کیا۔ ۱۶؍ جمادی الاول ۷۹۳ھ میں بعارضۂ فالج وفات پائی۔ محلّہ سیدواڑہ ظفر آباد میں دریائے گومتی کے ساحل پر آپ کا مزار ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے.... تجلی نور ص ۱۱-۷، و چراغ نور، ص ۴۳-۳۸، و نزہۃ الخواطر، ص ۱۲، ج ۲۔

مشغول وسرگرم ست لاکن معرکہ آرائی ختم نشد ہمدریں اثنا اخبار بدعت آثار راجہ منہیج کہ درسخت قلب ظلم وکشت بے گناہان وبرمسلماناں انواع انواع بدعت وایذاء می رساند وازخوف ورجاے یوم انتقام غافل است جماعت فقراء کہ درزاویۂ ایں بندۂ بندگان ماموراست بجوش وخروش می خواہد کہ براں ناعاقبت اندیش نعرۂ تکبیر بلند کنند الا انتظار ایں معرکہ موقوعہ بدل گزیں اگر نوع مددرکار مابندۂ بندگان شود حق سبحانہ تعالیٰ آں سخت قلباں را بخلعت نور اسلام مزین کناد وجملہ مسلماناں رافیروزمندی رہاد بمنہ وکرمہ(۱)

مخدوم آفتاب ہنداس وقت بنادیٰ(۲) میں مصروف تھے اس لیے شیخ ملتانی نے اپنے دوسرے خلیفہ مخدوم صدرالدین چراغ ہند(۳) المتوفی ۷۷۴ھ کو جو اس وقت مرزاپور کے علاقہ میں ارشادوتبلیغ کے اہم کام میں مصروف تھے منہیج کی جانب متوجہ ہونے کا حکم دیا۔

شیخ کے حکم پر مخدوم چراغ ہند مرزاپور سے منہیج کے لیے روانہ ہوگئے۔ان کے پہنچتے پہنچتے مخدوم آفتاب ہندی بنادیٰ سے فارغ ہوکر منہیج پہنچ گئے۔دونوں بزرگوں نے معاملہ کی اہمیت ونزاکت کے پیش نظر شاہِ دلی غیاث الدین تغلق سے امداد کی فرمائش کی۔ان حضرات کی طلب پر سلطان نے شاہزادہ ظفر خاں کی معیت میں چھ ہزار کا لشکر منہیج روانہ کردیا۔شہزادہ ظفر خاں نہایت تیز رفتاری سے شب وروز منزلیں طے کرتے ہوئے بہت جلد منہیج کے قریب پہنچ کر دریائے گومتی کے ساحل پر خیمہ زن ہوگیا۔(۴)

ظفر خاں کے آجانے کے بعد راجہ کو پیغام بھیجا گیا کہ سرکشی اور ظلم وتشدد کے راستہ کو

(۱) تاریخ ظفرآباد بحوالہ مناقب درویشیہ قلمی ص۲۱ وتاریخ شیراز ہند ص۹۲۵۔

(۲) بنادیٰ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور موضع ہے۔

(۳) شیخ صدرالدین ظفرآبادی ۷۰۵ھ میں ملتان میں پیدا ہوئے اور اس دور کے اساتذہ سے حفظ قرآن اور دیگر علوم متعارفہ کی تکمیل کی پھر اپنے ماموں زاد بھائی شیخ رکن الدین ملتانی سے بیعت کی اور خلافت پائی اور شیخ کے حکم سے تبلیغ دین کی غرض سے دیار پورب میں تشریف لائے۔آپ نے سات بار پیدل حج کیا تھا۔۸/ذی قعدہ ۷۹۴ھ یا ۹۹۰ یا ۹۹۵ میں وفات پائی۔آپ کا مدفن محلّہ شیخ واڑہ ظفرآباد میں ہے۔دیکھئے چراغ نور ص ۴۷-۴۳ وتجلی نور ص ۱۴-۱۱ ونزھۃ الخواطر ص ۶۰ ج ۲۔

(۴) تاریخ ظفرآباد،ص۲۲۔

چھوڑ کر اطاعت قبول کرلو اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو پھر جنگ کے لیے آمادہ ہوجائے۔ راجہ کی جانب سے اس پیغام کا کچھ جواب نہیں ملا جسے مسلمانوں نے اس کے کبر ونخوت اور آمادگیٔ جنگ پر محمول کیا اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔

راجہ سکیٹ سنگھ اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پا کر قلعہ میں محصور ہوگیا۔ اور مسلمانوں کے پاس پیغام بھیجا کہ لڑنے کے بجائے ہمارے درمیان مذہبی مباحثہ ہوجائے اگر مسلمان اس مباحثے میں کامیاب ہوجائیں گے تو مجھے قبول اسلام سے کوئی عذر نہ ہوگا اور اگر بازی ہمارے ہاتھ رہی تو پھر مسلمان کو ہمارا شہر خالی کردینا پڑے گا۔ مخدوم چراغ ہند نے راجہ کی تجویز تسلیم کرلی اور محاصرہ اٹھالیا۔

دونوں فریق کے لوگ جمع ہوئے اور مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ فریقین کے نمائندوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ انجام کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ راجہ کے مناظرین، اسلام کی حقانیت کے معترف ہوکر مسلمان ہوگئے۔ راجہ کو جب اس شکست کی خبر ملی تو وہ بدعہدی کرتے ہوئے اپنے خاندان کے افراد کو ہمراہ لے کر چپکے سے جان بچا کر مرزاپور بھاگ گیا۔ اور فوجیوں نے قلعہ کا دروازہ بند کرلیا۔ ناچار مسلمان پھر لڑنے پر مجبور ہوئے چونکہ راجہ فرار ہوچکا تھا اس لیے فوج زیادہ دیر تک مقابلہ میں قائم نہ رہ سکی اور معمولی مزاحمت کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور مسلمان فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے۔(۱)

یہ جنگ ۷۲۱ھ میں پیش آئی ہے اور اس وقت سے یہ قدیم اور تاریخی شہر منیچ کے بجائے ظفر آباد کے نام سے موسوم ہوا۔

اس سن کی تصدیق اس کتبہ سے ہوتی ہے جو حضرت چراغ ہند کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر نصب ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

بعہد ملک ذوالقرنین ثانی — بنائے شہر را از عدل بانی
غیاث دین ودنیا بوالمظفر — سلیماں خاتم وجمشید وافسر
شہ آفاق تغلق شاہ اعظم — کہ بروے شد جہانگیری مسلم

(۱) تاریخ ظفر آباد، ص ۲۲ و تاریخ شیراز ہند، ص ۹۲۷۔ تاریخ ظفر آباد، ص ۲۳ و تاریخ شیراز ہند، ص ۱۰۱۳۔

دوشنبہ بست وہفتم روز بودہ ربیع الاول ماہ ستودہ
ہمایوں سال وساعت وقت مسعود زہجرت ہفت وصدو بست یک بود
مظفر شد چوں شد معمور ایں شہر ظفرآباد نامش ماندہ در دہر

یہ کتبہ دراصل اس شہر پناہ کا تھا جسے شاہزادہ ظفر خاں نے شہر پر قبضہ ہوجانے کے بعد بنوایا تھا مگر جب شہر پناہ گرگئی تو بعد میں وہ پتھر یہاں لاکر نصب کردیا گیا۔(۱)

شہر کے فتح ہوجانے کے بعد مخدوم آفتاب ہند و چراغ ہند نے اسی جگہ اقامت اختیار کرلی۔ ان دونوں بزرگوں کے ہمراہ اس تبلیغی و جہادی قافلہ میں شیخ نظام الدین علامی، قاضی اعزالدین، ملا بہرام منطقی، شیخ محمد کوفی، قاضی تاج الدین ناصحی، ملا بدرالدین، ملا آدم وغیرہ بھی تھے جو اپنے وقت کے مشاہیر علماء وصوفیاء میں شمار ہوتے تھے جن کی وجہ سے ظفرآباد علماء ومشائخ کا عظیم ترین مرکز بن گیا۔(۲)

قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی ظفرآباد کے اولین قاضی منتخب ہوئے۔ یہ حافظ قرآن اور نہایت خوش الحان قاری تھے اور مخدوم آفتاب ہند کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ سلطان الشرق ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں ۸۳۰ھ میں فوت ہوئے۔(۳)

انھیں قاضی تاج الدین ناصحی کی چوتھی پشت میں نویں صدی کی ابتداء میں اس نادر روزگار ہستی کا وجود ہوا جس نے بیک وقت درسگاہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا اور جس کے دست قناعت نے فقر وفاقہ کے باوجود کسی امیر ورئیس کا شرمندۂ احسان ہونا پسند نہیں کیا۔ اسی قدسی صفات بزرگ کی ذات آج زیب عنوان ہے۔

اسم گرامی اور تاریخ ولادت

نام نامی جلال الدین اور لقب قاضی خاں اور ناصحی ہے۔ ناصحی آپ کا خاندانی لقب

(۱) سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے حیات شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق نے مخدوم چراغ ہند کے لیے ظفرآباد میں ایک محل بنوایا تھا یہ کتبہ اسی محل کا ہے مگر تمام تذکرے اس روایت سے خالی ہیں اس کے برخلاف تاریخ شیراز ہند، ص۱۰۱۴ پر ہے کہ یہ کتبہ شہر پناہ کا تھا جسے بعد میں شہر پناہ کے منہدم ہوجانے کے بعد روضہ کے دروازے پر نصب کردیا گیا ہے۔ (۲) چراغ نور، ص۲۳۔ (۳) چراغ نور، ص۱۲ بحوالہ مناقب درویشیہ۔

ہے جس سے پورا خاندان ملقب ہے۔ اِس لقب کے سلسلے میں صاحب مناقب درویشیہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم ادہم قدس سرہ نے جب تاج وتخت سے کنارہ کش ہوکر درویشانہ اور فقیرانہ روش اختیار کرلی تو ان کے ایک صاحبزادہ محمود نے آپ کو پندونصائح کے ذریعہ پھر سلطنت وحکومت کی جانب مائل کرنا چاہا اسی پندونصیحت کی وجہ سے لوگ محمود کو محمود ناصح کہنے لگے اور اس کی اولاد ناصحی کی نسبت سے مشہور ہوئی۔(۱)

آپ کی ولادت ۸۰۵ھ میں بمقام ظفرآباد ہوئی۔ مادۂ تاریخ پیدائش خاصان حق ہے۔

شجرہ نسب اور اصلی وطن

آپ نسباً شیخ فاروقی اور حضرت ابراہیم ادہم کی اولاد سے ہیں۔شجرہ نسب یہ ہے۔

جلال الدین قاضی خاں، بن قاضی یوسف ناصحی بن نظام الدین ناصحی بن شیخ صدرعالم ناصحی بن قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی بن سلطان حسین ناصحی بن سلطان سلیمان ناصحی بن سلطان محمود ناصح بن شیخ ابراہیم ادہم قدس اسرارہم (۲)

حضرت ابراہیم قدس سرہٗ کے تارک الدنیا ہوجانے کے بعد بھی کئی پشتوں تک اُن کے خاندان میں حکومت باقی رہی لیکن سلطان حسین ناصحی کے عہد میں شاہ عباس فرماں روائے ایران نے حملہ کرکے حکومت بخارا کو تاخت وتاراج کردیا اور خاندان ناصحی کا شیرازہ اقصائے عالم میں منتشر ہوگیا۔

اسی حملہ کے بعد ۷۰۸ھ میں شیخ تاج الدین ناصحی نے بخارا کی سکونت ترک کرکے دہلی کو اپنا مسکن ووطن بنایا۔ بعدازاں حضرت آفتاب ہند کی معیت میں ۷۲۱ھ میں ظفرآباد تشریف لائے اور یہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔یہی عہدۂ قضا بعد میں خاندان ناصحی کے

(۱) چراغ نور،ص ۴۷،نزہۃ الخواطر، ج ۴،ص ۲۶۵۔

(۲) چراغ نور،ص ۱۲۵۔ناصحی خاندان کے شیوخ اپنا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم تک پھر اس کے اوپر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک لے جاتے ہیں لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ علامہ ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم قبیلہ بکر بن وائل سے تھے اور حافظ نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم عجلی تھے اور بعض نے تمیمی لکھا ہے۔امام بخاری بھی قتیبہ کے حوالہ سے انھیں تمیمی بیان کرتے ہیں۔واللہ اعلم۔

ظفرآباد میں قیام کا سبب ہوا۔(۱)

شیخ تاج الدین نے ظفرآباد میں جس مقام کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا وہ جگہ محلّہ ناصحی سے مشہور ہوئی اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔

خاندانی وجاہت

قاضی خاں نے جس وقت آنکھ کھولی آپ کا گھر علم وفضل کا گہوارہ تھا۔ والد بزرگوار قاضی یوسف ناصحی ظفرآباد کے قاضی تھے۔ گھر میں علوم وفنون کے چرچا کے ساتھ فراغت ورفاہیت بھی تھی۔ ابھی آپ چھ ماہ کے تھے کہ ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس نے آپ کو ایک قاضی کے گھر سے وزیراعظم کی آغوش میں پہنچا دیا۔

آپ کے والد قاضی یوسف ایک شب اپنے خسر عمادالملک بختیار خاں وزیراعظم کے بالاخانہ پر تہجد کے بعد ذکر وشغل میں منہمک تھے۔ اتفاقاً شیخ بہاء الدین(۲) جونپوری قدس سرہ کا گزر بالاخانہ کے پاس سے ہوا۔ شیخ نے قاضی یوسف کو دیکھ کر بڑے پر درد لہجے میں بلند آواز سے یہ اشعار پڑھے۔

من رسم سوئے تو خاموش   دارم سخنے اگر نہی گوش

اینجا حرص و ہوا کمند است   ایوان ترا بسے بلند است

مجنوں شدہ کوہ کوہ بخر دش   باید درعشق خانہ بردوش

خدا جانے شیخ کی آواز میں کیا جادو تھا کہ ان اشعار کے سنتے ہی قاضی یوسف ازخود رفتہ ہوگئے اور ایک آہ سرد مار کر بیابان کی راہ لی۔ سلطان الشرق اور عمادالملک نے ہر چند تلاش وجستجو میں آدمی دوڑائے مگر کچھ خبر نہ ملی کہ کہاں گئے اور کیا ہوئے۔(۳)

(۱) بیان الانساب سادات زیدیہ، ص۱۳۹ بحوالہ تاریخ شیراز ہند۔

(۲) شیخ بہاء الدین جون پوری چشتی مشہور مشائخ چشتیہ میں سے ہیں۔ مولانا عبدالحئی رائے بریلوی نزہۃ الخواطر ص۶۱، ج۴ میں شیخ بہاء الدین جون پوری کے ترجمہ میں لکھتے ہیں العالم الفقیہ المورث جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم باطن کے ساتھ علوم ظاہر میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے۔ شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری کے مرید اور راجہ حامد شہ مانگپوری کے خلیفہ تھے بقول صاحب بحرزخار ۹۱۱ھ میں وفات پائی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تجلی نور، ص۲۷۔

(۳) چراغ نور، ص۴۸، وگنج ارشدی ص ونزہۃ الخواطر، ص۶۱، ج۴۔

قاضی یوسف کے اس طرح لاپتہ ہوجانے کے بعد قاضی خاں کی نگہداشت اور تربیت کی تمامتر ذمہ داری ان کے نانا عماد الملک کے سرآئی۔ عماد الملک جملہ علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور وزیر السلطنت بھی تھے اس لیے علمی ماحول کے ساتھ ہر طرح کی آسائش اور آسودگی بھی میسر تھی جس کا اثر مخدوم قاضی خاں کی نشو ونما پر بہت اچھا پڑا اور سترہ سال کی قلیل مدت میں علوم متداولہ کی تعلیم و تحصیل سے فراغت ہوگئی۔

نزھۃ الخواطر میں ہے۔

ونشاء فی مهد جده لامه الوزیر عماد الملك الجونپوری واشتغل بالعلم من صباه وقرء فاتحة الفراغ فی السابع عشر من سنه.(۱)

اپنے نانا عماد الملک وزیر جونپور کی آغوش میں پروان چڑھے اور بچپن ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہوگئے اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔

مخدوم قاضی خاں نے کن کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں لیکن اتنی بات واضح ہے کہ انھوں نے عماد الملک کی زیر نگرانی علمی مراحل طے کئے اور جملہ علوم وفنون کی تحصیل جونپور ہی میں کی۔ عماد الملک خود ایک متبحر عالم اور علم وعلماء کی عظمتوں سے واقف، بیدار دل، روشن ضمیر بزرگ تھے اور جون پور سلطان الشرق کی علم پروری اور علماء نوازی سے چمنستان علم وفضل بنا ہوا تھا۔

اس لیے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ شفیق نانا نے عزیز نواسے کی علمی تربیت کے لیے وقت کے علماء وفضلا کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

عرفان وسلوک

علوم ظاہری کی تحصیل سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ شیخ حسن بن طاہر جون پوری کی خدمت میں دہلی پہنچے اور مسلسل تیس سال اُن کی صحبت میں رہ کر عبادت وریاضت میں مشغول رہے اور ولایت کے اعلیٰ مدارج طے کر کے شیخ سے خلافت حاصل کی۔

(۱) نزھۃ الخواطر، ص ۲۶۵، ج ۴ و تجلی نور ص ۱۵، وفیات الاعلام، ص ۱۸۰۔

مولانا عبدالحئ مرحوم نزھۃ الخواطر میں رقمطراز ہیں۔

ثم لازم الشیخ حسن بن الطاھر العباسی الجونپوری وصحبہ ثلاثین سنۃ واخذ عنہ الطریقۃ(۱)

پھر وہ شیخ حسن بن طاہر عباسی جونپوری کی خدمت میں جا پڑے اور پورے تیس سال ان کی صحبت میں رہ کر راہ سلوک طے کی۔

شیخ حسن طاہر جونپوری اپنے عہد کے مشاہیر علماء ومشائخ میں سے تھے۔ علوم باطنی کے ساتھ علوم ظاہری کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ شیخ کو راجہ حامد شہ مانکپوری المتوفی ۹۰۱ھ سے خلافت حاصل تھی۔ شیخ حامد فرماتے تھے کہ قیامت کے دن حسن مرے لیے حجت ودلیل ہوں گے۔ سلطان سکندر پوری کی خواہش پر جون پور سے آگرہ پھر وہاں سے دلی تشریف لے گئے اور وہیں بجے منڈل میں ۹۰۹ھ میں ہمیشہ کے لیے اقامت گزیں ہو گئے۔(۲)

قاضی خاں کا مقام علماء کی نظر میں

مخدوم قاضی خاں کے تمام تذکرہ نگاران کی جلالت شان کا تذکرہ نہایت شاندار اور پُرشوکت الفاظ میں کرتے ہیں۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

''میاں قاضی خاں ظفرآبادی قدس سرہٗ مرید وخلیفہ شیخ حسن طاہر است از جملہ صادقان ایں طریق است، صاحبِ استقامت وکرامت وحرمت وزہد وتجرید، ولے بحسب زماں اگرچہ متاخر است ولیکن بجہت صفائی معاملہ اعداد از متقدمان است۔(۳)

قریب قریب انھیں خیالات کا اظہار مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں:

''شیخ قاضی خاں ظفرآبادی قدس سرہ مرید وخلیفہ شیخ حسن طاہر است شیخ بود صاحب استقامت وکرامت وزہد وورع وتقویٰ وتجرید وتفرید(۴)

(۱) نزھۃ، ص ۲۶۵، ج ۴، اخبار الاخیار ص ۲۳۹۔

(۲) اخبار الاخیار، ص ۲۰۱، تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۷، نزھۃ الخواطر ص ۸۹، ج ۴۔

(۳) اخبار الاخیار ص ۲۳۹۔ (۴) خزینۃ الاصفیاء ص۔

مولانا عبدالحئی مرحوم ان الفاظ میں ان کی جلالت کا اعتراف کرتے ہیں:

''الشیخ العالم الصالح جلال الحق قاضی خاں بن یوسف الناصحی العمری الظفر آبادی کان من کبار المشائخ الچشتیہ (۱)

صاحب تجلی نور رقم طراز ہیں:

حضرت بندگی جلال الحق در بزرگان متاخرین اہل چشت از بس نام آورد صاحب زہد وتوکل عبادت وریاضت واہل استقامت وکرامت بود حتی کہ پیرش ہنگام فروشدن پسر خود عبدالعزیز راجہت تعلیم باطنی با تفویض نمود (۲)

سلوک کے مراحل طے کر لینے اور درجۂ کمال حاصل ہو جانے کے بعد پیر ومرشد کی اجازت سے وطن مالوف واپس تشریف لائے۔ ہر نوع کے شاہی عہدے اور مناصب کے دروازے آپ پر کھلے تھے مگر سب سے کنارہ کش ہو کر درویشانہ زندگی اختیار کی اور دنیاوی عزت وجاہ سے بے نیاز ہو کر درس وتدریس اور تصفیہ قلوب وتزکیۂ نفوس میں مشغول ہو گئے۔

لیکن جب افلاس اور تنگدستی کی گرفت سخت ہوگئی اور اہل وعیال کی حالت فقر وفاقہ سے بالکل خستہ تو قاضی صاحب کو بھی یک گونہ پریشانی لاحق ہوئی ناچار ایک عریضہ غربت وتنگدستی کی شکایت میں شیخ کی خدمت میں ارسال کیا۔ شیخ حسن قدس سرہ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

بخدمت قاضی خاں ظفر آبادی چوں غم فرزند واطفال وعیال ومتعلقۂ آں دردل بگذر ومضمون یک بیت رادر خاطر تصور نمائند۔

از خدا خواہم وزغیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندہ غیر و نخدائے دگر است

فرزند بندہ است خدارا تو غم مخور تو بندہ ہستی نہ خداوند پروری اگر مفلس است گنج تو کل برائے او کافی تو رنج ناحق ونار وامبر۔ (۳)

(۱) نزھۃ الخواطر ص ۲۶۵، ج۴۔ (۲) تجلی نور ص ۱۶۔

(۳) بیاض درویشیہ قلمی بحوالہ چراغ نور ص ۴۸

شیخ کے مکتوب سے قاضی خاں کی ساری پریشانی کافور ہوگئی اور اطمینان وسکون حاصل ہوگیا اس کے بعد زندگی بھر نہ فقر وفاقہ کی شکایت لب پر آئی نہ کبھی خانقاہ سے باہر قدم نکالا۔

شان استغناء

مخدوم قاضی خاں کے مزاج میں حد درجہ قناعت واستغناء تھی۔امراء وسلاطین کے دربار میں حاضری تو درکنار ان سے کسی قسم کا ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ایک بار ہمایوں شاہ نے اپنے ایک امیر مرزا عسکری کو خدمت میں بھیجا کہ مخدوم جتنے مواضعات کی خواہش کریں معاف کردیے جائیں۔مرزا عسکری کو باریابی نصیب نہ ہوئی اس لیے آپ کے چچا قاضی صدرالدین ناصحی کے ذریعہ بادشاہ کا پیغام پہنچایا۔آپ نے ہمایوں شاہ کی اس پیش کش کو ٹھکرادیا اور یہ قطعہ پڑھا۔

ما حرص و ہوا دو بندہ داریم　　　با ہر دو برام بادشاہیم
تو بندۂ بندگان ما ہستی　　　از بندۂ بندگان چہ خواہیم

ہمایوں شاہ کو جب اس بے نیازی اور شان استغناء کا علم ہوا تو اس کی عقیدت اور بڑھی خود آستانہ پر حاضر ہوا مگر قاضی خاں اس وقت خلوت کدہ میں تھے ملاقات نہ ہوسکی دوسرے دن صبح سویرے پھر حاضر ہوا مگر قاضی صاحب حسب معمول اس وقت طلبہ کے درس میں مشغول تھے۔درس سے فراغت کے بعد ملاقات ہوئی، ہمایوں نے بحسب خواہش خود مواضعات وقریات کی معافی کا فرمان پیش خدمت کیا۔آپ نے فرمان واپس کردیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے عہد کیا ہے

از خدا خواہیم وزغیر نخواہم بخدا　　　کہ نیم بندۂ غیر ونخداے دگر است

جاتے جاتے ہمایوں نے سادہ کاغذ پر مہر شاہی ثبت کر کے قاضی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ جتنے مواضعات اور نقد کی خواہش ہو مخدوم اس پر تحریر فرمادیں آپ نے اسے بھی لوٹادیا اور فرمایا کہ

/٦

''مارااحتیاجے نیست و بے احتیاج حق مسلماناں گرفتن روانہ باشد''(۱)

کہتے ہیں کہ جب مخدوم قاضی خاں نے اس گراں بہا نذرانہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا تو ہمایوں نے ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ کی خدمت میں پیش کیا شیخ عبداللہ نے بھی رد کردیا اور فرمایا:

پسر باید کہ برمتابعت پدر رد وچوں پدر ما قبول نکردنا چار مارا نیز آں باید کرد کہ ایشاں کردند(۲)

وفات

بالآخر علم و فضل اور رشد و ہدایت کے اس امام نے، تعلیم کتاب و حکمت اور تطہیر قلوب والنفس میں پوری زندگی گزار کر ۱۵ر صفر ۹۴۴ھ کو جاں جان آفریں کے حوالہ کردی۔

سید نورالدین زیدی ظفرآبادی نے تاریخ رحلت ان اشعار میں لکھی ہے۔

گل گلزار باغ لامکانی　　در دریائے عمان معانی
مئے شوق محبت نوش کردہ　　خمار جام وحدت ہوش بردہ
بملک فقر شاہنشاہ مسعود　　جلال الدین قاضی خاں محمود
زمہجوری بساط قرب جستند　　زدنیا رفتہ خلد آباد کردند
چوں زیدی جست سال فوت قاضی
ندائے فخر دیں کردہ منادی(۳)
۹۴۴

شیخ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار(۴) میں اور مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں سال وفات ۹۷۰ھ تحریر فرمایا ہے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند(۵) نے بھی اسی سن کو درج کیا ہے۔ ان حضرات کے برخلاف شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ الہ آبادی المتوفی

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۳۹ و تجلی نور ص ۱۷، چراغ نور ص ۴۹، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶۔

(۲) اخبار الاخیار ص ۲۴۰ و تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۶۔ (۳) چراغ نور، ص ۵۰ و تجلی نور ص ۱۸۔

(۴) دیکھئے اخبار الاخیار ص ۲۴۰۔ (۵) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶۔

۱۱۴۴ھ نے وفیات الاعلاّم میں ۹۵۰ھ لکھا ہے(۱)۔زیدی ظفرآبادی مخدوم قاضی خاں کی کرامات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ''میرعلی عاشقاں سرائے مری، شیخ اڈہن جونپوری، سید غیاث الدین درویش ظفرآبادی اور مخدوم جلال الحق قاضی خاں ظفرآبادی میں باہم مخلصانہ دوستی اور راہ ورسم تھی۔ایک مرتبہ چاروں حضرات بیٹھے موت اور مابعدالموت کے موضوع پر گفتگو کررہے تھے درمیان میں یہ بات آئی کہ ہم میں سے جس کی وفات پہلے ہو وہ اطلاع دے کہ وہاں سب سے زیادہ قدر کس عمل کی ہے۔

خدا کا چاہا ایسا ہوا کہ ان حضرات میں سے پہلے قاضی خاں کی وفات ہوئی۔ وفات کے تیسرے دن تینوں حضرات قاضی خاں کے مزار پر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''الکریم اذا وعدوفیٰ'' اسی وقت ہوا کا ایک بگولہ اٹھا اور قبر کے پاس ختم ہوگیا۔ہوا کے ختم ہونے کے بعد دیکھا گیا تو کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جس پر حافظ شیرازی کا یہ شعر قاضی خاں کے خط میں لکھا ہوا تھا۔

راحت بدل رساں کہ ہمیں راخرند ویس   آنجا فنون شیخ نیرزد بنیم خس

سید میرعلی عاشقاں کی وفات حسب تصریح شیخ محمد عارف ۹۵۵ھ ہے۔(۲) اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو قاضی صاحب کا سن وفات ۹۵۰ھ یا ۹۴۴ھ ہی صحیح ہوگا۔شاید اسی وجہ سے مولانا عبدالحیٔ مرحوم نے نزہتہ الخواطر ص ۲۶۵ میں انھیں دونوں تاریخوں کو نقل کیا ہے اور ۹۷۰ھ والی روایت کو نظرانداز کردیا۔واللہ اعلم

اولاد اور خلفاء

مبدأ فیاض نے حضرت قاضی کو علم وفضل اور زہد وورع کی دولت جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطا فرمائی تھی۔مناقب درویشیہ اور اخبار الاخیار سے معلوم

(۱) وفیات الاعلام ص ۱۸۰۔

(۲) رسالہ عاشقاں ص ۳۲، رسالہ عاشقیہ کو شیخ محمد عارف نے میرعلی عاشقاں سرائے مری کے حالات میں قلمبند کیا ہے۔شیخ علی عاشقاں کے حالات میں اس سے زیادہ اہم اور مستند کوئی اور ماخذ نہیں ہے اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا نجم الدین اصلاحی دامت برکاتہم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

ہوتا ہے کہ آپ کثیر الاولاد تھے مگر شیخ عبداللہ ناصحی کے علاوہ بقیہ اولاد کی تفصیل سے تمام تذکرے خالی ہیں۔

شیخ عبداللہ ناصحی

نام نامی آپ کا عبداللہ اور لقب جمال الحق ناصحی ہے۔آپ مخدوم قاضی خاں کے پہلوٹھے صاحبزادے ہیں۔شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں ''شیخ عبداللہ اکبر اولاد او بود'' آپ بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔کبھی کبھی صحو وسلوک میں آجاتے ورنہ ہمیشہ جذب ومستی اور سکر کی کیفیت طاری رہتی۔ ریاضت وکرامت میں خاص شہرت کے مالک تھے اور بڑے مستجاب الدعوات، سیف زبان تھے۔والد بزرگوار کی طرح دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز اور نذرو نیاز قبول کرنے سے محترز تھے۔

حضرت قاضی خاں کے بعد سجادۂ مشیخت پر رونق افروز ہوئے اور والد محترم کی صحیح جانشینی فرمائی۔۱۰۰۱ھ میں وفات ہوئی اسم گرامی ''شیخ عبداللہ'' سے سن وفات نکلتا ہے[۱]

حضرت قاضی خاں کے متوسلین اور خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں دو بزرگوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی بغرض اختصار انھیں دو کے حالات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی

آپ شیخ حسن بن طاہر جونپوری کے فرزند ارجمند تھے۔۸۹۸ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے ڈیڑھ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ دہلی آگئے پھر وفات تک یہیں رہے۔شیخ عبدالعزیز شریعت وطریقت دونوں کے جامع تھے۔علوم باطنی کی تکمیل حضرت قاضی خاں کے زیر تربیت کی، شیخ حسن بن طاہر نے وفات کے وقت انھیں قاضی خاں کے سپرد کردیا تھا۔چنانچہ والد کی وفات کے بعد یہ ظفرآباد آئے اور طویل مدت تک یہاں مقیم رہ کر عبادت وریاضت اور کسب سعادت میں مشغول رہے اور سلوک کی منزلیں طے کر کے

(۱) اخبار الاخیار ص۲۴۰ وتاریخ شیراز ہند ص۹۹۲۔

قاضی خاں سے خرقہ خلافت حاصل کیا پھر دہلی آ کر مسند ارشاد کو زینت بخشی۔ دہلی اور اس کے قرب وجوار میں آپ سے بڑا فیض ہوا اس عہد میں آپ کا کوئی ہمسر اور مثیل نہ تھا۔

شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

اورا در تواضع وحلم وصبر ورضا وتسلیم وشفقت بر خلق ورعایت فقر نظیر نبود ودر زماں خود یادگار مشائخ چشت بود گرد دہلی بوجود او سلسلۂ ارشاد مشیخت بر پا بود (۱)

ان کے تقدس، حلم اور تواضع نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ سلسلۂ چشتیہ کی دیرینہ روایات اس تاریک دور میں پھر ایک بار ان کے ذریعہ زندہ ہونے لگی تھیں۔ عوام وخواص سب ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ بیرم خاں خانان خاص طور سے معتقد تھا۔

۶/جمادی الاخری ۹۷۵ھ میں آیت "فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون" کے سماع پر بحالت وجد محبوب حقیقی سے جا ملے۔ "یادگار چشت" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ (۲)

شاہ مسعود خلوتی

یہ بزرگ بھی حضرت قاضی خاں کے ارشد خلفاء میں ہیں۔ بیعت کے بعد ذکر وشغل کی غرض سے بارہ سال تک عوام الناس سے بالکل منقطع ہو کر ذکر وفکر اور مراقبہ میں مشغول رہے اسی وجہ سے "شاہ خلوتی" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ عزلت گزیں اور تنہائی پسند تھے۔ عوام سے اختلاط بالکل پسند نہ کرتے۔ دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو کر شب وروز ذکر الٰہی اور یاد ربانی میں محو رہتے۔ بلا کسی شدید ضرورت کے بات نہ کرتے ہمیشہ ایک جوڑا کپڑا رکھتے۔ ازدواجی جھمیلوں سے بھی تاحیات الگ رہے۔ ۹۸۴ھ میں بعہد اکبر شاہ انتقال فرمایا۔ مزار محلّہ ناصحی ظفر آباد میں موضع رام داس پور کے متصل اب بھی موجود ہے۔ (۳)

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۸۸۔ (۲) چراغ نور ص ۱۰۵، تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۶، اخبار الاخیار ص ۲۸۸۔

(۳) تاریخ شیراز ہند ص ۹۹۵ و چراغ نور ص ۱۰۶۔

سیّد محمد جونپوری اور تحریک مہدویت

سیّد محمد جونپوری کی ذات نویں صدی ہجری سے آج تک اہل علم کے حلقہ میں محل بحث واختلاف چلی آرہی ہے ایک جماعت انھیں صاحب مقامات اور کشف وکرامات کا حامل سمجھتی ہے — کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ متقی پرہیزگار ضرور تھے لیکن دعوائے مہدویت میں غلطی پر تھے — ایک تیسری جماعت ہے جس کا خیال یہ ہے کہ وہ زاہد و متقی بالکل نہیں تھے بلکہ ایک جدید مذہب کے بانی تھے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے حالات کا جائزہ ان کے معاصرین اور دیگر محقق مورخین کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں لیا جائے تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچا جاسکے اور اس مشہور روزگار ہستی کے سلسلے میں درست معلومات حاصل ہوں۔

تاریخ ولادت اور نام ونسب

محمد نام، اسد العلماء، خاتم الاولیا اور نور بخش القاب ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: سید محمد بن سید عبداللہ بن عثمان بن موسیٰ بن قاسم بن نجم الدین بن عبداللہ بن یوسف بن یحییٰ بن نعمت اللہ بن اسمٰعیل بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن باقر بن زین العابدین بن سیدنا حسین بن امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔

۱۴؍جمادی الاولیٰ ۸۴۷ھ/۱۴۱۳ء میں بزمانہ سلطنت ابراہیم شاہ شرقی شہر جونپور میں پیدا ہوئے۔(۱)

تعلیم وتربیت اور ابتدائی حالات

عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو خاندانی روایت کے مطابق تعلیم وتحصیل کا سلسلہ

(۱) مقدمہ ترجمہ رسالہ مناقب۔

شروع کیا اور استاذ کے لئے جونپور کے مشہور عالم اور بزرگ ترین صوفی شیخ دانیال کا انتخاب ہوا سات سال کی قلیل عمر میں قرآن حکیم کے حفظ سے فراغت ہوگئی اور بارہ برس کی عمر میں علوم وفنون رسمیہ سے فارغ التحصیل ہوگئے مطالعہ کی کثرت، معلومات کی وسعت اور بحث ومباحثہ کے وقت انتقال ذہنی کو دیکھ کر بڑے بڑے اہل علم متحیر ہوجاتے تھے انھیں اوصاف کے تحت اس عہد کے علماء نے آپ کو اسد العلماء کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔(۱)

علوم رسمیہ سے فارغ ہونے کے بعد شیخ دانیال کی صحبت میں رہ کر تربیت علوم باطنی کی بھی تکمیل کی اور انھیں سے خرقۂ خلاف حاصل کیا۔(۲)

۸۶۲ھ میں شاہ حسین شرقی نے اڑیسہ پر فوج کشی کی۔ ترہٹ کا راجہ دلپت راؤ مقابلہ میں آیا جسے شاہ حسین نے پہلے ہی حملہ میں پسپا کر دیا بالآخر معاملہ ادائیگی خراج پر ختم ہوا۔ لیکن واپسی کے بعد دلپت راؤ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور خراج کی رقم روک لی جس کے نتیجے میں شاہ حسین نے ۸۶۴ھ میں اس پر دوبارہ حملہ کیا اس جنگ میں سید محمد نے بھی بہ نیت جہاد شرکت کی اور دلپت راؤ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے کامیابی کے ساتھ واپس آئے اس وقت آپ کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

شیخ دانیال کی صحبت کے اثر سے تصوف کا چسکا پہلے لگ ہی چکا تھا اور اس راہ کی منزلیں طے کر کے خلافت بھی پا چکے تھے مگر جنگ کی شرکت نے دنیا کی بے ثباتی کا ایسا نقشہ سامنے کر دیا کہ ماسویٰ اللہ سے بے نیازی اور تعلق مع اللہ کی حالت جذب کے درجہ تک پہنچ گئی اور سات سال تک بے حد استغراق رہا اور پانچ برس تک صحو وسکر کی ملی جلی کیفیت طاری رہی اور اسی عالم میں وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر راہ غربت اختیار کر لی۔

جونپور سے ہجرت

۸۸۷ھ میں جونپور سے روانہ ہوکر عظیم آباد کے جنگلات میں اقامت پذیر ہوگئے

(۱) گلشن زار بحوالہ مقدمہ رسالہ مناقب۔ (۲) خزینۃ الاصفیاء ص ۴۶۷۔

-اس سفر میں آپ کی زوجہ محترمہ اور بڑے صاحبزادے سید محمود کے علاوہ اور دوسرے طالبان بھی ہمراہ تھے- کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد چندیری گئے اور وہاں سے مالوہ کے پایۂ تخت مانڈو میں رونق افروز ہوئے۔ مالوہ کا حکمران علاء الدین خلجی متوفی ۹۰۵ھ نے جب آپ کے پاکیزہ اخلاق اور اتباع سنت نبوی کا چرچا سنا تو آپ کا گرویدہ ہوگیا یہاں آپ کے مواعظ حسنہ سے ہزاروں ہدایت یاب ہوئے مانڈو سے کوچ کر کے ۸۸۸ھ میں گجرات تشریف لائے اور تقریباً ڈیڑھ سال یہاں مقیم رہ کر خلق خدا کی اصلاح و تربیت میں مشغول رہے اسی مقام پر آپ کی زوجہ کا ۸۹۰ھ میں انتقال ہوگیا اس زمانہ میں گجرات فتح نہیں ہوا تھا مگر سلطان محمود بیگڑھ اس کا محاصرہ کئے تھا۔ سلطان محمود کو آپ کے ورع تقویٰ اور پسندیدہ اخلاق کی خبر پہنچی تو آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن امرائے سلطنت نے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سید صاحب کی صحبت سے سلطان متاثر ہو کر ترک حکومت کر بیٹھے تو پھر گجرات کی مہم یونہی نا تمام رہ جائے گی- سلطان کو کسی طرح سے سید صاحب کی مجلس میں آنے سے باز رکھا اسلئے سلطان محمود بیگڑھ اس مبارک صحبت سے محروم رہ گیا مگر اسی جگہ جالور کا تاجدار زبدۃ الملک عثمان خاں شرف ملاقات سے بہرہ اندوز ہو کر عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا ۸۹۰ھ میں گجرات سے روانہ ہو کر خاندیش کے دارالسلطنت برہان پور پہنچے پھر وہاں سے دولت آباد ہوتے ہوئے احمد نگر میں اقامت گزیں ہوئے چندے قیام کرنے کے بعد یہاں سے بیدر شریف کا قصد کیا بیدر کا حاکم قاسم برید آپ کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہوگیا بیدر سے کوچ کر کے گلبرگہ پہنچے یہاں آپ کے پند و نصائح سے بے شمار لوگ ہدایت یاب ہوئے گلبرگہ سے بندر ڈابھیل آئے اور یہاں سے بذریعہ جہاز مکہ معظّمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

۸۹۱ھ میں زیارت حرمین سے فیضیاب ہو کر براہ جدہ کھمبائٹ واپس آئے پھر احمد آباد تشریف لے گئے اور شہر سے باہر تاج خاں سالار کی مسجد میں فروکش ہوئے یہاں آپ کے زہد و تقویٰ اور اخلاق حمیدہ کا بے حد چرچا ہوا اور ایک کثیر تعداد آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوئی۔ احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت سید جلال الدین عرف شیخ

جیوکو جب آپ کے اوصاف وکمالات کی اطلاع پہنچی تو ملاقات کے لئے خود حاضر ہوئے۔ سید صاحب نے دوسری اور تیسری آیات پڑھیں شیخ جیو نے ان کا جواب بھی قرآن ہی سے دیا اور اس کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے راہ میں کسی نے ان سے سید صاحب کے بارے میں معلومات چاہی تو فرمایا مرد صاحب حال ہے خواص کی باتیں عوام سے کہتا ہے۔ اور کلموا علی قدر عقولھم کی رعایت نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بعد اس کے مقلدین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر فتنہ کھڑا کر دیں گے۔

احمد آباد کے قیام کے زمانہ میں سید صاحب نے ایک دن یہ فرمایا کہ میں اس دنیا میں انھیں مادی آنکھوں سے خدا دکھا سکتا ہوں اس بات سے اہل علم کے حلقہ میں ایک قسم کا اضطراب پیدا ہو گیا اور علماء جو سید صاحب کے اثر ورسوخ اور روز افزوں ترقی سے پریشان تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن کے خلاف (لایدرکه الابصار) کا دعویٰ کرنے والے کے قتل کا فتویٰ تیار کر دیا۔

مولانا تاج محمد نے جو اپنے وقت کے بڑے مشہور عالم تھے لوگوں کو اس قسم کی جرأت سے روکا بالخصوص اپنے شاگردوں کو جن کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ سے علم اسی لئے حاصل کیا تھا کہ اس کے ذریعہ سادات کے قتل کا فتویٰ دیا کرو۔

مولانا تاج محمد کی بروقت ترجمانی سے حکام سلطنت نے کسی قسم کی پیش دستی نہیں کی لیکن علماء سوء کی شورش برابر جاری رہی اس لئے سید صاحب فتنہ کے خیال سے ۹۰۳ھ میں احمد آباد سے سانتیج چلے آئے اور یہاں سے نہر والا (پٹن) منتقل ہو گئے جہاں خان سرور کے تالاب کو قیام کے لئے انتخاب کیا۔

سید صاحب کا یہ عام دستور تھا کہ قیام کے لئے شہری زندگی سے الگ کسی مسجد تالاب یا کھلی جگہ کو منتخب کرتے تھے جہاں آپ کا قیام ہوتا تھا اس کو آپ کے معتقدین دائرہ کہتے تھے۔ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ دائرہ کی اصطلاح سید صاحب کی زندگی ہی میں رائج ہو گئی تھی یا ان کی وفات کے بعد اس کا رواج ہوا۔

دائرہ کا اپنا خاص معاشرتی نظام ہوتا تھا۔ جس میں سب ایک گھر کے افراد کی طرح

مل جل کر رہتے تھے۔ محنت ومزدوری سے جو کچھ دستیاب ہوتا اس کا دسواں حصہ خدا کی راہ میں صرف کردیتے باقی کو آپس میں برابر تقسیم کرکے کھاتے تھے۔ صبر وقناعت کا یہ حال تھا کہ کئی دنوں تک کھانے کو کچھ نہ ملتا مگر دلوں کی فراغت اور چہروں کی بشاشت سے یہ گمان ہوتا کہ ابھی شکم سیر ہوکر آرہے ہیں۔

طبقات اکبری میں ہے۔

اگر کشت یا زراعت وتجارت می کردہ دہ یک در راہ خدا صرف می نمود پس ہم چناں شدہ کہ پدر از پسر وزن از شوہر مفارقت گزیدہ راہ فقر وفنا پیش گرفتند وفتوح کہ بادمی آمد خرد وکلاں علی السویہ شریک بودند واگر چیزے بہم نمی رسد تا درسہ روز بہ فاقہ می گزرایند واظہار نمی نمود (۱)

اگر کھیتی باڑی زراعت یا تجارت کرتے تو آمدنی کا دسواں حصہ خدا کے راستے میں صرف کردیتے یہ لوگ آپس میں ایسے رہتے کہ تمام رشتوں کو چھوڑ کر فقر وفاقہ کو اپنا سب کچھ بنالیا تھا۔ سید مہدی کو فتوحات سے جو کچھ حاصل ہوتا سب لوگوں پر برابر تقسیم کردیتے اور اگر دو تین دن تک فاقہ کی نوبت آتی تو اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

اسی قسم کے حالات ملا عبدالقادر بدایونی اور عبدالباقی نہاوندی نے بھی تحریر کئے ہیں (۲)

ہندوستان کی عام تاریخوں میں مذکور ہے کہ بزمانہ قیام بڑلی ۹۰۵ھ میں آپ نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ لیکن اس کے برخلاف مہدوی تاریخوں میں ہے کہ آپ نے جب جونپور سے ہجرت کرکے عظیم آباد کے جنگل کو اقامت گاہ بنایا تو پہلی دفعہ آپ کو الہام ہوا کہ تم مہدی ہو اس کے بعد جب حج کو تشریف لے گئے تو رکن اور مقام کے درمیان کھڑے ہوکر مہدی ہونے کا دعویٰ کیا پھر ۹۰۳ھ میں احمد آباد میں مکرر دعویٔ مہدویت کیا اور جب بڑلی پہنچے تو چھ ماہ کے بعد ۹۰۵ھ میں مؤکد طور پر علی الاعلان

(۱) طبقات اکبری ص ۲۳۷۔

(۲) منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۹۸ وماثر رحیمی ج ۱ ص ۶۳۰۔

مہدویت کا اظہار کیا۔(۱) لیکن مہدوی تاریخوں کی اس روایت کی تائید ہندوستان کی عام تاریخوں سے نہیں ہوتی بلکہ جس مورخ نے بھی مہدویت کے ادّعا کا تذکرہ کیا ہے اس نے تصریح کی ہے کہ جب آپ نہروالا سے بڑلی گئے ہیں تو مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا چرچا بڑلی ہی سے شروع ہوا اس سے پہلے کی زندگی میں آپ کے متعلق مسلمانوں کے عام عقائد کے خلاف کوئی بات نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں جہاں پہنچے لوگ ان کے زہد وتقویٰ، فقر درویشی کو دیکھ کر ان کے گرویدہ ہو گئے کسی جگہ مخالفت نہیں کی گئی۔ اگر مسلمانوں کے عقائد کے خلاف کچھ بیان ہوتا تو اس کا ذکر تاریخوں میں ضرور آتا خاص کر مخالفین تو کبھی بھی معاف نہ کرتے حالانکہ تاریخوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آپ کی مخالفت احمد آباد میں رویت باری تعالیٰ کے مسئلے میں کی گئی اس کے علاوہ یہ امر بھی نہایت اہم ہے کہ اگر آپ حج کے موقع پر مکہ معظّمہ میں مہدویت کا اعلان کئے ہوتے تو تمام دنیائے اسلام میں ایک شور برپا ہوتا اور علمائے مکہ معظّمہ سے اسی وقت بحث ومناظرہ شروع ہو گیا ہوتا مگر کسی تاریخ سے بھی اس قسم کی کسی بات کا سراغ نہیں ملتا جو سراسر عقل کے خلاف ہے۔(۲)

بڑلی میں آپ کا قیام کل چھ ماہ رہا اور اعلان مہدویت کے بعد یہاں علماء اور عوام کی مخالفت حد سے بڑھ گئی اس لئے اسکو چھوڑ کر دھراؤ چلے آئے اور یہاں سے جالور پہنچے اور چار ماہ قیام کرنے کے بعد ۹۰۶ھ میں مارواڑ تشریف لے گئے پھر وہاں سے جیسلمیر ہوتے ہوئے نصرپور کاہہ میں رونق افروز ہوئے۔ رمضان کا اکثر مہینہ اسی جگہ گذار کر ۲۷؍ ماہ مذکور کو نوسو مخلصین کی جماعت کے ساتھ خراسان کی جانب روانہ ہو گئے اور ۹۱۰ھ میں مقام فرخ میں پہنچ کر اقامت گزین ہوئے۔ اسی جگہ ۱۹؍ ذی قعدہ ۹۱۰ھ مطابق ۲۳؍ اپریل ۱۵۰۵ء کو آپ نے دق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

آپ کے صاحبزادے سید محمود نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مقام رج وفرخ کے

(۱) تاریخ پالن پور ج ۱ ص ۷۰ تا ۷۵۔

(۲) مقدمہ رسالہ مناقب اردو ص ۵۸۔

درمیان مدفون ہوئے عشق تمّ سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔(۱)

سید صاحب کی تعلیمات اوران کا اثر

نویں صدی کا زمانہ جو اکبر سے پہلے گذرا ہندوستان میں طوائف الملو کی کا زمانہ تھا روز روز حکومتیں بنتی اور بگڑتی تھیں کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں تھی جو احکام شرع کے اجراء کی ذمہ دار ہوتی مزید برآں علمائے حقانی بہت تھوڑے تھے اور علمائے دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے دنیا طلبی اور مکروفریب کی گرم بازاری تھی اس پر طرہ یہ تھا کہ جاہل صوفیوں کی بدعات ومنکرات نے ایک عالم کو گمراہ کرر کھا تھا ایسے حال میں سید موصوف نے احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا۔(۲)

آپ نے دنیا طلبی، بدعات ومنکرات اور گمراہی سے بچانے کیلئے اپنی تعلیمات اور دعوت وتذکیر کے آٹھ اصول مرتب کئے تھے۔(۱) ترک دنیا (۲) صحبت صادقین (۳) عزلت ازخلق (۴) توکل (۵) طلب دیدارحق (۶) عُشر (۷) ذکر کثیر (۸) ہجرت۔

انھوں نے اپنے مشن کو تقلیل دنیا کی بنیاد پر شروع کیا تھا آپ کا ارشاد تھا کہ دنیا محض کھیتی کی جگہ ہے اسے اپنی منزل نہ بناؤ اس سے زادراہ لومگر اس سے چمٹ نہ جاؤ اس سے فائدہ حاصل کرومگر اس کو اپنے اوپر مسلط نہ کرو۔ سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی آپ کے اصول کے قطعاً خلاف تھی آپ فرماتے تھے کہ مؤمن ذخیرہ نہ کند(۳) آپ کی تعلیمات کا اثر بقول مولانا آزاد یہ ہوا۔

> عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت وتذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے اور متعدد سلاطین وقت نے بیعت کی۔(۴)

---

(۱) ایضاً ص۶۰۔ (۲) تذکیر ص۴۷۔

(۳) مقدمہ سراج الاخبار ص۲۰۳-۱۹۶۔

(۴) تذکرہ ص۴۶۔

آپ کے متوسلین کی زندگی کا نقشہ مولانا آزاد نے اس طرح پیش کیا ہے۔

ان لوگوں کے طور طریق عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے اور ایسے کہ صحابۂ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الٰہی کی ایک جاں نثار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے۔ امیر و فقیر اعلیٰ و ادنیٰ سب ایک رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکام شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔(۱)

سیّد صاحب کے متعلق علماء کی رائے

زمانہ حال و ماضی کے سبھی مورخین اور سوانح نویس خواہ موافق ہوں یا مخالف معترف ہیں کہ سید محمد علوم رسمیہ کے ساتھ زہد و تقویٰ اور فقر درویشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ شیخ علی متقی متوفی ۹۷۵ھ جو سید صاحب کے معاصر اور شدید مخالف تھے جنھوں نے سید صاحب کی تردید میں چند رسالے بھی تحریر کئے ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تقشّف اور استغراق اور استہلاک میں گذرا۔(۲)

ملا عبدالقادر بدایونی متوفی ۱۰۰۴ھ نے سید صاحب کے کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

ایں مرد آیت است از آیات خدا و نیز در ولایت وجلالت و بزرگی محتاج سخن نیست (۳)

(یہ شخص اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور حالات ولایت و بزرگی

(۱) تذکرہ ص ۴٦۔

(۲) دربار اکبری ص ۸۲۴۔

(۳) نجات الرشید ص ۹۳۹۔

میں محتاج تعریف نہیں)۔

شیخ عبدالغنی شطاری بن شیخ عبداللہ شطاری متوفی ۱۰۴۰ھ تحریر فرماتے ہیں:

میر سید محمد جونپوری رحمۃ اللہ مردی خالی از فضیلت نبودہ واز اکابران جونپور بودند در احمد آباد متوطن شدہ بودند در شاہ پور بیرون قلعہ احمد آباد مسجدی بودہ وعقب آں مسجد منزل داشتہ مردی نوارانی ومرتاض بودہ، ہمیشہ مشغول بود ومتوکل وہرگز از خانہ خود بدر نیامدہ وبخانہ ارباب دولت نرفتہ وبرفقر وفاقہ عمر خود بکمال عشرت وشادمانی گذرایند(۱)

(میر سید محمد جونپوری صاحب فضل وکمال اور اکابرین جونپور میں تھے احمد آباد میں شہر سے باہر ایک مسجد تھی اسکے پشت کی جانب ایک مکان میں اقامت گزیں تھے نہایت مرتاض اور نورانی بزرگ تھے ہمیشہ ذکر وفکر میں مشغول رہتے صفت توکل کے سات متصف تھے کبھی گھر سے باہر نہ نکلتے اور امراء کے یہاں حاضری نہ دیتے تھے فقر وفاقہ کی حالت میں نہایت مسرت وشادمانی کے ساتھ عمر گذاردی)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ اپنے ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں۔

ہر کمالے کہ محمد رسول اللہ داشت درسید محمد مہدی نیز بود فرق ہمیں است کہ آنجا باصالت بود وایںجا بہ تبعیت رسول بجائے اور سیدہ کہ ہمچوں اوشد فقط(۲)

(ہر وہ کمال جو محمد...... رکھتے تھے (بجز وحی اور رسالت کے) سید محمد اسکے حامل تھے فرق یہ ہے کہ وہاں اصل تھا اور سید نے ان کی اتباع کی بدولت اس کے مثل حاصل کیا)۔

ابوالفضل المتوفی ۱۰۱۱ھ آئین اکبری میں لکھتا ہے۔

سید محمد جونپوری سید بدھ اویسی است از فراداں روحانیہ فیض برگرفتہ و برصوری ومعنوی علم چیرہ دست از شوریدگی دعویٰ مہدویت کرد بسیارے مردم بردگر دیدند وبسا خارق از و برگزارند۔(۳)

(۱) تذکرۃ الاولیا قلمی نسخہ دارالمصنّفین اعظم گڈھ ص ۱۴۸۔

(۲) دربار اکبری ص ۸۲۴۔ (۳) بحوالۂ دربار اکبری ص ۸۲۲۔

(سید محمد جونپوری (سید بدھ) مادرزاد ولی ہیں بے انتہا فیوض و برکات کے حامل تھے علوم ظاہری و باطنی میں مہارت تامہ رکھتے تھے شوریدگی حال میں دعوائے مہدویت کیا۔ان کے بہت سے ماننے والے ہیں اور بہت سی کرامتیں ان کی جانب منسوب ہیں)

تحفۃ الکرام میں ہے۔

ایشاں سلالۃ الاولیا الکرام واسوۃ النجباء العظام سید نور بخش کہ از سلسلہ کبرو بہ علم فاخرت می افراختند - صاحب تصانیف وکشف وکرامات در تصوف تصرفا ز اہل مقامات بودہ دراصل منشاء شریفش در بلدۂ جونپور الخ (۱)

مولانا آزاد تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ مولانا جمال الدین دہلوی نے سید محمد کی ولایت کے اثبات میں ایک کتاب لکھی اور دلائل وشواہد قاطعہ سے ثابت کیا کہ حضرت سید محمد کی ولایت حق ہے۔(۲)

مندرجہ بالا علماء ومورخین کے علاوہ میاں حاتم سنبھلی، شیخ وجیہہ الدین گجراتی ابن حجر مکی وغیرہ علماء سید صاحب کو عالم حق اور واصل باللہ تسلیم کرتے ہیں۔

دعوائے مہدویت پر ایک نظر

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی ہجری میں بہ چند وجوہ مہدی موعود کا چرچہ عام تھا سرزمین ہند سے عالم اسلام تک ان کے ظہور کے بارے میں افواہ پھیلی ہوئی تھی۔اس عہد کے علماء ومشائخ کی محفلیں مہدی موعود کے ذکر سے گرم رہتی تھیں اس زمانے کے لگ بھگ ابن حجر نے ان احادیث کی خوب ترویج وتشریح کی جن میں مہدی موعود سے متعلق پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح حضرت سید اشرف سمنانی جو اپنے دور کے بلند پایا عالم اور صوفی تھے۔ان کی محفلوں میں بھی مہدی آخر الزماں کی آمد سے متعلق احادیث کا خوب چرچا تھا۔(۳)

(۱) تحفۃ الکرام ج ۱ ص ۴۵۰۔ (۲) تذکرہ، ص ۳۲۔

(۳) لطائف اشرفی ص ۴۴۔

اس عہد کے قریب علماء حرمین نے بھی ایک فتویٰ شائع کیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہجرت نبوی کے ہزار سال پورے ہونے تک مہدی موعود کا ظہور ہو جائے گا۔(۱)

اسی دور میں جب کہ مہدی موعود کے ذکر سے عوام کے ذہن و دماغ بالکل معمور تھے۔ حضرت سید محمد جونپوری نے اپنی تحریک دعوت واصلاح کا آغاز کیا مقصد کی لگن اور اس کی سچائی کے یقین نے اس تحریک میں غیر معمولی قوت پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی تحریک کا غلغلہ جونپور سے گزر کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ اور بے شمار خلق اللہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئی جس میں عالم جاہل، امیر غریب رعایا اور بادشاہ ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ سید صاحب کی حیات تک اس جماعت کے افراد نہایت پاک باطن اور خدا پرست تھے اور کسی قسم کی بدعت یا کوئی نیا عقیدہ ان میں رائج نہیں تھا۔ لیکن سید صاحب کی وفات کے بعد اس جماعت کے عقائد میں تبدیلی آگئی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس عہد میں مہدی کا چرچا عوام و خواص سب کی زبانوں پر تھا۔ اس لیے سید صاحب کے وفات پاتے ہی ان کے جاہل عقیدت مندوں نے اس عقیدے کا کھلے بندوں اعلان شروع کر دیا کہ سید محمد جونپوری ہی مہدی موعود تھے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت سید نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا اور اگر عالم سکر میں یہ الفاظ کبھی آپ کی زبان پر آگئے تھے تو حالت صحو میں اس کی تردید کر دی جیسا کہ بہت سی تاریخوں سے ثابت ہے۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے۔

> سید محمد مہدی جونپوری قدس سرہ پدر دی یوسف واصلش از جونپور مرید و خلیفہ شیخ دانیال واز اولیائے مغلوب الحال وصاحب سکر بود در حالت سکر۔ چنانچہ بعضے اکابر انا اللہ وانا الحق وسبحانی وامثال آں گفتہ اند او لفظ مہدی برزبان آورد واما درحالت صحو مثل دیگر بزرگان از دعوئ مہدویت تائب شد بہ مہدی موعود اقرار نمود اما مردم جہلا کہ درزمان سکر حاضر بودند معاودت اور

(۱) بدایونی ص ۳۸۔

اعتبار نہ کردہ بر سخن اول او اصرار نمودہ اورا مہدی موعود دانستند و درچاہ ضلالت وبطالت افتادند۔(۱)

(حضرت سید محمد کے والد یوسف ہیں۔ جونپور کے رہنے والے تھے۔ شیخ دانیال کے خلیفہ تھے۔ جونپور کے اولیائے کبار میں سے تھے وہ اکثر حالت سکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ جس طرح بعضے اکابرین نے غلبہ حال میں انا اللہ اور انا الحق وغیرہ کہہ دیا اسی طرح سے انھوں نے انا مہدی کا نعرہ لگایا مگر جب افاقہ ہوا تو اس کی تردید کی اور مہدی موعود کا اقرار کیا مگر ان جہلا نے جو اس وقت مجلس میں تھے ان کے غلبۂ حال کے قول ہی کو اصل قرار دیا اور ان کو مہدی موعود کہنے لگے اور گمراہی میں پھنس گئے۔)

صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں۔

مریدانش محمد مہدی آخر الزمانش خوانند واعتقاد نمودند کہ مہدی موعود گویند در آخر الزماں جلوۂ ظہور نمود ہمیں محمد است چنانچہ ایں عقیدہ درمزاج ایشاں راسخ گشتہ وحالانکہ مرشد بایں معنی امر نکردہ ایں بدعت مخترع مریدانش (۲)

(ان کے مریدین انھیں مہدی آخر الزماں کہتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو مہدی آخری زمانہ میں آنے والے تھے وہ یہی سید محمد ہیں۔ چنانچہ یہ عقیدہ ان لوگوں میں پختہ ہوگیا ہے حالانکہ ان کے مرشد نے اس امر کا انہیں حکم دیا تھا بلکہ یہ بدعت سراسر مریدوں کی گڑھی ہوئی ہے۔)

اسی کے قریب قریب مراۃ احمدی کے خاتمے میں بھی ہے۔(۳)

تحریک مہدویت کے بارے میں مولانا آزاد کا خیال ہے:

یہ فرقہ سید محمد جونپوری کی طرف منسوب ہے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقائد میں

---

(۱) خزینۃ الاصفیاء ص ۴۴۷۔

(۲) تحفۃ الکرام ج ا ص ۴۵۔

(۳) مراۃ احمدی ص ۴۶۷۔

بہت سی نئی باتیں اور حدِ غلو سے بھی گذرے ہوئے اعتقادات شامل ہوگئے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت وحق پرستی پر پڑی تھی یعنی دعوت وتبلیغ حق واحیائے شریعت وقیام امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس کا مقصد اصلی تھا اور خود سید اوران کے پیروؤں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست تھے اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں کچھ ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں اور فتنۂ غلو وتاویل پچھلی امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لئے بھی ایک بڑا فتنہ ہے یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت اخلاف کے غلو ومحدثات میں گم ہوگئی۔(۱)

سید محمد جونپوری کے سوانح اور تعلیمات کے مطالعہ سے مجھ پر جو اثر ہوا اس سے میں نے رائے قائم کی کہ وہ اپنے وقت کے بہترین انسان قابل ترین عالم اور کامل ترین صوفی تھے جنکی ساری زندگی تعمیل احکام الٰہی اور اتباع رسول اللہ...... میں صرف ہوئی ایسے شخص نے دعوئ مہدویت کیا ہو مجھے یقین نہیں آتا اور کسی وقت حالت غلبہ میں مہدی ہونے کا اعادہ کیا ہو تو اس کو سہو پر اطلاق کرنا چاہیے جیسا کہ علی متقی نے فرمایا کہ ولی سے بھی ایسی غلطی ہوجاتی ہے اور الہام میں غیر انبیاء سے سہو ممکن ہے بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ آپ کی وفات کے بعد ان کے مقلدوں نے ان کی طرف یہ دعویٰ منسوب کرکے تمام عقائد سے زیادہ اس پر زور دیا اور اسی پر زیادہ اصرار کرتے رہے۔(۲)

☆ ☆ ☆

(۱) تذکرہ، ص ۷۴۔

(۲) مقدمہ رسالہ مناقب، ص ۶۴۔

اُستاذُالملک ملا محمد افضل جونپوری

شرقی عہد ۸۰۴ھ سے مغل بادشاہ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ تک جونپور دیار یورپ میں علوم وفنون کا مرکز رہا ہے۔ مصر وشام اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کے علماء نے اسلامی علوم وفنون پر کم کام نہیں کیا ہے۔ (آثر الکرام ج ا ص ۲۲۲)

جونپور کی تاریخ میں پچاسوں مدرسوں اور خانقاہوں کا پتہ چلتا ہے جن میں ہزاروں طلباء وفضلاء علمی وروحانی مشغلہ میں مصروف رہتے تھے۔ ذیل میں یہاں کے مشاہیر علماء ومشائخ کی مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے ناظرین کو اس کی مرکزیت کا کسی حد تک اندازہ ہوگا۔

عہد شرقی کے مشاہیر

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپوری المتوفی ۸۴۸ھ (۲) قاضی نظام الدین کیکلانی جونپوری مرتب فتاویٰ ابراہیم شاہیہ المتوفی ۸۷۵ھ (۳) شیخ ابوالفتح سون بریس جونپوری المتوفی ۸۵۸ھ (۴) ملا بیرام منطقی خطیب جامع مسجد ظفرآباد (۵) قاضی نصیرالدین گنبدی قاضی شہر جونپور (۶) شیخ عیسیٰ بن تاج الدین جونپوری المتوفی ۸۴۰ھ (۷) ملا عبدالملک بن عادل جونپوری استاذ ملا الہ داد۔

عہد لودھی کے مشاہیر

ملا علاء الدین الہ داد محشی ہدایہ وغیرہ المتوفی ۹۲۳ھ (۲) شیخ حسن بن طاہر جونپوری (۳) شیخ سید محمد جونپوری المتوفی ۹۱۰ھ (۴) شیخ معروف چشتی جونپوری (۵) قاضی

صلاح الدین بن خلیل جونپوری۔

عہد مغل کے مشاہیر

میر سید عبدالاول محدث جونپوری شارح بخاری شریف المتوفی ۹۶۸ھ (۲) ملا محمد یوسف قاضی خان المتوفی ۹۷۰ھ (۳) خواجہ محمد ارزانی مولف مدارج الاخبار المتوفی ۹۸۰ھ (۴) استاذ الملک ملا محمد افضل المتوفی ۱۰۶۲ (۵) ملا محمود بن محمد مصنف شمس بازغہ وغیرہ المتوفی ۱۰۶۲ (۶) دیوان محمد رشید المتوفی ۱۰۸۳ (۷) ملا ضیاء الدین استاذ شاہزادہ بہادر شاہ بن عالمگیر (۸) شیخ عبدالقدوس قلندر المتوفی ۱۰۵۲ (۹) ملا محمد جلیل، ملا محمد حسین، ملا ابوحامد بن حامد، یکے از مرتبین فتاویٰ عالمگیری (علمائے جونپور کا ماضی) ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے نامور علماء و مشائخ اس سرزمین سے اُبھرے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں مدرسہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد کیا ان میں اعلم العلماء افضل الفضلاء جامع علوم ظاہری و باطنی قطب زماں استاذ الملک ملا محمد افضل عثمانی جونپوری کی ذات اپنے عہد میں خاص شہرت اور مخصوص مقام کی مالک ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے بعد آپ جیسی ہمہ گیر اور جملہ علوم وفنون میں ماہر شخصیت سرزمین جونپور سے پیدا نہیں ہوئی۔

سید نور الدین زیدی ظفر آبادی لکھتے ہیں:

دمیکہ ملک العلماء جادۂ عدم پمیو دند اہل جونپور ماتم الوداع علم کردند مگر ندانستند کہ بذات خود ملک العلماء برفت وخلعت فاخرہ علم پس آئندہ استاذ الملک گزاشت (۱)

آپ کا حلقہ درس اس قدر وسیع تھا کہ اس زمانہ میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسب فیض نہ کیا ہو۔

تجلی نور میں ہے:

(۱) تجلی نور ص ۴۴۔

دراں زماں ہیچ کس نبود کہ پیش آں بلاواسطہ زانوے ارادت تہ نکرد وسبق نہ
آموخت صدہا بفیض درس وتعلیم شاں عالم العلوم وفاضل متبحر گشتند (۱)

اس مضمون میں اسی فاضلِ یگانہ کے حالات پیش کیے جائیں گے۔اس مضمون کی ترتیب میں حسب ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔

گنج رشیدی قلمی، گنج ارشدی قلمی، تجلی نور، سبحۃ المرجان، تذکرہ علمائے ہند، نزھۃ الخواطر، معارف اعظم گڑھ مئی ۳۰÷ ان کے علاوہ بحرذخار مصنفہ شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی، بسط الکلام فی وفیات الاعلام از شیخ یحییٰ عباسی الہ آبادی میں بھی ملا افضل کے حالات ہیں لیکن یہ دونوں کتابیں انتہائی کوشش کے باوجود بھی دستیاب نہ ہوسکیں اس لیے ان سے استفادہ نہیں کیا جاسکا۔

نام ونسب اور تاریخ پیدائش

نام محمد افضل، لقب استاذ الملک اوراستاذ العلماء ہے۔سلسلۂ نسب محمد افضل بن شیخ حمزہ بن شیخ فریدالدین بن شیخ بہاء الدین عثانی ہے۔شیخ عثمان ہارونی کی اولاد میں ہیں سلسلۂ نسب اس سے آگے معلوم نہیں ہوسکا۔

صوبہ اودھ کے مشہور تاریخی قصبہ ردولی میں ۱۶؍رمضان ۹۷۷ھ کو بعہد جلال الدین اکبر پیدا ہوئے (۲)۔آپ کے والد شیخ حمزہ گردش زمانہ سے تنگ آکر اپنے آبائی وطن شہر دماوند مضافات مازندران کو خیر باد کہہ کر ہندوستان چلے آئے تھے اور ردولی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

شیخ حمزہ زیور علم سے آراستہ تھے اس لیے عزت ووقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، آپ کے تفقہ اور علم وفضل کا عملی اعتراف اس طرح کیا گیا کہ آپ کو عہدۂ قضا پر مامور کردیا گیا(۳)

(۱) ایضاً ص۴۳۔
(۲) نزھۃ الخواطر ج۵ص۳۵۹، وتجلی نور ص۴۳۔
(۳) نزھۃ الخواطر ج۵ص۳۵۹۔

تعلیم وتربیت

استاذ الملک نے علم وفضل کے گہوارہ میں آنکھ کھولی تھی۔آپ کے والد عالم فقیہ اور مفتی کی حیثیت سے شہر میں ممتاز تھے۔گھر میں فراغت ورفاہت بھی تھی جس کا اثر استاذ الملک کی نشو ونما پر بہت اچھا پڑا۔

ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی اور بہت جلد جملہ علوم وفنون میں دستگاہ پیدا کرلی۔پھر مزید تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور شیخ حسین عمری کے حلقہ درس میں داخل ہوگئے۔یہاں سے فراغت کے بعد ملا ابوحنیفہ تلمیذ حکیم گیلانی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور ان سے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔"الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی تکمیل کے سلسلے میں لاہور بھی گئے تھے۔

تبحر علمی

اس طرح بیس سال کی مدت میں سرآمدہ روزگار ہوگئے۔(۱)

نزھۃ الخواطر میں ہے۔

وجدّ فی البحث والاشتغال حتی برع فی العلم وافتٰی ودرس وله نحو عشرين سنة صارَ من اكابر العُلماء(۲)

تحصیل وتعلیم میں انتہائی محنت وجانفشانی کی تا آنکہ تمام علوم میں فاضل ہوگئے اور بیس سال کی عمر میں اکابر علماء میں شمار کیے جانے لگے۔

نورالدین زیدی رقمطراز ہیں:

درتحصیل علوم چناں ریاضتہا کشید وجانہا کندید کہ بعمر بست سال فاتحہ فراغ

(۱) تجلی نور ص۴۴۔

(۲) نزھۃ الخواطر ص۳۵۹ ج۵۔

خواند وطبع دقیقس نشتر زن عروق اشکالات وفکر بلیغش گرہ کشائے معضلات گشت (۱)

تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

افضل الفضلاء عصر، اعلم العلماء دہر، جامع علوم عقلیہ ونقلیہ، متشرع ومتقی، خوش خلق، سلیم المزاج بود۔ (۲)

ردولی سے جونپور آمد

تعلیم وتحصیل علوم سے فراغت اور جملہ علوم وفنون متعارفہ میں مہارت حاصل ہونے کے بعد اپنے برادر خورد سلطان محمود عثمانی کو ہمراہ لے کر ردولی کا قیام ترک کر کے دارالخیور شہر جونپور کی سکونت اختیار کر لی۔ (۳)

استاذ الملک نے ردولی کی سکونت کیوں ترک کی اور جونپور کب آئے اس سے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ آپ نے ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب جونپور کے علوم وفنون کا غلغلہ پورے ہندوستان میں بلند تھا اس لیے قیاس ہے کہ یہ غلغلہ سن کر استاذ الملک جیسے شائق علوم کے دل میں اس مرکز علمی کی کشش پیدا ہوئی ہوگی اور آپ نے ردولی سے جونپور کا قصد کیا ہوگا پھر یہ سرزمین ایسی دل پسند ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ تذکرہ نگاروں کے سیاق کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فراغت تعلیم کے بعد ہی جونپور چلے آئے تھے اس اعتبار سے جونپور میں آپ کی آمد ۱۰۰۰ کے حدود میں ہوئی ہوگی۔

یہ زمانہ جون پور کے علمی شباب کا تھا اور وہاں متعدد مدارس کو تعلیمی مرکزیت حاصل تھی ان میں چند مشہور مدارس یہ تھے۔

(۱) مدرسہ ملا عبدالباری المتوفی ۱۰۳۶ (۲) مدرسہ ملا شیخ صادق المتوفی ۱۰۶۴ (۳)

(۱) تجلی نور ص ۴۴۔

(۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۱۔

(۳) تجلی نور ص ۴۵۔

مدرسہ ملاشمس الدین بن نورالدین برنوی المتوفی ۱۰۴۷ (۴) مدرسہ مداریہ ملا مداری المتوفی ۱۰۷۲ (۵) مدرسہ ملا خلیل المتوفی (۱۰۷۹) (۶) مدرسہ شیخ حامد (۷) مدرسہ ملا سید مبارک بن خیر محمد وغیرہ(۱)

استاذ الملک نے بھی اپنی قیام گاہ کے متصل دائرۂ افضل کے نام سے ایک درسگاہ قائم کر کے تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اس مدرسہ نے بہت جلد شہرت ومقبولیت حاصل کر لی اور طلباء کا اتنا مرجوعہ ہوا کہ تمام مدارس کی رونق سرد پڑ گئی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

سلوک وتصوف

استاذ الملک نے پوری زندگی گو علماء کے انداز پر گزاری لیکن قدرت نے انھیں صوفی صافی بھی پیدا کیا تھا اس لیے عمر کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ بالآخر شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

شیخ عبدالقدوس قلندرؒ زہد وتقویٰ اور عشق الٰہی میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔استغناء اور ماسوی اللہ سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ جنگلات سے گھاس کاٹ کر فروخت کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔کھانے میں مشتبہات سے انتہائی پرہیز اور اکل حلال کا بڑا اہتمام تھا آپ کی ذات مرجع خلائق تھی خواص وعوام سب آپ کی صحبت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء نے آپ سے کسب فیض کیا۔

آپ کی پیدائش ۹۴۲ میں شہر جونپور میں ہوئی اپنے والد شیخ قیام الدین (۲) بن قطب الدین المعروف بہ قطب بینائے دل سے خلافت پائی تھی۔

اپنے مسترشدین کے شوق وطلب کا نہایت سخت امتحان لیتے تھے۔گنج ارشدی میں

(۱) علمائے جونپور کا ماضی۔

(۲) شیخ عبدالقدوس کے والد کا اسم گرامی شیخ عبدالسلام (علن) بن شیخ محمد بن قطب بینائے دل ہے۔

ہے کہ جب دیوان محمد رشید جونپوری بیعت کے لیے حاضر ہوئے تو ان سے بات تک نہ کی اور دیوان صاحب بھی رعب کی وجہ سے اظہار مدعا نہ کر سکے مگر مسلسل خدمت میں حاضری دیتے رہتے تقریباً ایک برس کے بعد ایک دن قلندر صاحب نے فرمایا کہ کیوں حاضر ہوتے ہو۔ دیوان صاحب نے عرض کیا، بیعت کے خیال سے، حکم ہوا کہ نصف شب کے بعد آنا۔ خانقاہ دریا کے پار تھی اور آدھی رات کے بعد پُل کا دروازہ بھی بند ہو جاتا تھا۔ دیوان صاحب دریا پار کر کے حکم کے مطابق پہنچ گئے۔ اس وقت قلندر صاحب نے بیعت کی۔

تقریباً ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں ۱۲؍شوال ۱۰۵۲ کو اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا مزار جیل خانہ کے جنوب میں سڑک اور جیل خانہ کی چہار دیواری کے درمیان واقع ہے۔(۱)

اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض اہل علم نے عبدالقدوس قلندر اور عبدالقدوس شلطاری کو ایک ہی ذات سمجھا ہے حالانکہ یہ دونوں بزرگ الگ الگ شخصیت رکھتے ہیں شیخ عبدالقدوس شلطاری قدن شاہ اور قطب صدیق سے مشہور ہیں اور ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ نظام آباد کے رہنے والے تھے اور آج بھی نظام آباد میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ شاہ قدن نظام آبادی میر علی عاشقاں سرائے میری کے پیر ہیں اور میر علی عاشقاں کی وفات ۹۰۵ھ میں ہوئی ہے۔(۲)

استاذ الملک نے جونپور آنے کے بعد بیعت کی اور تعلیم و تدریس کے ساتھ مجاہدہ و ریاضت کا بھی سلسلہ جاری رہا اور مختصر مدت میں تصوف کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے اور قطبیت کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔

گنج ارشدی میں ہے۔

مرتب احقر از پیر دستگیر خود شنیدہ فرمود کہ روز وفات استاذ العلماء حضرت بندگی شیخ محمد افضل قدس سرہ در لاہور ہماں روز ملا خواجہ قدس سرہ فرمودہ

(۱) گنج ارشدی قلمی ص ۱۲۴، وتجلی نور ص ۶۸۔

(۲) گنج ارشدی ورق ۱۲۴، وسیر المتاخرین ج ۱ ص ۲۳۵۔

امروز قطبِ جونپور وفات یافت ۔(۱)
شیخ ملا خواجہ سلسلۂ قادریہ کے مشہور مشائخ میں ہیں ۔
صاحب تجلی نور لکھتے ہیں:
قطع نظر علوم ظاہری اہل دل صوفی صافی روشن ضمیر آغاز وانجام حقیقت رابمیز ان اعتبار ہم سنجیدہ بود بیعت از شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری داشت درکرامت وخوارق بغایت ستر نمودہ(۲)
آزاد بلگرامی مرحوم لکھتے ہیں:
انه كان حصور اتقيا حسن الخلق سليم المزاج(۳)
استاذ الملک پاک باطن متقی خوش خلق اور سلیم المزاج تھے ۔

تصانیف

استاذ الملک تمام علوم میں امامت وعبقریت کا درجہ رکھتے تھے مگر ان کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے حلقۂ درس کی وسعت اور مشغولیت نے تصنیف وتالیف کا موقع نہ دیا۔

شاعری

استاذ الملک کبھی کبھی تفننًا فارسی میں شعر بھی کہتے تھے مگر طبعا شعر گوئی کی جانب میلان کم تھا نمونہ کلام یہ ہے۔

بازلف تو تودۂ عنبر چہ کنم — باخال تو مشکنای اذخر چہ کنم
تو کافر و زلف کافر و دل کافر — من نیم مسلماں بسہ کافر چہ کنم (۴)

(۱) گنج ارشدی ورق ۲۲۔ (۲) تجلی نور ص ۴۵۔
(۳) سبحۃ المرجان۔
(۴) تجلی نور ص ۴۵۔

وفات

آپ کے شاگرد رشید فخر استاذ ملا محمود کا انہتر سال کی عمر میں استاذ الملک کے سامنے انتقال ہو گیا تھا استاذ الملک اس صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ چالیس دن تک آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی گئی اور اکتالیسویں دن اس غم کو سینے سے لگائے ۱۹؍ربیع الثانی ۱۰۶۲ کو بعمر چوراسی سال سات ماہ تلمیذ عزیز سے جا ملے۔ استاذ وشاگرد کے تعلق کی یہ مثال ایسی ہے جس کی نظیر تاریخ میں شاذ ونادر ہی ملے گی۔ بعض لوگوں نے تاریخ وفات ۱۹؍ کے بجائے ۱۳؍ربیع الثانی بیان کی ہے۔

مصرع ''زمحمود وافضل بگو آہ آہ'' سے استاذ وشاگرد دونوں کا سنہ وفات نکلتا ہے(۱)

مزار محلّہ سپاہ شہر جونپور میں ریلوے لائن سے مشرق جانب نیم کے درخت کے نیچے واقع ہے راقم الحروف کئی بار بغرض فاتحہ مزار پر حاضر ہو چکا ہے۔

استاذ الملک کے مزاج میں اس درجہ تواضع وانکسار تھا کہ کسی سے خدمت لینا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، اپنا کل کام خود ہی انجام دے لیتے تھے دیوان محمد رشید نقل کرتے ہیں کہ

> حضرت بندگی میاں محمد افضل ہمہ کارہا خودمی کردند حتی کہ چراغ حجرہ خود روشن کردند و کتاب از حجرہ خودمی آوردند (۲)

امراء وحکام کے دربار میں حاضری سے بہت اجتناب کرتے تھے کبھی اپنی غرض لے کر ان کے پاس نہیں گئے اگرچہ حکام آپ کی خدمت باعثِ سعادت سمجھتے تھے البتہ طلباء اور صوفیاء کی ضرورت کے وقت امراء کے پاس جانے میں تأمل نہ تھا۔

تجلی نور میں ہے۔

> باوصف چندیں باستدعا وطلب بہ دربار امراء وملوک نمیرفتی مگر برائے حوائج فقراو طلباء ہمچو مردم بخانہ چشم منتظراں در آمدی (۳)

---

(۱) نزھۃ الخواطر ج۵ ص ۳۵۹۔

(۲) گنج ارشدی ورق ۱۳۶۔ (۳) تجلی نور ص ۱۔

اتنے کمالات کے باوجود کبھی کوئی طلب لے کر امراء کے دربار میں نہیں جاتے تھے البتہ طلباء وفقراء کی ضروریات لے کر نہایت عزت کے ساتھ جاتے تھے۔

اولاد وتلامیذ

استاذ الملک کی کسی اولاد کا ان کے تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے البتہ ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے لیکن ان کی تعیین بھی مشکل ہے تاریخوں میں منتشر طور پر کچھ لوگوں کا پتہ لگتا ہے جن میں مشاہیر حسب ذیل ہیں۔

(۱) ملا محمود بن محمد جونپوری: آپ ولید پور(۱) ضلع جونپور کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت استاذ الملک کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچی۔ بڑے ذہین وفطین اور علم کے بیحد شائق تھے اس لیے تعلیم کے زمانہ میں بڑی محنت وجانفشانی سے تحصیل کی اور بہت جلد اپنے پیشرؤوں سے بھی آگے نکل گئے۔آپ کے طلب واشتیاق کی قدر استاذ الملک بھی کرتے تھے۔آپ فخر استاذ تھے استاذ الملک کے تمام تلامذہ میں آپ کا درجہ علمی اعتبار سے سب سے بڑھا ہوا ہے۔صرف سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کر لی بالخصوص فلسفہ میں ایسا کمال پیدا کرلیا کہ متقدمین میں بھی ان کے ہم پایہ کم نظر آتے ہیں۔متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں ان میں شمس بازغہ اور فرائد محمودیہ بہت مشہور اور اپنے فن میں نہایت جامع ہیں۔ایک عرصہ تک یہ دونوں کتابیں داخل نصاب رہ چکی ہیں۔شمس بازغہ پر متعدد علماء نے حواشی وشروح لکھا ہے۔

شعر وسخن میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔دو دیوان یادگار چھوڑے،دو شعر نمونۃً پیش ہیں۔

برصوفیٔ بے وجد وبال است عبادت — برشیشہ کہ خالیست زمے سجدہ حرام است

اشکے کہ راز عشق بگوید فشاندنی است — طفلے کہ خوش محاورہ افتد نماندنی است

---

(۱) اب ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔

ملا محمود نے اپنے استاذ کی طرح پوری عمر درس وتدریس میں گزاردی آپ کے مشہور شاگردوں میں ملا عبدالباقی جونپوری خاص شہرت کے مالک ہیں۔۱۰۶۲ میں آپ کا انتقال ہوا مزار چاچک پور شہر جونپور میں ہے۔(۱)

(۲) دیوان محمد رشید بھی استاذ الملک کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ استاذ الملک سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ فراغت تعلیم کے بعد بھی ہفتہ میں ایک بار ضرور حاضری دیتے تھے جب تک استاذ الملک نے درس وتدریس کا صریح حکم نہیں دیا اس کا سلسلہ شروع نہیں کیا لوگوں کے اصرار پر فرماتے کہ جس جگہ استاذ الملک جیسی ہمہ گیر شخصیت مصروف تدریس ہو مجھ جیسے شخص کے لیے تدریس کی مسند پر بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔

دیوان صاحب جملہ علوم میں مہارت رکھتے۔ تعلیم وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی شغل تھا اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں مناظرہ رشیدیہ، شرح ہدایۃ الحکمت اور شرح اسرار المخلوقات نہایت جامع اور اہم ہیں رشیدیہ تو اب تک نصاب میں داخل ہے۔

علم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ کا مقام بہت بلند ہے اس دور میں تصوف کے جتنے سلاسل رائج تھے ان سب سے آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی اس وصف میں دیوان صاحب اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور فائق تھے۔

شاعری میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ شمسی تخلص تھا۔ دیوان شمسی کے نام سے آپ کا قلمی دیوان کتب خانہ رشیدیہ جونپور میں اب بھی موجود ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

بر بدن صد زخم خنجر گر زنی ۔۔۔ کے بمیرم جاں بجائے دیگر است

من بیکدم سیر عالم می کنم ۔۔۔ روح را دستے و پائے دیگر است

۱۰/ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۹/رمضان ۱۰۸۳ھ کو وفات پائی۔ مزار محلّہ رشید آباد شہر جون پور میں ہے۔(۲)

---

(۱) تجلی نور ص ۴۹۔

(۲) گنج رشیدی قلمی، تفصیل کے لیے راقم کا مقالہ مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ماہ جون وجولائی ۲۷÷ دیکھئے۔

(۳) ملا ضیاء الدین جونپوری: استاذ الملک کے مشہور شاگرد ہیں جملہ علوم وفنون میں تبحر حاصل تھا۔ حدیث وفقہ اور لغت میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ ایک ہزار سے زائد احادیث کے حافظ تھے۔ قاموس مولفہ مجدالدین فیروز آبادی بھی نوک زبان تھی۔ نہایت متقی، صالح اور پرہیزگار تھے۔ شہنشاہ عالمگیرؒ نے شاہزادہ بہادر شاہ کی تعلیم وتربیت پر آپ کو مامور کیا تھا۔ عین عالم شباب میں وفات پائی۔ اس سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ (۱)

(۴) سلطان محمود عثمانی: آپ استاذ الملک کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ولادت قصبہ ردولی میں ہوئی۔ تعلیم استاذ الملک کی نگرانی میں پائی اور استاذ الملک کے ساتھ جونپور چلے آئے۔ یہیں شیخ مبارک بن خیر محمد جونپوری کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔

سلطان محمود اپنے وقت کے مشہور صوفیاء میں تھے۔ اپنے خسر شیخ مبارک سے بیعت کی اور جملہ مقامات طے کر کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے۔ اپنے زمانہ میں مرجع خاص وعام تھے اور بے شمار کرامات آپ سے صادر ہوئیں۔

تجلی نور میں ہے۔

طبیعت فقر آشنا بود واز خسر خود حضرت مبارک خیر محمد بیعت نمود ودر ریاضت باطنی برخود کشیدہ باندک۔ زمانہ طئی منازل کردہ منازل سلوک وفقر جادۂ مستقیم گشت واز میر علی عاشقاں سرائے میری ہم فراواں برگرفت وبسیار مردم بروگردیدند وبسیار خوارق ازد برگزارند (۲)

صاحب تجلی نور کی یہ تصریح کہ از میر علی عاشقاں سرائے میری ہم فراواں برگرفت محل نظر ہے کیونکہ صاحب سیر المتاخرین کے بیان کے مطابق میر علی عاشقاںؒ کی وفات ۹۰۵ میں ہوئی ہے اور تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان محمود استاذ الملک سے عمر میں چھوٹے ہیں اور استاذ الملک کی پیدائش باتفاق مورخین ۹۷۷ میں ہوئی ہے اس لیے سلطان محمود کا میر علی عاشقاں سے کسب فیض کرنا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۱) معارف مئی ۱۹۷۳ء۔

(۲) تجلی نور ص ۷۷۔

سن وفات معلوم نہ ہوسکا۔مزار محلّہ چاچک پور شہر جونپور میں ہے۔

(۵) محمد ارشد بن دیوان محمد رشید: انھیں بھی استاذ الملک سے شرف تلمذ حاصل تھا۔استاذ الملک ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ان کا پہلا عقد استاذ الملک ہی کی تجویز پر ہوا تھا۔

ولادت ۱۰۴۱ میں ہوئی۔بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطن میں بھی درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔آپ کا مشغلہ بھی تعلیم وتدریس ہی تھا اور اس میں بڑا انہاک تھا۔صبح درس گاہ میں بیٹھتے تو دوپہر کے وقت اٹھتے اور ظہر کی نماز اول وقت میں جماعت سے ادا کرکے پھر درس شروع کردیتے تھے۔طلباء سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے جو خود کھاتے انھیں بھی کھلاتے تھے۔نہایت متقی، پرہیزگار اور پابند سنت تھے اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بڑی بشاشت وانبساط کا اظہار فرماتے کہ سنت نبوی پر عمل کی توفیق ہوئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خاندان رشیدی میں دیوان صاحب کے بعد اس پایہ اور مقام کا کوئی اور شخص پیدا نہیں ہوا۔۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ کو کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔آپ کا مزار بھی اپنے والد مکرم کے پاس رشید آباد میں ہے۔(۱)

(۶) شیخ مولا چندن: نسلاً شیخ صدیقی تھے۔جملہ علوم کی تعلیم استاذ الملک سے حاصل کی۔اپنے دور کے مشاہیر علماء ومحدثین میں شمار کیے جاتے تھے۔علم حدیث سے خاص شغف تھا۔حرمین شریفین کے سفر میں مکہ معظّمہ کے محدثین عظام سے بھی حدیث کی تصحیح اور اسکی سند حاصل کی اسی سفر میں ۱۰۶۲ مکہ معظّمہ میں وفات پائی۔زیادہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔(۲)

☆ ☆ ☆

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۰اج ا۔

(۲) معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۳۰ء۔

حضرت شاہ طیب بنارسی اوران کے اسلاف وخلفاء

ابتدائیہ

بنارس ایک صنعتی اور ایک خاص طبقہ کا مذہبی مرکز ہونے کے علاوہ گذشتہ دور میں اسلامی علوم وفنون اور ارباب فضل وکمال کا بھی مرکز رہ چکا ہے، یہ علاقہ چھٹی صدی میں باقاعدہ اسلامی قلم رو میں شامل ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے اس دیار کو فتح کر کے دہلی سے وابستہ کیا۔ اسی وقت سے علمی وروحانی خانوادے یہاں آ کر آباد ہونے لگے، خاص طور سے نویں صدی ہجری کے آغاز سے جب پورب کی آزاد خودمختار سلطنت کی بنیاد پڑی اور چند سالوں کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی متوفی ۸۴۴ھ تخت نشین ہوا تو اس کے علم پروری علماء نوازی اور عدل گستری کی بدولت پورب کی ساری سرزمین اسلامی علوم اور علمائے اسلام کے حسنات و برکات سے لہلہا اٹھی۔ سلاطین شرقیہ کے بعد افق سلطنت پر لودھی خاندان کا ستارہ چمکا اور غروب ہوا۔ مگر یہاں علم و دانش اور فضل وکمال کی محفلیں جمی رہیں۔ زمانہ نے ایک کروٹ پھر لی اور ۹۳۳ھ میں شاہان مغلیہ کی سلطنت قائم ہوئی تو تیموری خاندان کا پانچواں حکمراں اس خطہ کی علمی ودینی شان و شوکت اور علماء وفضلاء کی کثرت دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھا ''مملکت پورب شیراز ماست'' اسی شیراز ماست کا ایک قابل قدر حصہ بنارس بھی تھا جہاں بہت سے علمی وروحانی خانوادے آ کر اس طرح اقامت پذیر ہوگئے کہ صدیوں تک ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ جاری رہا، ان باہر سے آنے والوں میں قدوۃ اہل تجرید، غریق بحر توحید فرید ثانی شیخ

الاسلام شیخ فرید بن قطب الدین اوران کے برادر خرد امام العارفین ہمام العاشقین شیخ داؤد بن قطب الدین کے خاندان کو علمی و دینی لحاظ سے بڑا فروغ حاصل ہوا، گیارہویں صدی ہجری کے مشہور شیخ شاہ طیب بن معین بنارسی اسی خانوادے کے ایک فرد تھے۔ آئندہ صفحات میں شیخ طیب اوران کے اسلاف اور خلفاء کے علمی وروحانی کارناموں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ماخذ ومصادر

ہماری تحقیق میں اس خاندان کے سب سے قدیم ترین تذکرہ نگار شیخ یٰسین بن احمد بنارسی متوفی ۱۰۷۶ھ ہیں جنھوں نے اپنے شیخ ومرشد طیب بنارسی کی وفات کے بارہ سال بعد مناقب العارفین میں اس خانوادے کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔اس کے بعد شیخ ارشد جون پوری متوفی ۱۱۱۲ھ کے ملفوظات گنج ارشدی میں شیخ طیب کے تذکرہ کے ضمن میں اس خاندان کے اکابر کا ذکر تفصیل سے ہے جس میں کچھ باتیں مناقب سے زائد ملتی ہیں۔گنج ارشدی کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جون پور میں ہے اور میری نظر سے کئی بار گذر چکا ہے۔

بحر ذخار میں بھی اس خانوادے کے بہت سے بزرگوں کا تذکرہ ہے جس کا ایک قلمی نسخہ پیرزادہ شاہ محمود احمد رمز ایڈوکیٹ خانقاہ ملا سید محمدی الہ آبادی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جسے پیرزادہ صاحب کی نوازشوں کے طفیل متعدد بار مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ بعد کے جن تذکرہ نویسوں نے بھی اس خاندان کے کسی بزرگ کا تذکرہ کیا ہے ان کا مرجع یہی کتابیں ہیں۔ چنانچہ نزہۃ الخواطر عربی، سمات الاخیار، مرقع بنارس، تذکرہ مشائخ بنارس وغیرہ میں انہیں کتابوں کے حوالے سے اس خانوادے کا ذکر ملتا ہے۔

(۱) شیخ الاسلام شیخ فرید بنارسی

نام فرید اور لقب شیخ الاسلام ہے۔ شیخ کے مورث اعلیٰ جد گرامی شیخ خلیل فاروقی، ملک عرب سے ترک وطن کرکے ہندوستان وارد ہوئے اور ضلع غازی پور کے مشہور تاریخی

مقام قصبہ بھتری کے متصل منجھوارہ نامی بستی کو توطن کیلئے منتخب کیا۔ یہ بستی قصبہ بھتری اور قصبہ چندولی ضلع بنارس کے درمیان واقع ہے اور ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسی قدیم نام سے آج بھی موسوم ومشہور ہے۔ منجھوارہ نام کا ایک قصبہ ضلع اعظم گڈھ میں بھی ہے مگر اس منجھوارہ سے شیخ خلیل کا کوئی تعلق نہیں۔

مناقب العارفین میں ہے:

گویند کہ شیخ خلیل فاروقی از ولایت بالا چوں بایں دیار رسید در پرگنہ منجھوارہ توطن اختیار نمود۔ (۱)

''لوگوں کا کہنا ہے کہ شیخ خلیل جب ولایت بالا (خراسان) سے اس دیار میں پہنچے تو پرگنہ منجھوارہ کو وطنیت کیلئے منتخب کیا۔''

ایک سطر کے بعد مزید تشریح کرتے ہوئے شاہ یٰسین رقمطراز ہیں:

واز بعضے فرزنداں ایشاں شنیدہ کہ وے (شیخ خلیل) درقریہ جسڑی کہ متعلقات منجھوارہ است می بود، قبر شریف وے درہماں دیہ بالائے حوض بربلندی واقع است۔ (۲)

''شیخ کے بعض لڑکوں سے معلوم ہوا کہ وہ قریہ جسڑی متعلقہ منجھوارہ میں رہتے تھے، وہیں تالاب کے ٹیلے پر ان کا مزار بھی ہے۔''

محترم جناب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب مدیر رسالہ ''معرفت حق'' الہ آباد، متوطن قصبہ بھتری سے معلوم ہوا کہ جسڑی قصبہ بھتری سے متصل ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اسی گاؤں کے قدیم تالاب کے ٹیلہ پر شیخ خلیل فاروقی کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ شیخ خلیل علم وفضل اور زہد وورع کی دولتِ لازوال سے بہرہ یاب تھے اس لئے اس نئے وطن میں بہت جلد اپنا ایک امتیازی مقام پیدا کر لیا۔

صاحب مناقب کا بیان ہے:

(۱) مناقب العارفین ص ۸۸۔

(۲) ایضاً ص ۸۹۔

آں جا بافراغت می بود اکثر امراء وقت کہ معتقد وے بودند خدمت وے را سعادت می دانستند۔

''اس جگہ شیخ فراغت کے ساتھ رہتے تھے اس عہد کے اکثر امراء ان سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی خدمت کرنا سعادت تصور کرتے تھے۔''

یہیں قریب کے موضع خانقاہ میں شیخ خلیل نے اپنے صاحبزادے قطب الدین کا عقد وہاں کے مشہور بزرگ شیخ نور کی صاحبزادی سے کر دیا، اس تعلق سے شیخ قطب الدین منجھوارہ کے بجائے خانقاہ میں شیخ نور کے پاس رہنے لگے تھے۔ شیخ قطب الدین کے دونوں مایۂ صد افتخار اور نادرۂ روزگار صاحبزادگان شیخ فرید و شیخ داؤد کی ولادت اسی موضع میں ہوئی۔

والد شریف وے بندگی شیخ قطب بن شیخ خلیل فاروقی درمقام خانقاہ کہ دہے است معروف نزدیک بھتری می بودند تولد بندگی میاں فرید در ہماں مقام شدہ بود۔(۱)

''شیخ فرید کے والد شیخ قطب بن خلیل فاروقی موضع خانقاہ میں رہتے تھے جو بھتری کے پاس ایک مشہور قریہ ہے۔ شیخ فرید کی ولادت اسی قریہ میں ہوئی۔''(۲)

بنارس میں آمد

یہ بتانا مشکل ہے کہ زندگی کے کس مرحلے میں شیخ فرید نے اپنے مادری وطن خانقاہ کو الوداع کہا اور بنارس کو شرف وطنیت سے نوازا۔ تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے والد شیخ قطب الدین کی وفات کے بعد شیخ فرید معہ برادر خرد شیخ داؤد تحصیل علم کی غرض سے بنارس تشریف لائے، اس وقت شیخ موسیٰ فردوسی خلیفہ ارشد مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری متوفی ۷۸۳ھ کی عظمت وشہرت کا آفتاب نصف النہار میں تھا، یہ دونوں بھائی انہیں کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ یٰسین لکھتے ہیں:

(۱) مناقب العارفین ص ۸۸ (۲) ایضاً ص ۸۷۔

گویند کہ بعد وفات بندگی شیخ قطب بندگی شیخ فرید مع برادر عزیز بندگی شیخ داؤد بقصد تحصیل علم در بنارس رسید چوں دراں وقت در شہر مذکور (بحذف القاب) شیخ موسیٰ فردوسی مشہور ترین وقت بودند بالضرورۃ آں ہر دو برادراں رخ بجانب خانقاہ حضرت ایشاں کردند۔(۱)

''لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ قطب کی وفات کے بعد دونوں بھائی شیخ فرید و شیخ داؤد بغرض تحصیل علم بنارس آئے چونکہ اس وقت اس شہر میں مشہور ترین شخصیت شیخ موسیٰ فردوسی کی تھی ،اس لئے انہیں کی درسگاہ میں حاضر ہوئے۔''

صاحب مناقب کا بیان ہے کہ جس وقت یہ دونوں حضرات شیخ فردوسی کی خدمت میں باریاب ہوئے۔شیخ نے دیکھتے ہی محبت آمیز انداز میں فرمایا'' بیائید فرید'' فرید آؤ پھر مجلس سے اٹھ کر گھر کے اندر گئے اور دو روٹیاں لاکر اپنے دست خاص سے ایک ایک دونوں بھائیوں کو مرحمت کی، پھر فرمایا''نصیب شما از علوم ظاہری و باطنی از برادر عزیز خواجہ مبارک است (ص ۸۹) یعنی تم دونوں کو علمی و روحانی دولت شیخ مبارک کی خدمت سے حاصل ہوگی اور خود ہی از راہ عنایت ایک خادم کے ذریعہ دونوں حضرات کو خواجہ مبارک بنارسی کی درسگاہ میں پہنچادیا۔

تعلیم و تربیت

خواجہ مبارک(۲) کا کاشانہ بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں تھا۔ یہاں پہنچ کر ہر

(۱) مناقب العارفین ص ۸۶۔

(۲) حضرت خواجہ مبارک بنارسی اپنے وقت کے ممتاز علماء وفضلاء میں تھے۔آپ کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا،ابتداء میں درس و تدریس میں خاص شغف رہا کسی شیخ ومرشد سے بیعت وارادت کا تعلق نہیں تھا لیکن صفائی باطن کی دولت سے آغاز ہی سے بہرہ ور تھے۔کبھی کبھی خیال بھی ہوتا تھا کہ کسی سے بیعت کا تعلق قائم کرلیں لیکن علمی تبحر عقیدت کی راہ میں سدراہ بن جاتا تھا،ایک دن ان کے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کے متعلق تواتر سے سننے میں آرہا ہے کہ بڑے صاحب تصرف بزرگ ہیں کیا اچھا ہوتا کہ یہ مجھ پر تصرف فرماتے۔اور اپنی جانب جذب کرلیتے اس خیال کے آنے کے چند یوم کے بعد ایک شب خواب میں دیکھا کہ بنارس کے اکابر حضور......کے استقبال کے ←

طرف سے بے نیاز ہو کر تحصیل علوم میں منہمک ہو گئے۔ خواجہ مبارک کی توجہ اور اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت مختصر سی مدت میں جمیع کتب متداولہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر لی۔ شیخ نے جوہر قابل دیکھ کر، ظاہری علوم سے تکمیل کے بعد ان کی روحانی تربیت بھی شروع کر دی اور کلاہ ارادت ان کے سر پر رکھ کر مشائخ چشت کے اوراد و اذکار کی تلقین فرمائی۔ علوم ظاہری کی طرح اس میدان میں بھی شیخ فرید نے نہایت تیز روی کا مظاہرہ کیا، شب و روز ذکر و فکر، صوم و صلوٰۃ اور اشغال و مراقبہ میں مشغول رہنے کے ساتھ ساتھ شیخ کی خدمت سے بھی یک دم غافل نہ ہوئے تھے۔ شیخ فرید کی اس اطاعت شعاری اور خدمت گذاری نے خواجہ کے دل کو رام کر لیا۔ شیخ فرید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے سے پہلے شیخ سعد اللہ بنارسی خواجہ کے خاص اور محبوب ترین خادم و مرید تھے، وضو اور غسل کی خدمت انہیں سے متعلق تھی، اکثر مبتدیان سلوک کی تربیت بھی انہیں کے حوالے ہوتی تھی اس اختصاص و امتیاز کی بناء پر خواجہ کے متعلقین میں انہیں خاص اہمیت حاصل تھی۔ اپنے

← لئے جا رہے ہیں یہ بھی ان کے ہمراہ ہو رہے اور حضور...... کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ کی آمد کا آوازہ بلند ہو رہا ہے اور لوگ کشاں کشاں ان کی خدمت میں چلے جا رہے ہیں، یہ بھی جانے والوں کے ساتھ ہو رہے اور جب قریب پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ خواجہ بسطامی کی بجائے شیخ محمد بن عیسیٰ صدر مجلس ہیں انھوں نے حاضرین میں سے کسی سے سوال کیا کہ شور تو خواجہ بسطامی کی آمد کا تھا مگر یہ تو شیخ محمد جونپوری ہیں، اس شخص نے جواب دیا کہ بایزید بسطامی زمانہ یہی ہیں۔ یہ سن کر حسن عقیدت سے شیخ محمد کے قریب پہنچے۔ شیخ نے فرمایا مبارک سعادت کا وقت ہے وضو کر کے آ ؤ چنانچہ یہ وضو کر کے آئے تو تحیۃ الوضو پڑھنے کا حکم دیا پھر بیعت فرما کر اپنی کلاہ سعادت سر سے اتار کر خواجہ مبارک کے سر پر رکھ دی۔ نیند سے بیدار ہوئے تو ہاتھ وضو کے پانی سے تر تھا اور سر پر ٹوپی بھی موجود تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر شیخ محمد جونپوری کی عقیدت کا جذبہ موجزن ہو گیا جس کی رو میں تمام علمی غرور بہہ گیا اور جون پور کی راہ لی۔ خدمت میں پہنچے تو خواب میں جو کچھ پیش آیا تھا بعینہٖ وہی معاملہ شیخ نے عالم بیداری میں فرمایا۔ اب تو خواجہ مبارک کے حیرت و استعجاب کی حد ہی نہ رہی۔ چنانچہ فوراً شیخ محمد کے دست حق پر بیعت ہو گئے اور صرف ایک ہفتہ کی مدت میں اجازت و خلافت کی دولت سے مالا مال ہو کر بنارس واپس آئے اور طلباء وفقراء کی تعلیم و تربیت میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پوری زندگی اسی میں گذار دی۔ آپ کی تلقین و تربیت سے بہت سے لوگ درجہ تکمیل تک پہنچے اور اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے جن میں شیخ الاسلام حضرت شیخ فرید بنارسی، شیخ سعد اللہ بنارسی، شیخ بدھ حقانی جونپوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اوپر خواجہ کی ان مہربانیوں، اور عنایتوں کو دیکھ کر انھیں بھی یقین تھا کہ خواجہ اپنا جانشین اور خلیفہ مطلق مجھے ہی منتخب فرمائیں گے۔ لیکن شیخ فرید کے خانقاہ میں آجانے اور ان کی صلاحیتوں کے اجاگر ہو جانے کے بعد شیخ سعداللہ کا وہ اختصاص باقی نہ رہا، بلکہ شیخ فرید بھی اس میں برابر کے شریک ہو گئے۔

خلافت و جانشینی

شیخ سعداللہ کا دستور تھا کہ خانگی ضروریات کے تحت ہفتہ یا مہینہ میں گھر تشریف لے جاتے، رات مکان پر گذار کر صبح کو خواجہ کی خدمت میں واپس آجاتے۔ حسب دستور ایک مرتبہ گھر گئے ہوئے تھے کہ شب میں خواجہ نے بوقت تہجد انہیں یاد فرمایا، چونکہ شیخ صاحب موجود نہیں تھے، اس لئے شیخ فرید نے عرض کیا ''فرید حاضر است'' خواجہ خاموش ہو رہے، کچھ دیر کے بعد پھر شیخ سعداللہ کو آواز دی، شیخ فرید نے عرض کیا ''فرید حاضر ہے'' خواجہ پھر خاموش ہو گئے اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد تیسری بار بلند آواز سے انہیں پکارا۔ شیخ فرید نے ڈرتے ہوئے باادب عرض کیا کہ شیخ صاحب آج موجود نہیں ہیں، گھر تشریف لے گئے ہیں۔ خواجہ نے فرمایا فرید غسل کیلئے پانی لاؤ شیخ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ خواجہ مبارک کا معمول تھا کہ وہ نماز پنج گانہ اور تہجد کیلئے تازہ غسل فرمایا کرتے تھے۔ غسل سے فارغ ہو کر تہجد میں مشغول ہو گئے۔

شیخ فرید حجرہ کے متصل مؤدب کھڑے رہے، تہجد کے بعد خواجہ مراقب ہو گئے، مگر شیخ فرید بدستور اسی طرح کھڑے رہے۔ تقریباً سوا گھنٹہ کے مراقبہ کے بعد خواجہ نے شیخ فرید کو آواز دی اور حجرہ کے اندر طلب کیا شیخ فرید لرزاں و ترساں حجرہ میں داخل ہوئے اور خواجہ کے حکم سے باادب روبرو بیٹھ گئے۔ خواجہ نے اسی وقت اپنا خرقۂ خاص ان کے زیب تن کیا اور فرمایا:

''ہر طالبے کہ پیش نما آید و آں را اہل دانی خرقہ پوشانی و تلقین نمائی''

''جو طالب بھی تمہاری خدمت میں آئے اور تمہیں اس میں صلاحیت معلوم ہو، تو

اسے بیعت کر کے اوراد و وظائف کی تلقین کرنا‘‘

پھر مزید نوازش و کرم کی بارش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

’’فرزند من و جانشین من توئی نام من روشن خواہد شد ولایت بنارس را بتو دادم و ہدایت اہل آں ولایت بتو سپردم‘‘ (۱)

’’میرا (روحانی) فرزند اور جانشین تو ہی ہے میرا نام تیرے ذریعہ سے روشن ہوگا، اس شہر کی ولایت اور اہل شہر کی ہدایت کا کام میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔‘‘

اس کے بعد ان الفاظ میں چند نصیحتیں فرمائیں:

’’باید کہ طالباں ہمدراں بمدارات وتواضع گذاری و با فقراء سلوک نیکو کنی و با طالب علماں مہرباں باشی و درس علوم ظاہری نہ گذاری، و ہر چہ از غیب رسد خرچ کنی‘‘ (۲)

’’طالبان سلوک کے ساتھ ہمیشہ مدارات و تواضع سے پیش آنا، فقراء کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا اور طالب علموں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا اور علوم ظاہری کے درس کو برابر جاری رکھنا اور جو کچھ فتوحات ہو اسے خرچ کرتے رہنا۔‘‘

صبح کے وقت شیخ سعد اللہ خواجہ کی خدمت میں پہنچے تو انہیں اپنی محرومی پر نہایت صدمہ ہوا اور فرط حرمان و یاس سے آنکھیں اشک بار ہوگئیں، ان کے اس رنج و اضطراب کو دیکھ کر خواجہ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا: ماشاء اللہ کانَ، اپنے کو مبتلائے رنج و یاس مت کرو اس سعادت میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ ’’سعد اللہ تا سعد اللہ و فرید تا قیامت‘‘ خواجہ کی پیشین گوئی بعد میں درست نکلی۔ شیخ سعد اللہ بھی خلافت و اجازت سے شرف یاب ہوگئے، مگر ان کا سلسلہ ان ہی کی ذات پر منقطع ہوگیا۔ بالمقابل ان کے شیخ فرید بنارسی کا سلسلہ ڈھائی صدی تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ جاری رہا اور ان کی خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ اربابِ علم و فضل اور اصحاب خیر و صلاح پیدا ہوتے رہے۔

(۱) مناقب ص ۹۱۔

(۲) مناقب ص ۹۱۔

تعلیم وارشاد

خواجہ مبارک کے ساتھ شیخ فرید کی گرویدگی اورمحبت کا یہ عالم تھا کہ علوم شریعت و طریقت میں درجۂ کمال پر فائز ہو جانے کے بعد بھی ایک لمحہ کیلئے ان کی صحبت سے علیحدگی گوارہ نہ تھی۔ چنانچہ خواجہ کی زندگی بھران کی صحبت سے جدا نہ ہوئے اوراکتساب فیوض کرتے رہے، خواجہ کی وفات کے بعدحسب ارشاد سجادۂ مشیخت پر بیٹھے اور سالکین کی تربیت وتلقین کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ عام طور سے ظہر کے بعد درس دیتے تھے۔(۱)

مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے افسوسناک رہا ہے کہ ان کے درجات ومراتب اورکرامات وتصرفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب گئی۔شیخ فرید کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔تذکرہ نگاران کے روحانی تصرفات و درجات کا تو تفصیل سے ذکر کرتے ہیں لیکن علم ظاہری کے سلسلے میں سرسری طور سے یہ کہہ کرگذر جاتے ہیں کہ بعدظہر سبق گفتے۔

اس لئے تلامذہ کی مکمل فہرست پیش کرنا ممکن نہیں،تلاش وتحقیق کے بعدصرف چار حضرات کے متعلق صراحت سے معلوم ہوسکا کہ انھوں نے شیخ فرید سے تعلیم حاصل کی،ان میں ایک شیخ کے خلف اکبر شیخ محی الدین بنارسی اور دوسرے ان کے برادرزادہ شیخ حسن بن شیخ داؤد بنارسی ہیں ان دونوں حضرات نے جملہ علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل شیخ فرید ہی سے کی۔تیسرے اور چوتھے اسدالعلماء شیخ نصیرالدین مصطفیٰ آبادی جھوسوی متوفی ۹۸۰ھ اور شیخ محمد حافظ بن حبیب اللہ بنارسی نبیرۂ شیخ فرید ہیں۔ان دونوں حضرات نے شیخ سے نحووصرف وغیرہ کی چندکتابیں پڑھیں۔

حالانکہ خود مناقب العارفین سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ فرید کی خدمت میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد ہروقت رہتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ یہ عبارت ہے۔

(۱) مناقب ص۹۳۔

''حضرت بندگی میاں (شیخ فرید) بتقریب عرس عزیزاں جائے تشریف برده بود جمیع طلبہ ہمراہ وے بودند۔''(۱)

''حضرت شیخ فرید کسی عزیز کی دعوت کے سلسلے میں کسی جگہ تشریف لے گئے تھے، تمام طلبہ ہمراہ تھے۔''

مطبخ کے خرچ کے ضمن میں ہے:

''خرچ مطبخ وے بحدے رسید کہ قریب صد کس از فقراء وطلبۂ علم ومہمان بر سفرۂ وے حاضر شدند''(۲)

''شیخ کے مطبخ کا خرچ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تقریباً ایک سو فقراء وطلبہ اور مہمان روزانہ دسترخوان پر موجود رہتے۔''

ان تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کی خدمت میں طلبہ کی کثیر جماعت موجود رہتی تھی، لیکن ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک حرف بھی نہیں ملتا کہ طریقہ تعلیم کیا تھا، نصاب میں کیا کیا کتابیں تھیں۔ پھر علوم وفنون میں شیخ کا کیا مقام تھا۔ کتنے طلبہ شیخ کی درسگاہ سے فارغ ہوکر نکلے۔ یہ سوالات عصر حاضر کے تذکرہ نگاروں کے اذہان میں ابھرتے ہیں۔ لیکن قدیم دور کے تذکرہ نویسوں کی جانب سے ان سوالوں کے جوابات سے عام طور پر محرومی ہی ہوتی ہے۔

خدمت خلق

خواجہ کی حیات ہی میں ان کی جانب لوگوں کا رجوع ہونے لگا تھا، لیکن سجادۂ مشیخت پر بیٹھنے کے بعد تو عام شہرت ومقبولیت حاصل ہوگئی اور ارادتمندوں کا حلقہ نہایت وسیع ہوگیا۔ طلبہ اور سالکین کی ایک بڑی تعداد ہر وقت خانقاہ میں موجود رہتی تھی، امراء وحکام بھی حاضری کو سرمایۂ سعادت خیال کرتے تھے۔ متعدد حکام نے عقیدت میں جاگیر

(۱) مناقب ص ۶۸۔

(۲) مناقب ص ۹۳۔

کے پروانے بھی پیش خدمت کئے ،لیکن تجرید وتفرید اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ ان کی جانب نظر التفات بھی نہ کی، عسرت و تنگی اور فقر وفاقہ کے ساتھ طلبہ وفقراء کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ متعدد دن فاقے میں گذر جاتے، خانقاہ کے طلبہ اور سالکین کی حالت بھی شیخ سے مختلف نہ تھی۔انہیں حالات میں ایک شب شیخ ومرشد خواجہ مبارک کو خواب میں دیکھا کہ فرمارہے ہیں ''اے فرید فرداہد یہ ازغیب رسد البتہ قبول خواہی کرد، ہرگز رد نہ کنی۔خواجہ کی پیشین گوئی کے مطابق دوسرے دن پرگنہ کسوارہ کے حاکم کا فرستادہ پانچ سو بیگھ کا پروانہ لے کر حاضر ہوگیا۔مناقب میں ہے:

''صباح آں وقت شخصے از نوکران بعضے حکام پرگنہ کسوارہ پروانۂ پانصد بیگھ زمین از برائے خرچ فقراء آورد ہر چند دل وے بدو مائل نہ بود اماز جہت اطاعت حکم حضرت خواجہ قبول کرد۔''(۱)

''اسی صبح کو حاکم پرگنہ کسوارہ کا ایک ملازم پانچ سو بیگھ آراضی کا پروانہ لے کر حاضر خدمت ہوا، ہر چند کہ شیخ کا دل قبول کرنے سے ابا کر رہا تھا لیکن مرشد کے حکم کی تعمیل میں قبول کرلیا۔''

اس کے بعد سے تنگیٔ معیشت اور فقر وفاقہ کی نوبت نہ آئی۔رفاہیت وفراغت کے اس دور میں مرشد کی وصیت ''ہر چہ ازغیب رسد خرچ کنی'' پر شیخ نے بڑے حوصلہ سے عمل کیا، جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شیخ یٰسین بنارسی رقمطراز ہیں:

''بعد ازاں خرچ مطبخ وے بحدے رسید کہ قریب صد کس از فقراء وطلبہ ومہمان بر سفرۂ وے حاضر شدند واز احوال ہمسائیگاں بہ کمال خبر گرفتی وہمہ را یومیہ طعام فرستادی واز اکثر مردم قبائل کما حقہ خبر دار شدی ہیچ یکے را محروم نہ گذاشتی ہمہ را بقدر قسمت حصص معین ساختہ۔''(۲)

''اس کے بعد شیخ کے مطبخ کا خرچ اس قدر وسیع ہوگیا کہ تقریباً سو افراد ازقبیل طلبہ،

(۱) مناقب ص۹۳۔

(۲) مناقب ص۹۳۔

فقراء اور مہمانوں کے دسترخوان پر موجود رہتے، ہمسایوں کے یہاں روزانہ پکاپکایا کھانا بھیجتے۔اہل خاندان میں اکثر کے وظیفے بقدر حصہ متعین کردیا اور کسی کو بھی محروم نہ رکھا۔''

اور خود شیخؒ کا اپنا معاملہ یہ تھا کہ ''اما خود دریافت شاقہ کشیدے واکثر صائم ماندے''۔اسی دور میں چند بار حرمین شریفین کے سفر میں بھی گئے اور حج و زیارت کی سعادت سے شرف یاب ہوئے۔

''گویند کہ وے چندمرتبہ بہ سعادت زیارت حرمین شریفین مشرف شدہ۔''(۱)

کہتے ہیں کہ وہ (شیخ فرید) متعدد بار حرمین شریفین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔

وفات اور مدفن

شیخ کے خلف اکبر شیخ محی الدین کسی تقریب کے سلسلے میں چنار تشریف لے گئے تھے اس وقت وہاں کا حاکم ایک افغانی پٹھان تھا، خان کو شیخ محی الدین کا گھوڑا بہت پسند آیا اور بزور طاقت شیخ محی الدین سے لے لیا۔صاحبزادے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھوڑے کی بازیابی کیلئے شیخ سے چنار چلنے کی درخواست کی۔شیخ نے انہیں ہر چند سمجھایا اور صبر کی تلقین کی۔لیکن ان کا اصرار واضطراب بڑھتا ہی گیا۔اس لئے ان کی رعایت خاطر میں اپنے برادر خرد شیخ داؤد اور چند دیگر متعلقین کی معیت میں براہ دریا چنار تشریف لے گئے۔شیخ کے وہاں پہنچتے ہی ارادتمندوں اور عقیدت کیشوں کا ان کے گرد زبردست مجمع اکٹھا ہو گیا۔شیخ کی اس مقبولیت اور ہردلعزیزی کو دیکھ کر ظالم افغانی بھی خدمت میں حاضر ہوا،اور نہایت خاطر مدارات اور نیازمندی کا مظاہرہ کیا اور شیخ کی تشریف آوری کے مقصد پر مطلع ہوتے ہی گھوڑا صاحبزادے کے حوالے کردیا،اور جب شیخ وہاں سے واپس ہونے لگے تو مشایعت میں دریائے گنگا تک آیا جب شیخ معہ رفقاء کے کشتی پر سوار ہو گئے تو خبث باطنی کی وجہ سے ملاح سے اشارہ کردیا کہ کشتی ساحل تک پہنچنے نہ پائے، درمیان ہی میں کسی تدبیر سے غرق کردینا۔چنانچہ کشتی جب بیچ دھارے میں پہنچی ملاح نے حاکم چنار کی

(۱) مناقب ص ۸۸۔

ہدایت کے بموجب کشتی کو درست کرنے کے بہانے سے ایک پڑے کو اکھاڑ دیا اور کشتی مع سواروں کے غرقاب ہوگئی۔ رفقاء میں چند افراد بدقت تمام جان بچا سکے۔ بقیہ تمام لوگ جن میں غریق بحر توحید، رئیس اہل تجرید حضرت شیخ فرید اور ان کے برادر عزیز شیخ داؤد بھی تھے۔ دریائے گنگ کی تیز موجوں کی آغوش میں اس طرح کھو گئے کہ تلاش بسیار کے باوجود بھی کچھ سراغ نہ مل سکا یہ حادثہ فاجعہ ۱۴؍شوال ۹۰۶ھ کو وقوع میں آیا۔(۱)

ایک غلطی کا ازالہ

محترم سید اقبال جون پوری اپنی مشہور تصنیف ''تاریخ شیراز ہند جون پور'' میں لکھتے ہیں ''(شیخ فرید) بحکم پیر سیر وسیاحت ختم کر کے جون پور تشریف لائے۔ محمود شرقی کے دور میں کچھ دنوں مشیر سلطنت رہے اس کے بعد جو گوشہ نشیں ہوئے تو مرتے دم تک پھر قدم باہر نہ نکالا۔ آپ کا مزار محلّہ شاہ گنج جون پور میں بعمارت پختہ و بلند موجود ہے۔(ص ۶۰۹)

صاحب شیراز ہند کی تصریح کے بالمقابل محلّہ سنار پورہ شہر بنارس میں واقع ایک مزار کی نسبت شیخ فرید کی جانب کی جاتی ہے اور سالانہ ۱۴؍شوال کو اس کا عرس بھی ہوتا ہے۔

لیکن یہ دونوں روایتیں تاریخی اعتبار سے پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں کیونکہ خاندان فریدی کے پروردہ شیخ یٰسین بنارسی خلیفہ و جانشین شیخ طیب بنارسی اور شیخ محمد رشید جونپوری خلیفہ ارشد شیخ طیب موصوف دونوں اس پر متفق ہیں کہ شیخ فرید معہ برادر عزیز شیخ داؤد دریائے گنگا میں غرق ہو گئے اور تلاش بسیار کے باوجود دونوں کا جسد مبارک دستیاب نہ ہو سکا۔

> حضرت وے با برادر عزیز میاں شیخ داؤد قدس سرہما پیدا نشدند در آب غوطہ خوردہ ناپید شدند ہر چند بعضے معتقدان وے دامہا انداختند وتفحص نمودند، مگر اثرے ازاں بزرگاں یافتہ نشد۔(۲)

(۱) مناقب ص ۹۷۔

(۲) مناقب ص ۹۷۔

''حضرت شیخ فرید معہ شیخ داؤد، ظاہر نہ ہوئے پانی میں ڈوب کر ناپید ہوگئے۔ بعض معتقدوں نے جال بھی ڈالا مگر کوئی سراغ ان دونوں بزرگوں کا نہ مل سکا۔''

پھر چند سطر کے بعد لکھتے ہیں: ''قبر او بر روئے زمین نیست'' یعنی ان کی قبر روئے زمین پر نہیں ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی ہند کے مشہور مورخ و محقق مولانا سید عبدالحئی حسنی بریلوی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''نزہۃ الخواطر'' میں گنج ارشدی کے حوالہ سے اسی تحقیق کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ص ۲۵۸ ج ۴۔

رہا جون پور کا قیام اور مشیر سلطنت کا منصب تو یہ باتیں بھی بے اصل ہیں۔ مناقب اور گنج ارشدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے آخر لمحہ تک شیخ کا قیام بنارس ہی میں رہا۔ سفر حج کے علاوہ کبھی بھی زاویۂ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا۔ اور نہ مدت العمر کسی امیر یا حاکم کے دربار میں گئے۔ مناقب میں صاف موجود ہے کہ ''در مدت عمر پیش حاکے و دنیاداراں نہ رفت'' زندگی میں کبھی کسی حاکم اور دنیادار کے پاس نہیں گئے۔

خلفائے عظام

شیخ فرید بنارسیؒ کے فیض صحبت سے بہت سے لوگوں نے اکتساب فضل و کمال کیا اور منزل تکمیل وارشاد تک پہنچے۔ شیخ یٰسین لکھتے ہیں: و وے را خلفا بسیار بودند کہ بمرتبۂ تکمیل رسیدند'' (۱) ان خلفائے بسیار میں مندرجہ ذیل حضرات نے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور ان کا سلسلۂ فیض ایک عرصہ تک جاری رہا۔

(۱) شیخ حبیب اللہ بنارسی صاحبزادہ جانشین شیخ قدس سرہ۔

(۲) شیخ غیاث الدین حسن بن شیخ داؤد بنارسی رحمتہ اللہ علیہ۔

ان دونوں بزرگوں کے حالات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) میر سید بدہ بہاری

یہ اپنے وقت کے متبحر عالم، عظیم المرتبت شیخ اور ماہر طبیب تھے۔ شیر شاہ سوری آپ کا

(۱) مناقب ص ۹۴۔

نہایت معتقد تھا اور بڑے نیازمندانہ طور سے آپ سے پیش آتا تھا۔ اس وقت کے اکثر افغانی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ احکام شرعیہ کے اجراء میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عبادت وریاضت کے ساتھ طلبہ کو درس دینے کا بھی معمول تھا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی الارشاد کی ایک عمدہ شرح بھی لکھی۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی۔ آپ کا مزار موضع مسوئیں صوبہ بہار میں ہے۔(۱)

(۴) شیخ مبارک محدث بنارسیؒ

شیخ مبارک بن شیخ ارزآنی کے جد اعلیٰ رہتک سے ترک سکونت کر کے نواحی شہر بنارس میں بکھرا نامی قریہ میں آباد ہوگئے تھے، اسی جگہ شیخ مبارک کی ولادت ہوئی، بنارس اور جونپور کے علمائے عصر سے علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی، فقہ، اصول فقہ، اور حدیث میں تبحر کا درجہ حاصل تھا، مشارق الانوار للصنعانی کی احادیث کو مشکوٰۃ کی ترتیب پر از سر نو مرتب کیا، اور اس کا نام مدارج الاخبار رکھا۔ اس علمی خدمت سے ماہ رجب ۹۵۲ھ کو فارغ ہوئے۔ آپ شیر شاہ سوری کے دربار سے منسلک تھے اور آخر میں ترقی کر کے منصب وزارت تک پہنچے۔ وزارت کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ذکر واذکار اور عبادت وریاضت میں سرمو فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ اپنے مرشد شیخ فرید سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ ۹۸۰ھ یا ۹۸۱ھ میں وفات ہوئی۔ آپ کی اولاد بنارس اور جونپور میں آباد ہے۔(۲)

(۵) شیخ لاؤجون پوریؒ

شیخ لاؤ موضع قاضی پورہ متصل مڑیاہوں ضلع جونپور کے رہنے والے تھے۔ پوربی زبان کے زبردست شاعر تھے۔ اسرار طریقت کو اشعار میں نہایت اچھوتے انداز میں بیان کرتے تھے۔ اپنے شیخ ومرشد شیخ فرید کے مناقب ومحامد پر ایک طویل نظم پوربی زبان میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ عرصۂ دراز تک اس دیار کے قوال اپنی محفلوں میں اسے گاتے تھے۔ مڑیاہوں کے اطراف وجوانب میں شیخ لاؤ کے بہت سے مریدین تھے۔

(۱) مناقب ص۹۴، وتذکرہ علمائے ہند ص ۳۱۔

(۲) مناقب ص۹۴۔ وتجلی نور ص۵۵، ونزہۃ الخواطر ص۲۷۷ ج۴۔

قاضی پورہ ہی میں انتقال ہوا۔ اور وہیں دفن کئے گئے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اب بھی قاضی پورہ میں آباد ہیں۔(۱)

اولادِ امجاد

مبدءِ فیاض نے شیخ فرید کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا، آپ کے تین صاحبزادے تھے جن میں سب سے بڑے شیخ محی الدین اور چھوٹے شیخ حبیب اللہ تھے۔

(۱) شیخ محی الدین بنارسیؒ

یہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ جملہ علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد ماجد ہی سے کی تھی، تمام علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شیخ کی زندگی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

مناقب میں ہے:

> ''اعلم الزماں بندگی شیخ محی الدین کہ در علم حالت قوی داشت و جمیع کتب متداولہ بحضور والد شریف تحصیل نمودہ بود و درس می گفت در صلاح و تقویٰ بےنظیر بود۔''(۲)

''اعلم الزماں بندگی شیخ محی الدین علم میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے، مروجہ نصاب کی جملہ کتابوں کی تحصیل اپنے والد ہی سے کی تھی اور درس و تدریس کا مشغلہ تھا۔ صلاح و تقویٰ میں بینظیر تھے۔''

حضرت شیخ فرید کے ہمراہ متعدد بار زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ مناقب میں ہے۔

---

(۱) مناقب ص ۹۵۔

(۲) مناقب ص ۹۵۔

''گویند کہ وے ہمراہ پدر بزرگوار چند مرتبہ بحرمین شریفین رفتہ واز سعادت طواف مشرف گشتہ''(۱)

''بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ محی الدینؒ پدر بزرگوار کے ہمراہ چند بار حرمین شریفین حاضر ہوئے اور طواف وزیارت کی سعادت لوٹی۔''

انہیں کے گھوڑے کی بازیابی کے سلسلے میں شیخ چنار تشریف لے گئے تھے۔اور واپسی میں غرقابی کا حادثہ پیش آیا۔والد ماجد کی وفات کے بعد بنارس سے کچھ فاصلہ پر محی الدین پور کے نام سے ایک آبادی قائم کرکے وہیں رہنے لگے تھے۔محی الدین پور ہی میں کسی تالاب کے ٹیلے پر آپ کا اور آپ کی اولاد کا مزار ہے۔تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی۔(۲)

(۲) شیخ ابواللیث بنارسیؒ

یہ شیخ کے منجھلے صاحبزادے ہیں۔علوم ظاہری سے چنداں تعلق نہیں تھا۔ابتداء ہی سے ان پر جذب وسکر کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔سماع سے خاص ذوق تھا۔بحالت سماع انتقال ہوا۔آپ کا مزار محلّہ بھدوَں میں حضرت خواجہ مبارک کے مزار کے احاطہ میں ہے۔

(۳) شیخ حبیب اللہ بنارسیؒ

یہ اپنے بھائیوں میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے تھے۔لیکن فضل وکمال میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔حضرت شیخ فریدؒ انہیں بہت چاہتے تھے۔اور ایک دم کے لئے بھی اپنے پاس سے الگ نہ ہونے دیتے تھے،اور ان کی تعلیم وتربیت پر بطور خاص توجہ فرماتے تھے،چنانچہ انھوں نے بھی اپنی فطری صلاحیتوں اور نیک بختی کی بناء پر اکتساب فیوض میں مطلق کوتاہی نہیں برتی اور شیخ کی حیات میں ہی سلوک کے منازل طے کرکے خلافت واجازت سے مشرف ہوئے۔ان کے اوصاف ومحامد کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ یٰسین لکھتے ہیں:

(۱) ایضاً۔ (۲) ایضاً۔

''بکمالات باطنی آراستہ بودو باخلاق حمیدہ پیراستہ خدمت فقراء ومسافراں بوجہ اتم کردے بدلجوئی غریباں کماحقہ نمودے وعمدہ خوبیہائے وے آں بود کہ جملگی اوقات حاضر خدمت والد بزرگوار بودے وخلاف مرضیٔ وے عمل نہ نمودے''۔(۱)

''کمالات باطنی سے آراستہ اوراخلاق حمیدہ سے پیراستہ تھے فقراء اورمساکین کی خدمت وخاطرداری میں ذرا بھی تساہلی نہیں کرتے تھے۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہمیشہ والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر رہتے۔اوران کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے۔''

شیخ فرید قدس سرہ کے سلسلے کوان کے ذریعہ بڑا فروغ حاصل ہوا،اس دیار کے بے شمار افراد ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے اور بہت سے لوگ تکمیل وارشاد تک پہنچے۔

مناقب میں ہے:

''اکثر طالبان از دولت توجہ وے بمقامات عالی رسیدند دروے شاہد مقصود دیدند۔''(۲)

''اکثر طالبان (سلوک) ان کی توجہ کی برکت سے بلند مرتبہ پر پہنچے اور اپنے مقاصد سے ہمکنار ہوئے۔''

زندگی کے آخرایام میں حج وزیارت کے ارادہ سے عازم مکہ معظّمہ ہوئے مگر راستہ ہی میں فرنگی رہزنوں نے کشتی پرحملہ کرکے غرق کردیا اورتمام مسافروں کے ساتھ یہ بھی ڈوب کر جاں بحق ہوگئے۔

شیخ حبیب اللہ کی وفات کے بعدان کے صاحبزادے شیخ محمد حافظ بنارسی مسند سجادگی پر بیٹھے۔شیخ حافظ صاحب نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم وفاضل بھی تھے۔تعلیم وتحصیل اپنے جد بزرگوار شیخ فرید اور خاندان کے دوسرے اکابر سے کی تھی۔

(۱) مناقب ص۹۶۔

(۲) ایضاً ص۹۹۔

عبادت وریاضت میں اپنے وقت میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔

شیخ یٰسین کا بیان ہے:

''وے جمیع کتب متداول تحصیل نمودہ بعضے کتب بخدمت جد بزرگوار ہم خواندہ ونظر قبولیت ایشاں ہم می داشت وے در مجاہدہ وریاضت یگانہ بود'' (۱)

''انھوں نے تمام متداول کتابوں کو پڑھا تھا، بعض کتابیں اپنے جد بزرگوار (شیخ فرید) سے بھی پڑھا۔ شیخ کے مقبول نظر تھے اور مجاہدہ وریاضت میں بے نظیر۔''

اپنے بزرگوں کی طرح شیخ حافظ بھی مدت العمر امراء وسلاطین کے دربار میں کبھی نہیں گئے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ چاندہ صاحب سجادہ ہوئے یہ شیخ حافظ کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ عسرت وتنگی کے باوجود فقراء وطلبہ کی خبر گیری بڑے فراخ حوصلگی سے کرتے تھے۔ ان کے دو صاحبزادے ہوئے۔ شیخ طاہر اور دیوان شاہ عبدالحفیظ، ان دونوں حضرات کے متعلق شیخ غلام رشید جونپوری کا بیان ہے کہ مشائخ کبار وقدوۂ صغار وکبار بودند، اپنے والد کے بعد یہی شیخ طاہر جانشین ہوئے۔ یہ شیخ طیب بن معین بنارسی کے خاص ارادتمندوں میں تھے۔ شریعت آباد میں ایک حجرہ بنا کر عرصہ تک ذکر واشغال میں مشغول رہے، وہیں برنا وگنگا کے سنگم پر آپ نے ایک سنگین مسجد بھی تعمیر کرائی جو آج تک ان کی یادگار ہے۔ شیخ طیب کی وفات کے تین ماہ بعد ۱۰۴۲ھ میں انتقال کیا۔ (۲)

شیخ طاہر کی شادی دائرۂ اجمل شاہ میں شیخ ظاہر بن یحییٰ خوب اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جن کے بطن سے چار صاحبزادے شیخ عبدالرحمٰن، شیخ عبدالسبحان، شیخ عزیز اللہ، اور شیخ نوراللہ پیدا ہوئے۔ جو سب کے سب علم وفضل اور صلاح وتقویٰ سے آراستہ تھے۔ دوسرے صاحبزادے دیوان شاہ عبدالحفیظ کا عقد امروہہ میں میر سید بڈھن امروہوی کی صبیہ سے ہوا تھا جن سے ایک صاحبزادہ شیخ فیض اللہ ہوئے۔ شیخ فیض اللہ بھی صاحب نسبت اور عظیم المرتبت بزرگ تھے، ان کی نسبت میر سید محمد تقی ظفرآبادی کی دختر سے ہوئی۔ جن سے تین بیٹے شیخ رضی، شیخ محمد رفیع اور شیخ سیف اللہ اور دو صاحبزادیاں

(۱) مشائخ بنارس ص ۱۲۔ (۲) مشائخ بنارس ص ۲۵۔

ہوئیں۔ شیخ محمد رضی کے صاحبزادے شیخ غلام حفیظ تھے، جن کی شادی شیخ رزق اللہ الہ آبادی کے یہاں ہوئی تھی۔ شیخ غلام حفیظ کے دو صاحبزادے صوفی صلاح الدین اور مولوی خیرالدین محمد پیدا ہوئے۔ مولوی خیرالدین نے اپنے وقت میں بڑا فروغ حاصل کیا۔ جملہ علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک انگریزی حکومت سے منسلک رہے۔ آخر میں پنشن لے کر علیحدگی اختیار کرلی۔ اور راجہ بنارس کے دربار سے وابستہ ہوگئے تھے۔ مولوی خیرالدین نے بہت سی مفید کتابیں بطور علمی یادگار کے چھوڑیں، جن میں جون پورنامہ (تذکرۃ العلماء) اور بلونت نامہ نہایت اہم ہیں، تذکرۃ العلماء کا ایک مطبوعہ نسخہ دارالمصنّفین اعظم گڈھ میں موجود ہے اور میری نظر سے گذر چکا ہے اور بلونت نامہ کا قلمی نسخہ راجہ بنارس رام نگر کے کتب خانہ میں ہے۔(۱)

اس سلسلۃ الذہب کا ایک سلسلہ یہاں آکر ختم ہوجاتا ہے۔ دوسرے سلسلہ کی ابتداء شیخ فرید بنارسی کے برادر خورد شیخ داؤد بنارسی سے ہوتی ہے۔ جس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) حضرت شیخ داؤد بنارسیؒ

شیخ داؤد بن قطب بنارسی شیخ فرید کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھیں کے ہمراہ بغرض تحصیل علم بنارس آئے۔ پھر شیخ فرید کی طرح یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ علوم وفنون کی تکمیل حضرت خواجہ مبارک بنارسی سے کی اور بیعت وارادت کا تعلق اپنے برادرِ کلاں شیخ فرید سے قائم کیا۔ شیخ فرید کی اطاعت و خدمت کا حد درجہ اہتمام کرتے تھے۔ صاحب مناقب لکھتے ہیں:

> ”گویند کہ شیخ داؤد دراز خردی تا آخر وقت غیر از خدمت برادر کلاں کارے دیگر مقصود نبود حتیٰ کہ بہ نوافل ہم کم پرداختے حکم وے را منتظر بودے، ہرچہ می فرمود ہماں ساختے۔“ (۲)

(۱) مکتوب شاہ بدیع الدین لکھنوی بنام غلام حفیظ بنارسی قلمی بخط مولوی خیرالدین جونپوری۔
(۲) مناقب العارفین ص۹۰۔

''بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ داؤد کو بچپن سے آخر عمر تک بجز شیخ فرید کی خدمت کے کوئی اور کام نہیں تھا۔حتیٰ کہ ان کی خدمت کی انجام دہی کے پیش نظر نوافل میں بھی کم ہی مشغول ہوتے ہمہ وقت حکم کے منتظر رہے اور جو کچھ وہ فرماتے اسی وقت اس کو پورا کرتے۔''

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد علماء وصلحاء کی طرح پوری زندگی درس وتدریس میں بسر کردی۔۱۴رشوال ۹۰۶ھ کو شیخ فرید کے ساتھ دریائے گنگا میں غرق ہوکر درجۂ شہادت سے مشرف ہوئے۔شیخ داؤد علوم فنون کے ساتھ صلاح وتقویٰ سے بھی آراستہ تھے،لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح گوشۂ گمنامی میں رکھا کہ وہ شہرت ومقبولیت انہیں حاصل نہ ہوسکی جس کے یہ مستحق تھے۔

شیخ داؤد کے کل تین اولادیں ہوئیں۔شیخ حسن،شیخ اللہ داد،اور ایک صاحبزادی۔ شیخ حسن اپنے فضل وکمال کے لحاظ سے کبار مشائخ چشت میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ حسن بنارسی

شیخ حسن کی علمی ودینی جلالت پر ان کے سبھی تذکرہ نگار متفق ہیں اور ہر ایک نے نہایت شاندار وپرشوکت الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔تاریخ ولادت اور ابتدائی حالات پر لاعلمی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے،تلاش وجستجو کے بعد اتنا معلوم ہوسکا کہ علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل اپنے تایا شیخ فرید بنارسی سے کی۔

مناقب میں ہے:

اکثر کتب ہائے متداول را در خدمت عم خرد شیخ الاسلام بندگی شیخ فرید بن قطب تحصیل نمودہ بود۔

''اکثر کتب مروجہ کی تعلیم اپنے تایا شیخ الاسلام بندگی شیخ فرید بن قطب الدین سے حاصل کی تھی۔''

ان کے علاوہ کبھی کسی استاذ کے آگے زانوے ادب تہہ کیا تھا یا نہیں اس بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی،لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ والد ماجد شیخ داؤد سے بھی کچھ ضرور پڑھا ہوگا

کیونکہ یہ بھی اپنے وقت کے ایک جید عالم اور کامیاب مدرس تھے اور شیخ فرید کی طرح درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس لئے اغلب یہی ہے کہ ابتدائی تعلیم کا مرحلہ والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں طے ہوا ہوگا۔

علمی مقام

شیخ حسن بنارسی قدس سرہٗ جملہ علوم میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے، اس وقت کے علماء و فضلاء ان کی علمی جلالت وعبقریت کے معترف تھے۔

شاہ یٰسین رقمطراز ہیں:

در علم ظاہری حالت قوی داشت فضلائے وقت منقاد وے بود وعلماء زمان مطیع او (ص ۷۹)

’’علم ظاہری میں قوی صلاحیت رکھتے تھے، اس وقت کے علماء وفضلاء نے ان کے سامنے سر اعتراف خم کردیا تھا۔‘‘

شاہ یٰسینؒ نے ایک دوسرے موقع پر اجلّۂ وقت وعاظہ عہد کے وقیع الفاظ سے یاد کیا ہے۔ حضرت شیخ فرید بنارسی کو بھی ان کی علمی استعداد اور صلاحیت پر پورا اعتماد تھا اور اپنے مخصوص تلامذہ کو ان کے حوالے کردیا کرتے تھے۔

تدریس وتصنیف

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کی طرح شیخ حسن نے بھی مسند تدریس کو زینت بخشی اور تشنگان علوم کی تسکین خاطر کا سامان فراہم کیا۔ آپ کے حلقۂ درس سے ایک کثیر جماعت نے اکتساب فیض کیا جن میں اسد العلماء شیخ نصیر الدین مصطفیٰ آبادی جھوسوی کا نام نامی سرفہرست ہے۔

تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیف وتالیف کے ذریعہ بھی آپ نے علمی حلقہ کو مستفید کیا اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ متوفی ۸۴۹ھ کے تتبع میں

بطرز ارشاد فن صرف میں ایک کتاب تصنیف کی اور نام مرغوب الطالبین رکھا، علم نحو میں بھی ایک رسالہ سپرد قلم کیا۔

مناقب میں ہے:

ووے در علم صرف کتابے در طریق ارشاد ملک العلماء متضمن زمثال نوشتہ
وآں را مرغوب الطالبین نام نہاد و رسالہ در علم نحو ہم نوشتہ (ص۹۷)

''اور انھوں نے (شیخ حسن) فن صرف میں ایک کتاب ملک العلماء کی ارشاد کے طرز پر مثالوں کو بیان کرتے ہوئے تحریر کی اور اس کا نام مرغوب الطالبین رکھا اور فن نحو میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔''

مرغوب الطالبین اب دنیا سے ناپید ہو چکی ہے، اس لئے اس کے بارے میں کچھ لکھنا دشوار ہے۔ البتہ قاضی شہاب الدین کی ارشاد کے ساتھ مشابہت اس کی اہمیت وافادیت کی جانب مشیر ضرور ہے۔

احسان وسلوک

سلسلۂ تدریس نہایت شان وشوکت اور وقار وتمکنت کے ساتھ جاری تھا۔ تشنگان علوم دور ودیار سے آ آ کر اپنی تشنگی بجھا رہے تھے، عین اسی ہنگامہ قال اقول میں جاذب حقیقی نے اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔ درس وتدریس سے دل یکلخت سرد پڑ گیا۔ مدرسہ کی زندگی سے وحشت ہونے لگی اور خانقاہ کے ماحول سے انس بڑھنے لگا۔ حالت کے اس تغیر سے اپنے استاذ حضرت شیخ الاسلام فرید بنارسی کو مطلع کیا۔ اور سلسلہ درس کو موقوف کر کے راہ طریقت میں قدم رکھنے کی اجازت طلب کی۔ شیخ کی خواہش تھی کہ ابھی کچھ دنوں تک علمی مشاغل کو برقرار رکھیں، لیکن ادھر تو ذہنی وقلبی کیفیات میں انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا، عشق الٰہی نے دل میں جو آگ لگا دی تھی، اس کے بجھانے کے لئے فنون کے خشک مباحث کے بجائے آخر شب کی آہ سرد کی ضرورت تھی۔ بالآخر مرشد کامل نے حالات کے پیش نظر بیعت فرما کر اذکار واوراد کی تلقین کی، اور ریاضت ومجاہدہ کا حکم دیا۔

صاحب مناقب لکھتے ہیں:

چوں طبیعت از درس علوم سرد شد کتاب ہائے را در گوشہ نہاد و از مدرسہ در کنج فقرا می افتاد و احوال خود بخدمت مخدوم و مربی و عم خود عرض کرد ایشاں ہر چند می خواستند کہ چند روز در استفادہ علم مشغول باشند ہر گاہ شوق ایشاں غالب دید بعد ارادت و عنایت بہ تشریف خرقہ بطریق حضرت خواجگان چشت وآخر العمر اوقات تحفظ انفاس و مجاہدۂ نفس فرمود (ص ۷۹)

''جب طبیعت علوم ظاہری کے درس سے سرد پڑ گئی تو کتابوں کو ایک کنارے رکھ کر گوشۂ فقراء میں شامل ہو گئے اور اپنے احوال سے حضرت شیخ فرید کو مطلع کیا شیخ کی خواہش اگرچہ یہی تھی کہ ابھی سلسلہ درس کو جاری رکھیں، لیکن ان کے شوق فراواں کو دیکھ کر بطریق خواجگان چشت بیعت کیا اور تا مد العمر حفاظت اوقات اور ریاضت و مجاہدہ کی تلقین فرمائی۔''

بیعت و تلقین کے بعد آبادی سے باہر راجہ بنارس کے قلعہ کے کھنڈرات کے متصل ایک حجرہ بنا کر عزلت گزیں ہو کر اذکار و اشغال، اوراد اور دیگر مشاغل سلوک میں منہمک ہو گئے، مسلسل روزہ پر روزہ رکھتے اور افطار میں خشک جو کی روٹی پر اکتفا فرماتے۔ ان ایام میں صرف اوقات نماز یا شیخ و مرشد اور والد بزرگوار کی زیارت کی غرض سے شہر میں آتے، ورنہ ہمہ وقت اسی ویرانہ میں تنہا مجاہدات و عبادات میں مشغول رہتے تھے تا آنکہ درجہ کمال کو پہنچے اور خرقۂ خلافت سے مشرف ہوئے۔

مناقب میں ہے:

تا کہ بکمالات رسید و بمقام عالی و مرتقی گردید و اجازت تلقین طالباں یافت (ص ۸۰)

''یہاں تک کہ درجہ کمال تک پہنچے اور بلند مقام پر فائز ہو کر خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔''

خلافت سے شرف یاب ہونے کے بعد شیخ حسن قدس سرہ نے محفل ارشاد و تلقین کو سجایا اور رشد و ہدایت کے آب زلال سے تشنگان معرفت و حقیقت کے تسکین دل کا سامان

کرنے کے ساتھ ان کے ساتھ قلب و روح کے تزکیہ وتصفیہ کی سعی میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اوراس ویرانہ سے منتقل ہوکر مخلوق خدا کی سہولت کی خاطر علوی پورہ میں قیام فرمایا، اور زندگی کے آخری سات سال یہیں بسر کئے۔اس زمانہ میں ہمہ وقت استغراق اور حضور دائمی کے لذت وسرور سے مخمور رہتے تھے۔اس محویت کے عالم میں گرد وپیش کی کچھ خبر نہ رہتی تھی، نماز پنجگانہ کے وقت خادم کان میں اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا تھا تو کچھ دیر کے لئے افاقہ ہوجاتا اور نماز سے فراغت کے بعد پھر وہی کیفیت عود کرآتی۔(مناقب ۸۰)

سفر حج اور واقعۂ شہادت

انہیں حالات میں حرمین شریفین کی زیارت کا اشتیاق ہوااوراس شدت کے ساتھ کہ تمام جذبات وکیفیات پر غالب ہوگیا۔اس کیفیت سے بھی اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ الاسلام فرید بنارسی اور والد ماجد شیخ داؤد کو مطلع کیا اور دونوں بزرگوں سے سفر کی اجازت طلب کی۔چونکہ شیخ داؤد کوان سے عشق کی حد تک محبت تھی، اس لئے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے، ان کی رعایت خاطر میں شیخ فرید نے بھی سفر کی اجازت نہ دی، لیکن شیخ حسنؒ شوق زیارت میں بیخود تھے، حتیٰ کہ اسی عالم وارفتگی میں اپنی جائے اقامت علوی پورہ ہی سے احرام باندھ لیا اور تقریباً چھ ماہ تک اسی حالت میں وہاں مقیم رہے۔ان کی اس حالت کو دیکھ کر شیخ فرید نے شیخ داؤد کو رخصت کی اجازت پر رضا مند کرکے انہیں سفر کی اجازت مرحمت فرمائی۔شاہ یٰسین بنارسیؒ کا بیان ہے کہ جس وقت شیخ حسن اپنے حجرہ سے بقصد سفر نکلے تو ایک زبردست مجمع ان کی مشایعت میں چلنے کے لئے شہر سے امنڈ آیا جنھیں چند میل کے بعد شیخ نے بصد اصرار واپس کیا، لیکن چند حضرات کسی طرح ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔چنانچہ انہیں ہمراہ لے کر پا پیادہ منزل حبیب کی جانب روانہ ہوگئے راہ میں مصطفیٰ آباد کے پاس پہنچے تو اپنے تلمیذ رشید اور مرید خاص حضرت اسد العلماء شیخ نصیر الدین کو خدمت میں طلب کیا اور چند روز ان کی خواہش پر وہاں قیام فرمایا اور اپنی توجہ خاص سے نواز کر اجازت وخلافت سے امتیاز بخشا۔پھر انہیں اپنا نائب وقائم مقام بنا کر رفقاء سفر کے

ساتھ بجانب منزل روانہ ہوگئے۔ اسد العلماء نے بھی رفاقت ومعیت کی خواہش ظاہر کی تو انہیں یہ کہہ کر روک دیا ''عجب کہ من شما دریں ملک بجائے خود میدارم وشمارہو سے دیگری شوذ'' (مناقب ص ۴۷) مجبوراً اسد العلماء نے رفاقت کے ارادہ کو فسخ کردیا۔ اور اظہار نیازمندی میں ایک نہایت نفیس گھوڑا اسواری کیلئے پیش خدمت کیا، شیخ نے اسے بھی ردکردیا اور فرمایا کہ ''میاں نصیر بی بی رابعہ بصریہ زنے بود چنیں گویند کہ وقتے بطواف کعبہ می رفت درہر گامے دوگانہ می گذارد حسن اگر چہ مرد نیست اما نام مرد دارد اگر ہر گامے دوگانہ نمی تواں گذارد بارے بقدم خود برود۔'' (ص ۴۷)

الحاصل حضرت اسد العلماء کو رخصت کر کے وہاں سے روانہ ہوئے اور خشکی کی مسافت کو پیادہ پا طے کر کے دریا سے کشتی پر سوار ہوئے۔ چند یوم کشتی امن وسلامتی کے ساتھ چلتی رہی، ایک دن اچانک بحری ڈاکوؤں نے کشی پر حملہ کردیا۔ شیخ نے نہایت جرأت وہمت سے ان کا مقابلہ کیا اور کئی ڈاکوؤں کو جہنم رسید بھی کیا۔ لیکن اسی ہنگامۂ جنگ و پیکار میں کسی نے آپ کے سینۂ مبارک پر نیزہ مارا جو پار اتر گیا اور یہ عاشق جانباز بیت اللہ کے بجائے رب البیت سے جاملا۔ رفقاء سفر میں شیخ اسماعیل نامی ایک شخص کے علاوہ سبھی کام آگئے۔ شیخ اسماعیل کو ڈاکوؤں نے زندہ گرفتار کرلیا اور ملک روم میں لے جاکر کسی مسلمان تاجر کے ہاتھ فروخت کردیا۔ شیخ اسماعیل نے اس تاجر سے شیخ اور دیگر رفقاء سفر کے جانگداز حادثہ کو بیان کیا۔ اسے ان کے حال زار پر بہت رحم آیا اور انہیں رہا کر کے حجاز مقدس تک پہنچادیا۔ یہ حج وزیارت سے فارغ ہوکر ایک سال کے بعد بنارس واپس لوٹے اور اس المناک واقعہ کی خبر دی۔

تحقیق تاریخ شہادت

شیخ حسن بنارسیؒ کی تاریخ شہادت ۴؍ربیع الاول پر ان کے تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے لیکن سنہ میں عجیب اختلاف واقع ہوگیا ہے۔ گنج ارشدی اور بحر ذخار میں سن شہادت ۹۶۰ھ تحریر ہے اسی روایت کو صاحب نزہہ نے گنج ارشدی کے حوالے سے اور

چودھری بنی اللہ سندیلوی نے مرقع بنارس میں بحر ذخار کے حوالہ سے لیا ہے اور تذکرہ مشائخ بنارس میں بغیر کسی حوالہ کے ۹۰۰ھ درج ہے۔ ان تصریحات کے خلاف شیخ یٰسین بنارسی نے ۹۰۶ھ لکھا ہے۔

مناقب کی عبارت یہ ہے:

چند روز بہ سلامت وعاقبت بر کشتی رفت تا کہ روزے فرنگیاں بر جماعت مسلماں تاختند د بازار قتل ایشاں پرداختند آنحضرت ہم دست بسلاح بردو بعضے کافراں را قتل نمود بعدازاں کافرے نیزہ بر سینۂ مبارک وے زود بمرتبہ شہادت رسید وجان درراہ دوست فدا ساخت وکان ذالک فی رابع جمادی الاول سنۃ ست وتسع مائیۃ (ص ۸۳، ۸۴)

''چند یوم امن وسلامتی کے ساتھ کشتی پر سفر جاری رکھا کہ اچانک ایک دن فرنگیوں کی جماعت نے غارت گری مچادی اور قتل کا بازار گرم کردیا، شاہ حسن نے بھی ہتھیار سنبھالا اور بعض کافروں کو قتل کیا، بعدازاں ایک کافر نے ان کے سینۂ مبارک پر نیزہ مارا جس سے ان کی شہادت واقع ہوگئی یہ حادثہ ۴؍جمادی الاول ۹۰۶ھ کو پیش آیا''

اور اس سلسلے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جس دن یہ حادثہ رونما ہوا، اسی دن بعد نماز ظہر حضرت شیخ فرید نے مصلی اٹھایا تو اس کے نیچے سے شیخ حسن کی تسبیح اور کنگھی برآمد ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی شیخ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا کہ پیشوا ہمیں ساعت ازیں عالم رفت ودر دریا شہید گشت۔ (ص ۸۴)

اس واقعہ نیز گذشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ جس وقت شاہ حسن سفر حج کے لئے بنارس سے روانہ ہوئے تھے، اس وقت حضرت شیخ فرید وشیخ داؤد باحیات تھے۔ اور ان دونوں حضرات کی وفات بحسب تصریح مناقب وگنج ارشدی ۹۰۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس لئے حضرت شاہ حسن کی وفات اسی سن میں ماننی پڑے گی یا اس سے کچھ پہلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مناقب اور گنج ارشدی دونوں میں بصراحت موجود ہے کہ شہادت کے وقت ان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ لیکن شہادت کے سن کو ۹۶۰ھ تسلیم کر لینے کی صورت

میں ان کی عمر کم از کم ۸۵،۸۶ سال کی ماننی پڑے گی۔ کیونکہ شیخ فرید کی وفات سے سات سال پیشتر انہیں خلافت مل چکی تھی۔ خلافت سے پہلے تعلیم و تحصیل اور درس و تدریس میں طویل عرصہ تک مشغول رہ چکے تھے۔ ان وجوہ سے صاحب مناقب کی بیان کردہ تاریخ ہی درست ہے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ گنج ارشدی کے کاتب نے ۹۰۶ھ لکھنے کے بجائے غلطی سے ۹۶۰ھ لکھ دیا ہوگا۔ (کیونکہ ہندسوں میں اس طرح کی غلطی کا ہوجانا بعید نہیں ہے) بعد کے تذکرہ نگاروں نے اسی تاریخ کو اپنی تصنیفات میں درج کردیا۔ اس طرح سے یہ غلطی چل پڑی۔ واللہ اعلم۔

خلفاء و اولاد

حضرت شاہ حسن نے وفات کے بعد تین بیٹے شیخ مسعود، شیخ معین الدین، شیخ نصیرالدین اور ایک خلیفہ و جانشین اسدالعلماء شیخ نصیرالدین مصطفیٰ آبادی کو بطور یادگار چھوڑا۔ شاہ صاحب کے مریدین و متعلقین میں اسدالعلماء کے علاوہ کسی اور کو یہ دولت و نعمت حاصل نہ ہوسکی۔ (۱)

مناقب میں ہے:

حضرت شاہ را غیر از حضرت اسدالعلماء خلیفہ دیگر نبود و آنچہ گفتہ اند پیر را یک مرید کافیست گویا درحق اوست (مناقب ص ۸۷)

"شاہ صاحب سے خلافت صرف اسدالعلماء کو حاصل ہوئی۔ صوفیاء کا مقولہ پیر را ایک مرید کافیست گویا آپ ہی کی شان میں کہا گیا تھا۔"

(۱) مولانا عبدالسلام نعمانی نے تذکرہ مشائخ بنارس میں حضرت شیخ حسن بنارسی کے صاحبزادے شیخ نصیرالدین کے تذکرے میں لکھا ہے کہ "حضرت شاہ یٰسین صاحب مرتب مناقب العارفین تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت بندگی شاہ حسن کا حضرت نصیرالدین کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ نہیں تھا" تذکرہ ص ۱۵، یہ حوالہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن صاحب مناقب کی اس عبارت کے مصداق حضرت شاہ حسنؒ کے صاحبزادے شیخ نصیرالدین نہیں بلکہ اسدالعلماء نصیرالدین جھوسوی ہیں چنانچہ مناقب کی یہ عبارت ملاحظہ ہو: "حضرت شاہ را غیر از اسدالعلماء خلیفہ دیگر نہ برد" ص ۸۷۔

اسد العلماء نصیر الدین مصطفیٰ آبادی

شیخ نصیر الدین بن شیخ بدہ صدیقی اپنے وقت میں جامع شریعت وطریقت تھے، دس سال کی عمر میں بنارس آکر شیخ فرید بنارسی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے تھے۔ اور اپنی خداداصلاحیتوں کی بناء پر ابتدا ہی سے ان کی توجہات کے مرکز بن گئے۔ شیخ نے صرف ونحو کی چند کتابیں پڑھا کر انہیں اپنے برادرزادہ وتلمیذ وخلیفہ حضرت شاہ حسن بنارسی کے حوالہ کردیا اور فرمایا کہ ''بابا ہوایں بارسعادت آثار حوالہ شمار نمودم درتربیت وے سعی کما ینبغی خواہد نمود'' شاہ صاحب نے شیخ ومرشد کے فرمان کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت پر بطور خاص توجہ دی اور ایک عرصہ تک اپنی صحبت میں رکھ کر مختلف فنون کی تعلیم دی، پھر مزید تعلیم کے لئے جون پور بھیج دیا، وہاں حضرت شیخ چند محدث جونپوری کے حلقہ درس میں شامل ہوکر علوم متداولہ کی تحصیل کی جون پور کے زمانۂ قیام میں ایک بار حضرت شیخ کی طلب پر بنارس حاضر ہوئے، اتفاق سے جس وقت یہ مجلس میں پہنچے اسی وقت ایک نو وارد طالب علم بھی خانقاہ میں پہنچا اور نہایت بیباکی کے ساتھ دریافت کیا کہ ''شیخ فرید کجا است ازاں روز کہ در بنارس رسیدہ ام درو دیوار نام اومی گویداورا بہ بینم کہ چہ طور است''۔ یعنی جب سے بنارس آیا ہوں شیخ فرید کا شہرہ وآوازہ سن رہا ہوں، آخر میں بھی دیکھوں کہ وہ کس درجہ کے آدمی ہیں'' حاضرین کواس کی یہ بے باکی و بے ادبی بہت شاق گذری، لیکن شیخ نے نہایت تواضع وانکساری کے ساتھ فرمایا کہ: ''فرید میں ہی ہوں فرمایئے کیا ضرورت ہے'' اس نے یہ سنتے ہی قریب پہنچ کر علمی مذاکرہ شروع کردیا۔ شیخ نصیر نے آگے بڑھ کر اس کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا، پھر خود بھی چند سوالات کئے جس کے جوابات اس سے نہ بن پڑے اور شرمندہ ہوکر مجلس کے ایک گوشہ میں خاموش ہوکر بیٹھ گیا حضرت شیخ فرید کو شیخ نصیر کی حاضر دماغی اور جودت طبع سے بڑی خوشی ہوئی۔ اور اسی مجلس میں اسد العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اور فرط مسرت میں فرمایا کہ میں تمہیں اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرکے ذکروظائف کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر شیخ نصیر نے عرض کیا کہ حضرت نے

جس وقت مجھے حضرت شاہ حسن کے سپرد فرمایا تھا اسی وقت سے میرا یہ خیال ہے کہ یہ نعمت و برکت مجھے شاہ صاحب کے واسطہ سے حاصل ہوگی، اس جواب سے انہیں مزید خوشی ہوئی اور اسی وقت خادم خاص کے ذریعہ شاہ صاحب کو علوی پورہ سے بلوا کر شیخ نصیر کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

بابا ہو ہر چہ شمار ازیں فقیر واز مردان غیب رسیدہ از شیخ نصیرالدین دریغ نخواہد داشت وہمہ خواہند وتو۔

''اے بابا آپ کو اس فقیر اور مردان غیب سے جو نعمتیں حاصل ہوئی ہیں وہ سب شیخ نصیر کو بخش دیجئے گا۔''

اس گفتگو کے بعد شیخ نصیر شاہ صاحب کے ہمراہ ان کے حجرہ واقع علوی پورہ میں آئے اور چاہا کہ یہیں رہ کر سلوک وطریقت کے اشغال میں لگ جائیں، مگر خلاف توقع شاہ صاحب نے فرمایا جاؤ تعلیم مکمل کر کے درس وتدریس کی حدمت انجام دو، تمہارا حصہ وقت پر تمہیں مل جائے گا۔ چنانچہ شیخ نصیر پھر جون پور آئے اور علوم مروجہ کی تعلیم مکمل کر کے اپنے آبائی وطن مصطفیٰ آباد میں درس وافادہ کی محفل آراستہ کی، ایک عرصہ کے بعد جب شاہ صاحب سفر حج کیلئے نکلے تو مصطفیٰ آباد جا کر انہیں اپنی نوازشات اور توجہات سے نوازا اور تصرفات باطنی کے ذریعہ انہیں درجہ کمال پر پہنچا کر خلافت واجازت عطا کی اور ساتھ ہی مصطفیٰ آباد کے بجائے جوسی میں قیام کا حکم دیا۔ اسد العلماء نے شیخ کے حکم کو اس طرح پورا کیا کہ مرکر بھی وہیں رہے۔

خلافت حاصل ہو جانے کے بعد تمام علائق سے الگ ہو کر ریاضت ومجاہدہ میں ہمہ تن لگ گئے۔ شاہ یٰسین کا بیان ہے کہ دیگر مجاہدات کے علاوہ تقریباً تیس بار چلہ میں بیٹھے، کثرت عبادت وریاضت سے باطنی صفائی اس درجہ حاصل ہوگئی کہ کشف قلوب ومکاشفۂ ارواح کے درجہ پر فائز ہوئے۔

ان فضائل کے ساتھ داد ودہش اور جود وسخا میں بے نظیر تھے آپ کے در سے کبھی کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں ہوا۔ آخر میں اکل وشرب سے بھی ایک حد تک بے نیازی ہوگئی تھی۔

صرف شوربا یا دودھ پی لیا کرتے تھے۔ وفات سے دو سال قبل دودھ پینا بھی ترک کر دیا تھا۔اور فرماتے تھے کہ روح کی طرح معدہ کو بھی صاف رکھنا چاہئے۔

اتباع شریعت کا اس درجہ غلبہ تھا کہ وفات سے ایک روز قبل اپنے صاحبزادہ حضرت خواجہ کلاں کو حکم دیا کہ شرح وقایہ لاؤ تاکہ تمہیں تجہیز وتکفین کے مسائل سکھا دوں۔ انھوں نے ہر چند عرض کیا کہ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ مجھے اس کے مسائل معلوم ہیں، لیکن اصرار کر کے کتاب منگوائی اور غسل وکفن کے جملہ مسائل نہایت شرح وبسط سے ان کے سامنے بیان کیا اور فرمایا کہ اسی طرح سے غسل وکفن دینا، اس کے بعد صاحبزادہ کو کچھ وصیتیں فرمائیں اور خرقہ خلافت عطا کیا۔

اسد العلماء کی یہ آخری گفتگو تھی، اس کے بعد پھر کسی سے کوئی بات چیت نہ کی اور ہمہ تن محبوب حقیقی کی جانب متوجہ ہوگئے۔ بالآخر شب پنجشنبہ ۲۰/ربیع الاول ۹۸۰ھ کو عین ذکر کے وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر کے جوار رحمت میں پہنچ گئی۔ ایام مرض میں احباب واعزہ دوا علاج کے لئے کہتے تو فرماتے تھے کہ اس مرض کی دوا لقائے حبیب کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ (مناقب از ص ٦٦ تا ٧٨)

حضرت شاہ حسن کی اولاد میں بالترتیب سب سے بڑے شیخ مسعود تھے۔ان کے بعد شیخ معین الدین اور سب سے چھوٹے شیخ نصیر الدین تھے جو عین عالم شباب میں لاولد فوت ہوگئے۔

شیخ مسعود بن حسن بنارسی

ابھی یہ سن رشد کو بھی پہنچنے نہ پائے تھے کہ والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے۔اس لئے ان سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔ان کی رحلت کے بعد شیخ فرید بن شیخ بدہ حقانی جون پوری کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر علوم وفنون کی تحصیل کی اور انہیں سے بیعت بھی ہوئے۔شیخ فرید نے ان کی تعلیم وتربیت مکمل کر کے انہیں حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار جون پوری متوفی ۹۷۵ھ کی خدمت میں دہلی بھیج دیا، وہاں دو سال رہ کر سلوک کی

تکمیل کی اور خرقۂ خلافت سے مشرف ہوکر بنارس واپس آئے اور اپنے آباء واجداد کے طریق پر درس وتدریس اور ارشاد وتلقین میں پوری زندگی گذار دی۔ شیخ مسعود نے اپنی دینی سرگرمیوں کے لئے منڈواڈیہہ بنارس کو منتخب کیا جو آگے چل کر ان کے برادرزادہ شاہ طیب بن معین بنارسی کے طفیل رشد وہدایت اور تبلیغ وتلقین کا ایک عظیم مرکز بنا۔

شیخ مسعود کا قیام تاحیات منڈواڈیہہ ہی میں رہا جہاں وہ طالبین کی اصلاح وتربیت کے ساتھ ذکر وفکر اور عبادت وریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ وفات کے وقت شاہ طیب کو بلایا مگر اتفاق سے وہ موجود نہیں تھے تو بڑی حسرت ویاس سے فرمایا کہ بندہ کی خواہش تھی کہ جو کچھ بزرگوں سے ملا ہے وہ اس فرزند کے حوالہ کردوں، اس کے چند گھنٹہ کے بعد وفات ہوگئی۔ منڈواڈیہہ میں بڑے روضہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات اور تفصیلی حالات کا علم نہ ہوسکا۔ (مناقب ص۸۵،۸۶)

شیخ معین الدین بنارسی

حضرت شاہ حسن کے منجھلے صاحبزادے تھے، تعلیم وتحصیل اور بیعت وارادت کا تعلق شیخ فرید بن شیخ بدہ حقانی سے تھا، عبادت وریاضت اور جود وسخا میں یگانۂ وقت تھے طلباء وفقراء کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ بعالم شباب تیس سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ اور یادگار میں صرف ایک دس سالہ بچے کو چھوڑا جس نے اپنے فضل وکمال، زہد وورع، تقویٰ وتدین، اور ارشاد وتلقین کے ذریعہ خانوادۂ فریدی وداؤدی کے نام پر شہرت دوام کی مہر ثبت کردی۔ یہی وہ فخر خاندان ہے جسے دنیا شاہ طیب بن معین کے نام سے جانتی ہے۔ شیخ معین کا مزار بھی منڈواڈیہہ تالاب کے کنارے چبوترہ پر ہے اور عوام میں بڑی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ المشائخ شاہ طیّب بنارسی

حضرت شاہ طیب بنارسی گیارہویں صدی کے علماء میں جامع شریعت وطریقت

تھے۔انھوں نے اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں سے مدرسہ وخانقاہ دونوں کو آباد رکھا۔ان کے اصلاحی وتبلیغی کارنامے،آج بھی تاریخ کے صفحات میں نمایاں ہیں اوراپنے ہر تذکرہ نگار سے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔چنانچہ شیخ یٰسین بنارسی نے ان الفاظ سے انہیں یاد کیا ہے:

''آں فرد یگانہ آں غوث زمانہ آں جامعِ معانی ودقائق آں منبع اسرار وحقائق آں نہنگ دریائے شریعت آں سیر بیشۂ طریقت آں شاہباز عالم ملکوت آں بلند پرواز بیضائے لاہوت آں متمکن درمقام تمکین حضرت بندگی شیخ طیب بن معین۔'' (مناقب ص۳،۴)

شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی نے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے:

''وے را کمالات عالی وحالات لازوال بودہ اندآخرآخر بدوام مشاہدہ رسیدہ بود۔''

(بحرذخار ص۱۰۰)

مولانا عبدالحئ حسنی نے یوں مدح سرائی کی ہے:

''الشیخ الصالح طیب بن معین۔کان زاہداً متقللا متورعاً قنوعاً بشوشا طیب النفس''۔

(نزہہ ص۱۹۱ ج۵)

تعلیم وتحصیل اورابتدائی حالات

شاہ صاحب کی تاریخ ولادت کی تصریح کہیں نہیں ملتی۔شیخ یٰسین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ''والد شریف وے شیخ معین وے را دہ سالہ گذاشتہ خود بجوار رحمت حق پیوست۔'' یعنی ان کے والد انہیں دس سال کی عمر کا چھوڑ کر انتقال کر گئے،والد بزرگوار کی رحلت کے بعد اپنی پھوپھی کی جوار شفقت میں پرورش پائی۔قرآن حکیم اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔عربی کی ابتداء استاذ الفضلاء شیخ نظام الدین بنارسی سے کی۔عہد طالب علمی ہی سے شاہ صاحب کے اخلاق واطوار نہایت پسندیدہ تھے۔صلاح وتقویٰ،عفت وپاکدامنی اسی وقت سے ان کے ہر قول وعمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ان اوصاف حمیدہ کے پیش نظر شیخ نظام نے ابتداہی میں یہ پیشین گوئی کر دی تھی۔

ازیں پسر بوئے مشیخت ومقتدائی می آید جہانے از برکات انفاس وے

نصیب خواہند یافت وایں خاندان از و روشن خواہد شد (مناقب ص ۴)

''اس بچے سے مشیخت و بزرگی کی بو آرہی ہے ایک جہاں اس کی برکت سے نفع حاصل کرے گا اور خاندان کا نام اس سے روشن ہوگا۔''

شیخ نظام الدین بنارسی کی درسگاہ میں صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھ کر جون پور کا علمی سفر کیا اور وہاں کے بعض اساتذہ سے نحو اور معانی کے فن کو مکمل کیا، پھر شیخ نور اللہ (۱) بن طلحہ جون پوری متوفی ۱۰۱۲ھ سے شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے کچھ اجزاء کی تحصیل کی۔

دوران تعلیم میں ایک بار مکان تشریف لائے تو اہل خاندان کے اصرار پر رشتۂ ازدواجی سے منسلک ہوگئے۔ جس کی بناء پر تعلیم وتحصیل کے سلسلے میں تقریباً تین سال کا وقفہ ہوگیا۔

شیخ یٰسین لکھتے ہیں:

پس بملازمت افضل العصر اعلم الدہر شیخ نور اللہ انصاری ہروی، شرح وقایہ
تمام خواند وجزوے حسامی بعد ازاں بتقریب کار خیر بخانہ آمد ومتاہل شد بعد
کدخدائی از خواندن باز ماند وسالے دوسہ در خواندن تفرقہ گداز ند (ص ۴)

''پھر افضل العصر اعلم الدہر شیخ نور اللہ انصاری ہروی کی خدمت میں شرح وقایہ مکمل اور حسامی کے چند اجزاء کی تحصیل کی اس کے بعد گھر آئے اور شادی کرلی۔ نکاح کے بعد سلسلۂ تعلیمی جاری نہ رکھ سکے اور دو تین سال کا وقفہ ہوگیا۔''

تین سال کے تعلیمی انقطاع کے بعد پھر جون پور تشریف لے گئے اور اس وقت کے مروجہ نصاب فقہ واصول فقہ کی تعلیم مکمل کرکے دینیات سے فراغت حاصل کی۔ (ص ۴)

تعلیم سے فراغت کے بعد مزید ایک سال اور جون پور میں مقیم رہے، شاہ صاحب

---

(۱) شیخ نور اللہ بن طلحہ جون پوری ہروی علماء جونپور میں شریعت وطریقت کے جامع تھے، علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل اپنے برادر کلاں شیخ عبد الجلیل جونپوری سے کی درس وتدریس اور مطالعہ کتب میں بڑا انہماک تھا، علمی تبحر میں خاص شہرت کے مالک تھے عہد عالمگیری میں متعدد عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ ۱۰۱۲ھ میں وفات ہوئی۔ مزار شہر جونپور میں ہے۔ تجلی نور۔

کا یہ یک سالہ قیام کس مقصد کے تحت تھا اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ شیخ یٰسین مبہم طور پر لکھتے ہیں کہ: ''بعد ازاں قریب یکسال در جونپور بتقریب بعضے امور توقف فرمودہ بود۔'' یعنی تعلیم سے فراغت کے بعد ایک سال مزید بعض امور کے تحت جون پور میں ٹھہرے رہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیام بسلسلۂ ملازمت رہا ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے عقد ہو گیا تھا۔ بیوی کے ساتھ بیوہ والدہ کی کفالت بھی انہیں کے ذمہ تھی۔ اس لئے تحصیل علم سے فراغت کے بعد تحصیل معاش کی غرض سے ملازمت کر لی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

عرفان وطریقت

جون پور کے دوران قیام میں ایک دن کسی خانقاہ میں شیخ تاج الدین جھوسوی سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں بزرگ ایک ہی درسگاہ واستاذ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے باہم بڑی یگانگت ومحبت تھی، دوران گفتگو شاہ صاحب نے برسبیل تذکرہ شیخ تاج سے عرض کیا کہ ایک عرصہ سے میری خواہش ہے کہ جدامجد حضرت شیخ حسن بنارسی قدس سرہ کے سلسلہ کے کوئی بزرگ مل جاتے تو ان سے وابستہ ہو کر جد بزرگوار کے سلسلے میں داخل ہو جاتا۔ یہ سنتے ہی شیخ تاج نے فرمایا یہ آپ کی سعادت اور نیک بختی ہے کہ اس وقت شہر میں مولانا خواجہ کلاں خلیفہ کامل وخلف قابل شیخ نصیر الدین خلیفۂ مطلق حضرت شیخ حسن بنارسی تشریف فرما ہیں۔ یہ مژدۂ روح افزاء سنتے ہی شاہ طیب کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا، خود ان کا بیان ہے کہ:

چوں ایں حرف گوش بندہ رسید چناں خوش دم کہ گویا جان از سرنو یافتم و بآب حیات رسیدم (ص۵)

''اس جملہ کو سنتے ہی مجھے اس قدر خوشی ہوئی گویا نئی زندگی مل گئی اور چشمہ آب حیات پر پہنچ گیا۔''

اسی وقت شیخ تاج سے عرض کیا کہ مجھے خواجہ کی مجلس میں پہنچا دیں چنانچہ شیخ تاج انہیں لے کر خواجہ کلاں کی مجلس میں پہنچے۔ خواجہ انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور مصافحہ و

معانقہ کے بعد فرمایا۔

''مگر شما از اولاد حضرت شاہ ہستید کہ بمجرد دیدن شما صورت حضرت شاہ درنظر من آمدہ۔'' شاید آپ حضرت شاہ حسن کی اولاد سے ہیں کیونکہ آپ کی صورت دیکھتے ہی شاہ صاحب کا حلیہ یاد آ گیا۔ شاہ طیب نے عرض کیا، حضرت شاہ صاحب بندہ کے جد امجد تھے۔ یہ سن کر خواجہ نے بڑی شفقت ونوازش فرمائی اور نہایت تواضع وانکساری کے ساتھ کہا ''شما مخدوم زادہ ایں عاجز اید مارا نعمت از خاندان شما است'' آپ تو ہمارے مخدوم زادہ ہیں، اس عاجز کو جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ آپ ہی کے خاندان کا عطیہ ہے۔

اس تعارفی گفتگو کے بعد شاہ صاحب نے بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور اسی مجلس میں خواجہ نے انہیں بیعت فرما کر اوراد ووظائف کی تلقین کی اور از راہ شفقت ونوازش کلاہ مبارک اپنے سر سے اتار کر ان کے سر پر رکھ دی۔ بیعت ہوتے ہی دنیا بدل گئی اور قلب میں سوز دروں کی کیفیت پیدا ہوگئی، ناچار جون پور کے مشاغل کو خیر باد کہہ کر مکان چلے آئے مگر یہاں بھی سکون نصیب نہ ہو سکا۔ عشق الٰہی کی سوزش بڑھتی ہی گئی، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بیتابی میں کبھی دشت وبیاباں کی خاک چھانتے اور کبھی گوشۂ محراب میں عافیت کی جستجو کرتے۔ اسی عالم حیرانی وپریشانی میں تنگی معاش نے بھی اپنی گرفت سخت کردی اور اہل خانہ پر فاقے گذرنے لگے، اس لئے مجبوراً اطراف بنارس کے کسی حاکم کی ملازمت کرلی۔ مگر شوریدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس سلسلہ کو تا دیر قائم نہ رکھ سکے اور سال کے اندر ہی اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ شاہ صاحب کے گھر والے ان کے ان حالات سے نہایت پریشان ومتفکر تھے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین ترکمان کی خدمت میں جا کر دعاء کی درخواست کی کہ ان کی یہ اضطرابی کیفیت کسی طرح زائل ہو جائے۔ شیخ شہاب الدین روشن ضمیر صاحب دل بزرگ تھے وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ اس سوز دروں و اضطراب باطنی کی حقیقت کیا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے گھر والوں کو مطمئن کرتے ہوئے فرمایا:

ایں فرزند بطلب حق سر درشدہ است خدائے تعالیٰ ہمہ را ایں سعادت

نصیب گرداند مارا ہمت ازوے باید خواست امید وار باشید کہ حق تعالیٰ خاندان حضرت شاہ راز برکت انفاس ایں فرزند معمور خواہید کرد واز انوار اوخانوادہ روشن خواہد شد (مناقب ص ۶)

’’یہ فرزند طلب حق میں دیوانہ ہوا ہے، اللہ تعالیٰ سب کو یہ سعادت نصیب فرمائیں ہمیں اس سے دعاء لینی چاہئے تم لوگ امیدوار رہو کہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ حسن کے خاندان کو اس فرزند کے برکات وانوار سے معمور فرمائیں گے اور خاندان کا نام اس کے ذریعہ روشن ہوگا۔‘‘

بالآخر شاہ صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ آگ جس نے لگائی ہے وہی اسے بجھائے گا بھی، اس خیال کے آتے ہی والدہ ماجدہ سے اجازت لے کر شیخ پورہ کی راہ لی اور حضرت خواجہ کلاں کی خدمت میں جاکر اپنی باطنی کیفیات اور سوز دروں کا حال بیان کیا۔ خواجہ نے انہیں تسلی دی اور اس خوش آیند کیفیت پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ چند دن خواجہ کی صحبت میں رہ کر گھر واپس ہوئے لیکن خواجہ کی روحانی مجلس کے کیف نے رہا سہا سکون بھی زائل کردیا۔ اس لئے گھر پر صبر وقرار میسر نہ آسکا۔ اس لئے چند ہفتہ کے بعد دوبارہ خواجہ کلاں کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس بار طویل عرصہ تک وہاں قیام کیا، اور عبادت وریاضت کے ساتھ خواجہ کے فیوض و برکات سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی سفر میں یا اس کے بعد تیسرے سفر میں حضرت خواجہ نے انہیں رمضان کے عشرۂ اخیر کے اعتکاف کا حکم دیا اور اعتکاف کے اختتام پر عید کے دن خرقۂ خلافت سے نوازا اور بعض اذکار واوراد کی تلقین فرمائی۔ ساتھ ہی حضرت شاہ حسن بنارسی کے مخصوص وظائف بھی بتائے۔

مناقب میں ہے:

باعتکاف عشرۂ اخیرہ رمضان مبارک امر نمودند وروز عید پیراہن حضرت خواجگان چشت بامثال اجازت عطا فرمودند وبعضے اذکار تلقین کردندن واوراد حضرت شاہ حوالہ نمودند۔ (ص ۷)

’’رمضان مبارک کے اخیر عشرہ کے اعتکاف کا حکم دیا اور عید کے دن مشائخ چشت

کے پیراہن کے ساتھ خلافت واجازت دی اور بعضے اذکار کی تلقین فرمائی، نیز حضرت شاہ حسن کے اوراد بھی حوالہ کئے۔''

عطائے خلافت کے بعد مزید تربیت وتکمیل کی غرض سے شاہ صاحب کو اپنے خلیفۂ خاص شیخ تاج الدین جھوسوی کے حوالے کر دیا۔ شیخ تاج سے شاہ صاحب کے دور طالب علم ہی سے معاصرانہ ورفیقانہ تعلقات تھے۔ لیکن اس سپردگی کے بعد انھوں نے شیخ تاج کے ادب واحترام اور انقیاد واطاعت کا جو نمونہ پیش کیا۔ معاصرین کی باہمی تاریخ میں اس کی مثال کمتر ہی ملے گی۔ شاہ صاحب نے خود اپنے انقیاد واطاعت کی کیفیت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے:

> دل خود بدست ایشاں سپرد واختیار خود از ایشاں برداشت تا دہ سال ابتداء گاہے بخدمت ایشاں ظاہر نکرد کہ مرا فلاں وظیفہ یا نماز بفرمائید یا ذکر تلقین کنید ہر چند سلوک ایشاں با بندہ یارانہ وبے تکلف بود امامن خود را از غلامان ایشاں کمتر دانستہ درخدمت مقید بودم۔ (ص ۷)

''اپنے اختیار وخواہشات کو ان کے حوالہ کر دیا ابتداءً دس سال تک کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں وظیفہ یا نماز یا ذکر تلقین فرمادیں ہر چند کہ وہ میرے ساتھ دوستانہ اور بے تکلفانہ معاملہ فرماتے تھے لیکن میں اپنے آپ کو ان کے نوکروں سے بھی کمتر تصور کرتے ہوئے خدمت میں لگا رہا۔''

شاہ طیب نے اپنے مربی کے ساتھ گرویدگی وخود سپردگی میں حضرات صوفیاء کے اس اصول پر پورا پورا عمل کیا ''ینبغی للمرید ان یکون بین یدی الشیخ کالمیت بین یدی الغسال یقلّبه کیف یشاء'' یعنی مرید کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ شیخ کے حضور میں اس طرح رہے جیسے میت غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جس طرف چاہتا ہے اسے الٹتا پلٹتا ہے۔

شاہ صاحب کو اس اطاعت شعاری کا پورا پورا نفع بھی حاصل ہوا کہ شیخ تاج نے اپنے عطاء وانعام کو ان پر نچھاور کر دیا اور خلافت واجازت کے علاوہ متعدد بار اپنی خلعت

خاص سے نوازا اور مرض الموت میں ایک دن انہیں اپنے سینے سے چمٹا کر اپنی محبت وشفقت اور اتحاد و یگانگت کے اظہار کے لئے یہ شعر پڑھا۔

من تو شدم تو من شدی تو جاں شدی من تن شدم
تاکس نگوید بعد ازیں تو دیگرے من دیگرم

الحاصل تقریباً تیس سال کی طویل مدت تک شیخ خواجہ کلاں و شیخ تاج الدین کی صحبت میں رہ کر اصلاح باطن اور تزکیہ وتصفیہ میں مشغول رہے تا آنکہ مرتبۂ ارشاد وتکمیل پر فائز ہوئے اور پیر ومرشد کے حکم سے بنارس آ کر عرفان وسلوک کی مسند کو زینت بخشی۔

شاہ صاحب کو ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ سے بھی سلسلہ قادریہ میں اجازت حاصل تھی۔

مناقب میں ہے:

دراں زماں کہ بعد وفات ایشاں برائے زیارت پیران خویش بجانب دہلی رفتہ بود با شیخ الاسلام استاذ المفسرین حاجی الحرمین بندگی میاں شیخ عبدالحق الدہلوی البخاری کہ دراں وقت مقتدائے سلسلۂ قادریہ بود ملاقات واقع شد و وے را شیخ کامل ومکمل یافت ایں سلسلہ از وے گرفت وخرقۂ قادریہ از دست وے پوشید۔ (ص۹)

''شیخ تاج کی وفات کے بعد جس وقت شاہ صاحب پیران چشت کی زیارت کیلئے دہلی تشریف لے گئے تھے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بخاری سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس وقت یہ سلسلۂ قادریہ کے مقتدا تھے محدث دہلوی کو شیخ کامل ومکمل پایا، چنانچہ ان سے سلسلۂ قادریہ کی تحصیل کی اور ان کے دست خاص سے خرقہ خلافت زیب تن کیا۔''

بناء شریعت آباد

شیخ تاج الدین نے شاہ صاحب کو بنارس رخصت کرتے وقت فرمایا تھا کہ اب آپ کو یہاں آنے کی حاجت نہیں بنارس میں جم کر خلق خدا کی اصلاح وتربیت کی خدمت

انجام دیجیئے۔ میں خود کبھی کبھی وہاں آ کر ملاقات کرآؤں گا۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق اپنے آبائی قیام گاہ منڈواڈیہہ میں ارشاد و تلقین کی محفل آراستہ کی، لیکن یہاں خانگی جھمیلوں کی بناء پر دلجمعی و یکسوئی حاصل نہ ہوسکی۔ اس لئے جدامجد حضرت شاہ حسن کے طریق پر آبادی سے باہر قلعہ راجہ بنارس کے خرابہ کے قریب ایک حجرہ بنا کر چند رفقاء کے ساتھ وہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ خلق کا رجوع شروع ہوا۔ طلباء و فقراء کی ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی، جن کی رہائش کے لئے آپ کے قریبی عزیز و مرید باختصاص شیخ طاہر بن شیخ چاندہ نے ایک پختہ مکان حجرہ سے متصل تعمیر کرادیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بہت سے تجار و امراء نے بطیِ حسن عقیدت میں آپ کے جوار میں اپنے لئے الگ الگ حجرے اور مکانات بنوا کر وہیں اقامت اختیار کرلی۔ پھر طلبہ و ارادت مندوں کی کثرت کی بناء پر حجرہ اور مکان ناکافی ہوگیا تو مستقل ایک خانقاہ اور اس سے متعلق ایک مسجد کی تعمیر عمل میں آئی، اس طرح آہستہ آہستہ یہ ویرانہ اچھی خاصی آبادی میں تبدیل ہوگیا، جسے شاہ صاحب نے شریعت آباد کے نام سے موسوم کیا۔

درس و تدریس وارشاد و تلقین

شاہ صاحب کا قیام مستقل طور سے شریعت آباد ہی میں تھا جہاں وہ سالکین کی اصلاح و تربیت کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ طلبہ کی کثیر جماعت ہر وقت خدمت میں موجود رہتی تھی جن سے شاہ صاحب نہایت شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔

مناقب میں ہے:

اکثر طلبہ در خدمت وے می بودند وایں طائفہ را بسیار دوست داشتے و سبق شان گفتے۔ (مناقب ص۱۰)

”اکثر طلبہ ان کی خدمت میں موجود رہتے تھے جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور انہیں درس دیتے تھے۔“

سبق کا سلسلہ عام طور سے ظہر کے بعد شروع ہوتا تھا جو عصر تک جاری رہتا، اسی وقت کبھی کبھی کچھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے تھے۔

مناقب میں ہے:

وبعد نماز ظہر تا عصر جزوے قرآن می خواند بعد ازاں بعضے یاراں سبق گفتے وگاہے چیزے می نوشت (ص۱۴)

''ظہر کے بعد عصر تک کچھ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے پھر بعض لوگوں کو سبق پڑھاتے اور کبھی کبھی کچھ تحریر کرتے تھے۔''

تذکرہ نگار شاہ صاحب کے روحانی کمالات وتصرفات کے بیان وتفصیل میں اس درجہ محو ہو گئے ہیں کہ ان کے علمی کارناموں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ اس معاملہ میں تنہا شاہ صاحب ہی کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہوا ہے بلکہ بالعموم مشائخ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے کہ ان کی کرامات وتصرفات کے انبار میں ان کے علمی کمالات اجاگر نہ ہو سکے اسلئے شاہ صاحب کے تلامذہ اور تصنیفات کے متعلق اب کوئی تحقیقی بات کہنا مشکل ہے۔ انتہائی تلاش وجستجو کے بعد ''اکثر طلبہ درخدمت وے بودند'' میں سے صرف دو کے ناموں کی تصریح مل چکی کہ انھوں نے شاہ صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور علوم ظاہری کی تحصیل کی۔ ان میں ایک شاہ یٰسین بنارسی ہیں اور دوسرے شیخ ناصر الدین اور ایک تصنیف ''صلوٰۃ طیبی'' کا پتہ چل سکا جس کا ایک نسخہ مولانا رضا علی بنارسی متوفی ۱۳۱۲ھ کے کتب خانہ میں تھا۔ مولانا علی رضا صاحب نے اپنے فتاویٰ میں صلوٰۃ طیبی کا حوالہ اکثر مقامات پر دیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں ''قال العالم العارف الفقیہ المحقق المدقق الشیخ طیب بنارسی'' (تذکرہ مشائخ بنارس ص۲۲)

طریق اصلاح وبیعت

شاہ صاحب بیعت کے سلسلے میں نہایت حزم واحتیاط فرماتے تھے، سلسلہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہرکس وناکس کو ہاتھ نہیں دیتے تھے۔ جب تک طالب بیعت کے حسن اعتقاد اور تقویٰ وتدین کو اچھی طرح جانچ نہیں لیتے، بیعت نہیں کرتے تھے۔ بیعت

کے بعد ابتداء میں صرف ایام بیض کے روزے اور چھ رکعت صلوٰۃ اوابین پر مداومت کا حکم دیتے۔ اس کے بعد بقدر استعداد نوافل و وظائف اور دیگر مجاہدات و ریاضت کی اجازت دیتے تھے۔ ابتداء میں اوراد کی پابندی پر بہت تاکید فرماتے تھے۔ ان امور پر مکمل مداومت کے بعد ذکر جہری کی تلقین فرماتے اور اس پر استقامت حاصل ہو جانے پر مراقبہ کا حکم دیتے تھے۔ سالکین و مریدین کی اصلاح و تربیت کا ہمہ وقت خیال رکھتے تھے۔ جس کے اندر صلاحیت و استعداد پاتے اس کی جانب بطور خاص توجہ فرماتے تھے۔ (مناقب ص ۱۷)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں شاہ صاحب بلاخوف لومت لائم سعی بلیغ فرماتے تھے اور ابتداء میں تو مزاج میں اس قدر شدت تھی کہ خلاف شرع امر کو دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتے تھے۔ اگر کہیں سے ڈھول یا نقارہ کی آواز کان میں پڑ جاتی تو اسے توڑے بغیر قرار نہ ہوتا تھا۔ نماز فجر کے وقت مسجد میں جاتے ہوئے اگر کسی کو سویا ہوا دیکھ لیتے تو اس کے اوپر پانی ڈال دیتے تھے۔ یا عصا سے کرید کر جگا دیتے اور نہ اٹھنے پر کبھی کبھی عصا سے مار بھی دیتے تھے، شادی، بیاہ کے سلسلے میں غیر قوموں کے اختلاط سے مسلمانوں میں اس وقت جو غلط رسمیں جاری ہو گئی تھیں، مثلاً جلوہ، نقارہ وغیرہ اسے اپنی اصلاحی کوششوں سے بالکل ختم کر دیا تھا۔

مناقب میں ہے:

اکثر بدعتہا کہ دریں دیار شائع بود مثل نقارہ وجلوہ ورسوم نکاح ہمہ را دور ساختہ
ورسم جاہلاں کہ در خلق پراگندہ بود جملہ را از میاں برانداخت (ص ۱۳)

''اکثر بدعتیں جو اس دیار میں جاری تھیں جیسے جلوہ و نقارہ اور نکاح کی دیگر رسمیں سب کو ختم کر دیا اور جاہلانہ رسوم جو عوام میں پھیلی ہوئی تھیں ان سب کو بالکل دور کر دیا۔''

اس سلسلہ میں صاحب گنج ارشدی نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے جس سے شاہ صاحب کی ایمانی جرأت وصلابت کا اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب شہر کی جامع

مسجد میں نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے ایک مرتبہ خطیب نے خطبہ میں شہنشاہ اکبر کا نام لیا۔ اس کا نام سنتے ہی شاہ صاحب کو جلال آ گیا، آگے بڑھ کر خطیب کو منبر سے کھینچ لیا اور فرمایا خطبہ میں کافر کا نام لیتا ہے۔ اتفاق سے شاہ صاحب کے ہمراہ اس وقت ان کے دونوں شیوخ حضرت مولانا خواجہ کلاں اور شیخ تاج الدین جھوسوی بھی تھے۔ شہر کے قاضی اور حاکم تو شاہ صاحب سے ان کے ہیبت وجلال کی بناء پر کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ ان دونوں بزرگوں سے عرض کیا کہ ہم بادشاہ کے نوکر ہیں اگر بادشاہ کو معلوم ہوجائے گا کہ خطبہ سے اس کے نام کو خارج کر دیا گیا ہے تو ملازمت تو جائے گی ہی ہمارے مکانات بھی مسمار کرادے گا، اس لئے ہم خطبہ میں اس کے نام کو شامل کرنے میں مجبور ہیں۔ خواجہ کلاں نے اس دن سے شاہ صاحب کو ہدایت کر دی کہ نماز جمعہ بجائے جامع مسجد کے منڈواڈیہہ میں ادا کرلیا کریں۔ (گنج ارشدی ص۱۷۳)

امراء واغنیا کے ساتھ اس بارے میں انتہائی متشدد تھے، ان کے ساتھ رفق ونرمی کا معاملہ کرنا تو گویا جانتے ہی نہ تھے۔

صاحب مناقب لکھتے ہیں:

> ووے قدس سرہ باجماعت اغنیاء درکلام بسیار شدید بود وسخن ہرگز برفق نگفتے واگر خلاف شرع ازیں جماعت دیدے منع کردے وزجر فرمودے واگر کسے از ابنائے روزگار باسبلت دراز خدمت وے رسیدے سبلت وے بریدے۔ (ص۱۲)

''حضرت شاہ صاحب قدس سرہ جماعت اغنیاء کے ساتھ گفتگو بڑی سخت فرماتے تھے، نرمی ہرگز نہ فرماتے، اگر کوئی دراز مونچھ والا خدمت میں آجاتا تو اس کی مونچھ کٹوادیتے تھے۔''

امراء وحکام کا شاہ صاحب کے ساتھ برتاؤ

شاہ صاحب امراء وحکام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ کبھی اپنی ضرورت سے

ان کے دربار میں جاتے تھے، البتہ اگر کوئی ضرورت مند، صاحب احتیاج کسی حاکم کے پاس سفارش کی درخواست کرتا تو "من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها" الآیۃ، کے پیش نظر ان کے پاس جانے میں دریغ نہ فرماتے تھے۔ امراء شاہ صاحب کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ ان کے مجلس میں پہنچتے ہی اگر خلاف شرع کوئی چیز ہوتی تھی مثلاً شطرنج، وغیرہ تو فوراً وہاں سے ہٹا کر کہیں چھپا دیتے تھے۔ بسا اوقات تو ان کے مجلس میں پہنچنے سے پہلے ہی ان چیزوں سے مجلس کو پاک وصاف کر دیتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر شاہ صاحب کی باتوں کو سنتے اور فوراً اس پر عمل درآمد کرتے تھے۔

مدد معاش کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ

شاہ صاحب امراء وسلاطین کی عطیات اور جاگیروں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور نہ کبھی اسے قبول کیا۔ اکثر فرماتے تھے کہ "ایں مدد معاش مدد ممات است" اپنے متعلقین کو بھی اس سے احتراز کرنے اور بچنے کی سخت تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے خادم خاص وخلیفہ با اختصاص شاہ یٰسین بنارسی کو مخاطب کر کے بارہا فرمایا کہ دیکھنا اس مدد معاش کو کبھی قبول نہ کرنا ایک غریب فقر وفاقہ کے باوجود اپنے گھر میں اطمینان وعافیت سے رہتا ہے لیکن جب اسے قبول کر لیتا ہے تو اسے حاکم، فوجدار، صوبہ دار اور دیوان کے دربار میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی نگرانی کے لئے چوکیدار بٹھائے جاتے ہیں اور مقررہ حقوق کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے اس کا اطمینان وسکون اور راحت وعافیت غارت ہو جاتا ہے اور انجام کار یہ مدد معاش اس کے حق میں مدد ممات ہو جاتی ہے۔ (مناقب ص ۱۲)

فتوحات کے سلسلہ میں طرز عمل

شریعت آباد کے ابتدائی زمانہ قیام میں معاش کی بڑی تنگی رہی، اکثر ایام فاقے میں گذرتے تھے، ساتھ میں رہنے والے طلبہ وفقراء جنگل کی گھاس یا جنگلی درختوں کے پھل

کھا کھا کر دن کاٹتے تھے، مگر بعد میں خدائی قانون "من یتقی اللّٰہ یجعلہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسبُ" کے مطابق فتوحات کے دروازے کھل گئے اور ہدایا و تحائف کثرت سے خدمت میں آنے لگے۔ قبول ہدایا کے بارے میں شاہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ غریب ارادتمندوں اور مریدوں کے ہدیے تو بلا چون و چرا قبول کرلیا کرتے تھے اور اسے اپنی ضروریات میں صرف فرماتے تھے مگر امراء ورؤسا کی جانب سے پیش کئے گئے تحائف کو رد فرما دیتے تھے۔ البتہ اگر اس جماعت کا کوئی فرد حلقۂ ارادت میں داخل ہو جاتا تو اس کے ہدیہ کو شرف قبولیت عطا ہو جاتا تھا لیکن اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے فقراء وغرباء پر تقسیم کر دیتے تھے۔

مناقب میں ہے:

روش او ہم چنیں بود کہ از اغنیاء چیزے نگرفتے تا کہ او داخل محباں نمی شد ومحبت واعتقاد او محکم نمی گشت بعد ازاں کہ او داخل معتقداں می شد ونیت او معلوم می گشت ہر چہ می فرستاد یا می آورد قبول می فرمود آں را صرف فقراء ومسافراں می نمود وخود ازاں گاہے نمی خورد ونمی پوشد (مناقب ص ۱۱)

"(قبول ہدایا کے بارے میں) شاہ صاحب کی روش یہ تھی کہ اغنیا کی کوئی چیز قبول نہ کرتے تھے تاوقتیکہ وہ حلقۂ محباں میں داخل نہ ہو جاتے اور ان کی نیت نہ معلوم ہو جائے، اس کے حلقۂ محباں میں شامل ہو جانے کے بعد جو کچھ وہ بھیجتا یا خود لاتا تو قبول فرمالیا کرتے تھے لیکن اسے کبھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔"

عطیات وفتوحات کی تقسیم کے سلسلے میں شاہ صاحب کا عمل یہ تھا کہ انہیں دو حصوں پر تقسیم کر کے ایک حصہ اہل خانہ، خدام، اور خانقاہ کے طلبہ اور سالکین پر خرچ فرماتے تھے اور دوسرے حصہ کو شہر کے فقراء، غرباء اور سائلین پر صدقہ کر دیا کرتے تھے۔

مناقب ہی میں شاہ یٰسین لکھتے ہیں:

وطریق وے در باب قسمت فتوح عجیب بود کہ ہر چہ از غیب رسیدے نصف آں بارباب حقوق وفقراء شہر ومحتاجان وہمسائیگاں دادے ونصف بخادمان

خاص از جہتہ فقراء خانقاہ ومہماناں ومسافراں خرچ نمودے۔ (ص۱۱)

''شاہ صاحب کا طریقہ فتوحات کی تقسیم میں عجیب تھا جو کچھ آتا اسے دو حصوں پر تقسیم کر کے ایک حصہ ارباب حقوق فقراء شہر، محتاجوں اور ہمسایوں کو دیدیتے تھے اور نصف حصہ کو خدام کے حوالہ کر دیتے تھے جسے خانقاہ کے فقراء مہمانوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔''

معمولات

شاہ صاحب کا عام طور سے معمول یہ تھا کہ نماز تہجد کے بعد مراقب ہو جاتے جس کا سلسلہ نماز فجر تک جاری رہتا اور کبھی مراقبہ کے بجائے تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو جاتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی خاص کیفیت کے تحت مندرج رباعی بار بار پڑھتے اور مسجد کے صحن میں بیتابانہ چکر لگاتے اور زار و قطار روتے۔ رباعی یہ ہے:

گر صد ہزار قرن ہمہ خلق کائنات　　فکرت کنند در صفت وذات اے خدا

آخر بعجز معترف آیند کہ اے الٰہ　　دانستہ شد کہ ہیچ ندانستہ ایم ما

نماز فجر کے بعد چاشت تک تلاوت فرماتے اور صلوٰۃ چاشت پڑھ کر مسجد سے باہر آتے۔ زوال کے وقت تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کا بھی معمول تھا۔ بعد زوال نماز ظہر باجماعت ادا کر کے کچھ دیر تلاوت کرتے قرآن کی تلاوت میں بڑا اہتمام تھا بالعموم ہفتہ عشرہ میں قرآن ختم کرلیا کرتے تھے، تلاوت کے بعد عصر تک طلبہ کا درس جاری رہتا اور کبھی کبھی درس کے بجائے کچھ تصنیف وتالیف کا کام بھی اسی وقت کرلیا کرتے تھے نماز عصر کے بعد مغرب تک مسجد ہی میں مراقب رہتے۔ مغرب وعشاء کے درمیان نوافل اور ذکر واذکار میں مشغول رہتے اور عشاء سے کچھ پہلے گھر آ کر کھانا تناول فرماتے، کچھ توقف کے بعد نماز عشاء ادا کر کے وظائف پورا کرتے اس سے فارغ ہو کر سو جاتے۔ دوڈھائی گھنٹہ استراحت کرنے کے بعد بیدار ہو جاتے کبھی بستر پر اور کبھی مسجد میں جا کر ذکر واذکار میں منہمک رہتے۔

روزہ کے سلسلے میں معمول یہ تھا کہ ایام بیض، پنجشنبہ، جمعہ اور دوشنبہ کے روزوں کا

خاص طور سے اہتمام کرتے تھے ورنہ عام معمول صوم داوٗدی کا تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ رمضان کے عشرہ اخیرہ کے اعتکاف کا بھی معمول تھا۔ ان معمولات میں زندگی کے آخر لمحہ تک فرق نہیں آنے پایا تھا حتیٰ کہ آخر عمر میں استغراق و حضور دوام کے باوجود ان میں سرمو فرق نہیں تھا۔ (مناقب ص ۱۴، ۱۵)

غناء وسماع کے بارہ میں رویہ

ابتدائی عہد میں دیگر مشائخ چشت کی طرح شاہ صاحب بھی وجد وسماع سے خاصا ذوق رکھتے تھے۔

مناقب میں ہے:

وے قدس سرہ ابتداء وقت شغف برسماع بسیار داشت ووجد ورقص بسیار نمود وبعضے اوقات درجوش سماع درجنگل رفتے دوروز درجنگل ماندے وکسے ندانستے کہ کجا است (ص ۱۴)

''شاہ صاحب قدس سرہ ابتداء وقت میں سماع سے بہت شوق رکھتے تھے اور وجد و رقص خوب فرماتے تھے، بعض اوقات جوش وجد میں جنگل میں بھاگ جاتے اور دوروز تک غائب رہتے تھے۔''

لیکن جب مقام مشیخت پر پہنچے تو اس سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے تھے اور فرماتے تھے۔

دریں زمانہ سرود نباید شنید کہ بر ہیچ شرط باقی نماندہ وزمانہ فاسد شدہ ویاراں نماندہ موافق ودر قوالاں طمع جا گرفتہ دریں وقت سرود شنیدن مناسب طریقۂ فقراء نیست۔ (مناقب ص ۱۳)

''اس زمانہ میں غناء نہیں سننا چاہئے کیونکہ کوئی شرط اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔ زمانہ فاسد ہو چکا ہے یار موافق نہیں رہے اور قوالوں میں لالچ پیدا ہوگئی ہے اس وقت غنا سننا فقراء کے طریق کے مناسب نہیں ہے۔''

اس بارے میں آپ کا حال بعینہٖ حضرت شیخ عبدالقادر بن محمد حسنی جیلانی ملقب بہ شیخ عبدالقادر ثانی متوفی ۹۴۰-۳۹ھ جیسا تھا کہ وہ جب مقام مشیخت پر پہنچے تو سماع وغناء سے بالکلیہ پرہیز کرنے لگے تھے اور مریدوں کو بھی شدت سے منع کرتے تھے۔

اسرار طریقت کے بیان سے احتراز

شاہ صاحب تصوف کے اسرار وحقائق کے بیان کرنے سے بالکلیہ پرہیز کرتے تھے اور اگر کبھی کوئی شخص اس بارے میں کوئی بات پوچھتا تو فرماتے:

''ایں سخنان حالی راا ور مرتبۂ قالی آوردن دور از ادب است''

ان حالی باتوں کو قول کے درجے میں لانا بے ادبی ہے۔

شاہ یٰسین لکھتے ہیں کہ میں چونکہ بہت بے تکلف تھا، اسلئے کبھی کبھی جرأت وہمت کر کے بعض اسرار کو دریافت کرتا تو مجھ سے بھی کچھ بیان نہ فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ:

ایں سخن از جملہ واردات است تو در کار خویش مشغول باش ناپرسیدہ بر دل تو مثل آئینہ دار دخواہد شد۔

''یہ باتیں منجملہ واردات کے ہیں تم اپنے کام میں لگے رہو بغیر پوچھے قلب پر آئینہ کی طرح اس کا وارد ہو جائیگا۔''

لباس

لباس میں بھی مشائخ وعلماء کا اتباع کرتے تھے۔ موٹا اور کردرا گزینہ کا پیراہن عام طور سے زیب تن ہوتا اور سر پر پانچ یا سات گز کا عمامہ جس کا رنگ کبھی نیلگوں ہوتا اور کبھی سبز یہ دونوں رنگ شاہ صاحب کے نہایت دل پسند تھے، اس کے برخلاف پیلے رنگ سے بہت نفرت تھی، فرماتے تھے کہ یہ جوگیوں و سناسیوں کا لباس ہے جس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

غرض جملہ امور میں ظاہر شریعت اور کتاب وسنت نمونۂ عمل تھے جن سے سرمو

انحراف بھی گوارا نہیں تھا، درحقیقت معیار ولایت کتاب وسنت کی پابندی ہی ہے۔ جیسا کہ بعض اکابر سے منقول ہے جو جتنا پابند سنت ہے اتنا ہی بڑا اولی وبزرگ ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے شاہ صاحب ولایت وبزرگی کے مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ کیونکہ اتباع سنت ان کی طبیعت بن چکی تھی۔

شاہ یٰسین رقمطراز ہیں:

دراقوال وافعال تابع سیرت نبوی ودرحرکات وسکنات متبع سنت مصطفوی بود ہر کارے کہ خواستی کرد اول میزان آں بعمل مسنون کردے اگر موافق آمد اختیار می فرمود والا ازاں حذر می کرد ایں متابعت ملکہ طبیعت اوشدہ طریق اوطریق اصحاب بود۔ (مناقب ص ۱۵)

''اقوال وافعال میں سیرت نبوی کے اور حرکات وسکنات میں سنت مصطفوی کے تابع تھے جس عمل کو کرنا چاہتے پہلے اسے میزان سنت پر تولتے اگر موافق سنت ہوتا تو اس پر عمل کرتے ورنہ اس سے پرہیز کرتے تھے اور یہ متابعت ان کی طبیعت راسخہ بن چکی تھی، حاصل یہ کہ آپ کا طریقہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا۔''

وفات اور مدفن

شاہ صاحب کا وصال سلطان شہاب الدین بن محمد شاہجہاں متوفی ۱۶۶۷ء/ ۱۰۷۶ھ کے دور سلطنت میں شب دوشنبہ ۸؍شوال ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء کو ماہ پور ضلع غازی پور میں ہوا اور سہ شنبہ شوال کو منڈواڈیہہ بنارس میں اپنے آبائی مقبرہ میں سپرد خاک ہوئے۔

شاہ یٰسین بنارسی نے وفات کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

شب دوشنبہ کو موضع ماہ پور کی مسجد میں وضو کر رہے تھے کہ اثناء وضو میں اچانک سیدھے کھڑے ہوگئے اور قبلہ رو ہوکر تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور اسی کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

وفات سے کچھ عرصہ قبل ہی سے دوپہر کا قیلولہ اور شب کی استراحت کو بالکل ترک

کردیا تھا اور فرماتے تھے ''وقت قیلولہ نبودہ وخفتن نماندہ'' یعنی اب قیلولہ کرنے اور سونے کا وقت ختم ہوگیا۔ ہمہ وقت ذکر وفکر اور مراقبوں میں مشغول رہتے تھے۔

شریعت آباد سے جب ماہ پور کے لئے روانہ ہونے لگے تو خلاف معمول بیعت کے خواہشمندوں کو شہر سے بلاکر بیعت فرماکر داخل سلسلہ کیا اور فرمایا کہ اس کے بعد ''وقت نخواہند یافت'' یعنی پھر بیعت کا وقت نہیں پائیں گے۔

شاہ یٰسین یہ بھی لکھتے ہیں کہ وفات کے بعد حیرت انگیز طور پر نبض چلتی رہی اور جسم بدستور گرم رہا جس سے لوگوں کو حیات کا شبہ ہوا حالانکہ روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔ وفات کی اطلاع ملتے ہی شیخ پورہ اور قرب وجوار کے اعزہ اور متعلقین رات ہی کو ماہ پور میں جمع ہوگئے، غسل وکفن کے بعد تدفین کا مسئلہ سامنے آیا۔ شیخ پورہ کے اکثر اصحاب کی رائے یہ تھی کہ جنازہ جھوسی میں دفن کیا جائے لیکن شیخ ناصر الدین خلیفہ حضرت شاہ صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ تدفین منڈاوڈیہہ میں ہونی چاہئے۔ بالآخر انہیں کی رائے پر اتفاق ہوگیا اور رات کے آخر حصہ میں جنازہ ماہ پور سے اٹھایا گیا اور سہ شنبہ کو ایک پہر دن چڑھتے چڑھتے منڈواڈیہہ پہنچ گیا جہاں خاندانی مقبرہ میں تدفین عمل میں آئی۔ (ص ۳۹،۳۰)

شیخ مسعود اسعدی بنارسی نے یہ تاریخ وصال کہی ہے:

شیخ روشن دل کہ اہل عرش وفرش | نام پاکے او بہ پاکی می برند
یافت تاریخ عروجش اسعدی | جلوہ گاہ اوشدہ عرش بلند

۱۰۴۲
(مناقب ص ۳۱)

وفات کے چند ماہ بعد کسی معتقد نے مزار پر ایک بلند اور وسیع چبوترہ تعمیر کروایا، اور اس کے بارہ سال بعد ۱۰۵۴ھ میں شاہ صاحب کے ایک مرید خواجہ عبدالصمد نے اس پر ایک شاندار گنبد بنوادیا جو اسی شان کے ساتھ آج بھی قائم ہے۔ مقبرہ کا احاطہ وسیع ہے جس میں شاہ صاحب کے خاندان اور متعلقین کے مزارات کے علاوہ ایک مسجد بھی ہے جسے شاہ غلام معین الدین جون پوری متوفی ۱۱۲۰ھ نے تعمیر کرائی تھی بعد میں ۱۳۰۵ھ میں اس کی جدید تعمیر ہوئی ہے۔ محراب میں یہ کتبہ نصب ہے جسے مولانا وکیل احمد سکندر پوری

نے نصب کیا ہے:

ازسرنوساخت ایں مسجد معین دین حق　　سالہا باشد برائے اہل ایماں یادگار
سال مسعود بنائش عاجز خستہ نوشت　　مسجد درگاہ شاہ طیب والا تبار
۱۳۰۵

سالانہ ۸؍شوال کو خانقاہ رشیدیہ جون پور کے زیر اہتمام مزار پر قرآن خوانی ہوتی ہے اور فقراء اور غرباء کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے شاہ صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی، البتہ شاہ یٰسین کی آپ نے مثل فرزند کے پرورش وتربیت کی تھی۔ یہی آپ کے وصال کے بعد جانشین ہوئے۔

چندمریدین وخلفاء

شاہ صاحب نے تعلیم وتحصیل اورعرفان وسلوک میں تکمیل کے بعد پوری زندگی بنارس میں ارشاد وتلقین میں بسر کی اور ہندوستان کے مشائخ کی طرح آپ نے دیار پورب میں بڑا اصلاحی وتبلیغی کام کیا بقول صاحب مناقب ''اکثر طالبان ومصاحبان وے بدرجۂ کمال رسیدہ اند وخلفائے وے بمرتبۂ تکمیل دیگراں مرتقی شدہ'' یعنی ان کے اکثر متوسلین درجۂ کمال کو پہنچے اور خلفاء دوسروں کی اصلاح وتربیت کے مقام پر فائز ہوئے۔ ان اکثر طالبین وخلفاء میں سے جن چند بزرگوں کے حالات مل سکے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) دیوان محمد رشید جونپوری

گیارہویں صدی کے علماء ومشائخ میں دیوان صاحب شریعت وطریقت کے مسلم مقتداء اور امامت وعبقریت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ۱۰؍ذی قعدہ ۱۰۰۰ھ کو موضع برونہ ضلع اعظم گڈھ میں آپ کی ولادت ہوئی، چونکہ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ نے اپنے شیخ ومرشد کے حکم سے برونہ سے ترک سکونت کرکے پورنیہ میں اقامت اختیار کرلی تھی، اس لئے دیوان صاحب کی پرورش وتربیت ان کے ماموں شیخ شمس الدین برونوی متوفی ۱۰۴۷ھ نے کی۔

استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ مفتی شمس الدین برونوی، شیخ محمد لاہوری، شیخ نورمحمد مداری جونپوری وغیرہ سے علوم فنون کی تکمیل کی اور علم حدیث شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے دہلی جا کر حاصل کیا۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد شاہ طیب بنارسی سے بیعت کی اور احسان وسلوک کے منازل طے کر کے ۱۰۴۰ھ میں شاہ صاحب سے سلسلۂ چشتیہ میں خلافت واجازت پائی اور چند مہینوں کے بعد شاہ صاحب ہی سے سلاسل سہروردیہ وقادریہ کی اجازت سے بھی مشرف ہوئے۔

دیوان صاحب کو شاہ طیب بنارسی کے علاوہ اس عہد کے دیگر مشائخ سے بھی خلافت واجازت حاصل تھی، جن میں شیخ تاج الدین جھوسوی متوفی ۱۰۷۳ھ، شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری متوفی ۱۰۵۲ھ، شاہ راجی سید احمد مانکپوری متوفی .... اور شیخ شمس الدین کالپوری متوفی سنہ.... کے نامنامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دیوان صاحب پوری زندگی ارشاد و تلقین کے ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ اور تلامذہ وخلفاء کی کثیر جماعت کے علاوہ متعدد اہم تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں مناظرہ رشیدیہ عربی، شرح ہدایۃ الحکمت عربی، شرح اسرار المخلوقات، حاشیہ شرح مختصر عضدی، اپنے اپنے فن میں نہایت اہم ہیں۔ دیوان صاحب کے ذریعہ شاہ صاحب کے سلسلے کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاہ طیب قدس سرہ کے مفاخر ومحاسن کے لئے یہی کافی ہے کہ انھوں نے دیوان رشید جیسے امام وقت کو اپنی خانقاہ سے پیدا کیا۔

دیوان صاحب کے زیر تربیت رہ کر جن بزرگوں نے درجۂ کمال حاصل کیا اور شرف خلافت سے مشرف ہوئے، ان کی تعداد بارہ ہے جن میں آپ کے صاحبزادے شیخ محمد ارشد جونپوری، میر سید جعفر پٹنوی، میر سید قیام الدین گھورکھپوری، شیخ عبدالشکور ماہلی، شیخ نورالدین مداری، شیخ محی الدین جونپوری، شیخ حبیب اللہ بہاری، شیخ عبداللہ بنگالی نے بڑی شہرت پائی اور ان کے ذریعہ سلسلہ کی خوب اشاعت ہوئی۔

دیوان صاحب کی وفات یوم جمعہ ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ کو بحالت سجدۂ نماز فجر

ہوئی۔آپ کے تلمیذ خاص و مرید صالح شیخ محمد ماہ دیوگامی نے نماز جنازہ ادا کرائی اور محلّہ رشید آباد شہر جونپور میں ہمیشہ کے لئے یہ گنجینۂ علم ودانش اور مخزن رشد وہدایت مدفون ہوگیا۔

(۲) شیخ ناصر الدین جھوسوی

شیخ ناصر الدین بن خواجہ کلاں ابن اسد العلماء شیخ نصیر الدین جھوسوی اپنے وقت میں کبار مشائخ چشت میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والد کے ابن عم اور خلیفہ شیخ تاج الدین جھوسوی کے سایۂ عاطفت میں بچپن کے ایام گذار کر بنارس آئے اور حضرت شاہ طیب بنارسیؒ سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جونپور گئے اور وہاں کے ممتاز اساتذہ سے فقہ، اصول فقہ اور معانی کی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں کٹرہ مانک پور جا کر حدیث وتفسیر کی تحصیل کی۔ جملہ علوم مروجہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اپنے والد مولانا خواجہ کلاں اور شیخ تاج الدین کی صحبت میں رہ کر عرصۂ دراز تک اکتسابِ فیض کرتے رہے، پھر بنارس حضرت شاہ طیب بنارسی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ اور انہیں کی خدمت میں رہ کر سلوک کی تکمیل کی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت شاہ صاحب کے علاوہ انہیں شیخ تاج الدین جھوسوی سے بھی خلافت واجازت حاصل تھی۔

مجاہدہ وریاضت میں بڑا انہماک تھا، صفائی قلب کی بناء پر دوران ذکر عجیب وغریب امور کا مشاہدہ کرتے تھے، خود انہیں کا بیان ہے کہ ابتدائے وقت میں ایک دن دوران ذکر قلب کی جانب توجہ کی تو دیکھا کہ تمام قلب اسم پاک کے نقش سے مزین ہے یہ حالت دیکھ کر اس درجہ بہجت ومسرت حاصل ہوئی کہ یہ شعر پڑھ کر رقص کرنے لگا۔

در دل نگارد دست چناں نقش بستہ اند
اما گذار نیست بپا بوس کونہم

اسی غلبۂ حال میں خیال ہوا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں چل کر اس جاں بخش کیفیت سے انہیں مطلع کروں جب چلنے کا قصد کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ زمین کے چپے چپے

پراسم پاک کانقش ابھرا ہوا ہے۔شیخ تاج الدین جھوسوی کے وصال کے بعد خانقاہ جھوسی کے یہی سجادہ نشین ہوئے اور پوری زندگی اپنے بزرگوں کے طریق پر ارشاد وتلقین اوراصلاح وتبلیغ میں بسر کردی تفصیلی حالات اورسن وفات کاعلم نہ ہوسکا۔

(۳) شاہ یٰسین بنارسیؒ

حضرت شاہ یٰسین بنارسیؒ کی ولادت ۱۰۲۰ھ میں جون پور میں ہوئی،نسلاً شیخ صدیقی ہیں۔شجرۂ نسب یہ ہے: شاہ یٰسین بن شیخ احمد بن شیخ عبدالرحیم بن شیخ اوحد بن شیخ راولہ بن شیخ نجم الدین بن شیخ اسحاق بن صفی الدین ثانی بن عبدالسمیع بن عبدالرشید بن عبدالشہید بن ابوسعید بن ابوالمعالی بن عبدالولی بن عبدالعزیز بن شاہ اسماعیل بن مخدوم صفی الدین کبیر عربی بن عبدالسلام بن ابوالفضل بن ابوعبداللہ بن ابوجعفر بن ابوخلیل بن حضرت محمد بن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم (گنج ارشدی ورق ۲۴۳ جلد۱)

صاحب بحرذخار نے شاہ یٰسین کے ذکر میں لکھا ہے کہ ''خلف و خلیفہ شاہ طیب بنارسی'' (ص۱۰۰) خلیفہ کی حد تک تو ان کی بات درست ہے لیکن خلف لکھنا صحیح نہیں ہے۔اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ شاہ یٰسین بچپن ہی میں شاہ صاحبؒ کی خدمت میں آگئے تھے اور شاہ صاحب نے ان کی اپنے لڑکے کی طرح پرورش اورنگہداشت کی تھی،اس لئے لوگوں کوصحیح بات کاعلم نہ ہوسکا۔

چنانچہ گنج ارشدی میں ہے:

> ہرچند وے پسر صلبی حضرت شیخ نبودہ اما وے را از طفلی درحجرہ خود تربیت فرمودہ کہ خاص وعام وے را پسر حضرت شیخ می دانستند کم کسے نام پدر وے میداند (ورق ۲۴۲ ج۱)

''ہرچند کہ شاہ یٰسین حضرت شاہ طیب کے پسر صلبی نہیں تھے لیکن انہیں بچپن ہی سے شاہ صاحب نے اپنی آغوش تربیت میں لے لیا تھا کہ خاص وعام انہیں حضرت کا لڑکا ہی سمجھتے رہے اور بہت کم لوگوں کو ان کے والد کا نام معلوم ہوسکا۔''

شاہ یٰسین نے ابتدائی صرف ونحو سے لے کر ارشاد (قاضی شہاب الدین دولت آبادی) وکنز الدقائق تک کی تعلیم شاہ صاحب سے ہی حاصل کی اس کے بعد شاہ صاحب کے حکم سے جون پور چلے گئے اور شیخ محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اور دیوان محمد رشید جونپوری سے بقیہ نحو اور منطق، فلسفہ، فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل کی۔ دوران تعلیم ہی میں جب کہ ان کی عمر کا انیسواں سال تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں سلسلہ میں داخل فرما کر ذکر ووظائف کی تلقین کی بالخصوص نماز تہجد اور اوّابین پر مداومت کی تاکید کی اور ایک سال کے بعد یعنی ۱۰۴۰ھ میں عید کے دن خرقۂ خلافت سے نوازا۔ اس وقت شاہ یٰسینؒ اصول بزدوی پڑھ رہے تھے۔ جون پور و بنارس کے درمیان قرب مسافت کی بناء پر بنارس اکثر آنا ہوتا تھا جس کی وجہ سے تعلیمی نقصان ہوتا تھا، اس لئے شاہ صاحب نے جون پور کے بجائے انہیں کڑہ شیخ جمال اولیاء کڑوی متوفی ۱۰۴۲ھ کی خدمت میں بھیج دیا۔

شاہ یٰسین نے شیخ جمال سے ہدایہ اور تفسیر بیضاوی کی تعلیم شروع کی لیکن ڈھائی ماہ بھی گذرنے نہیں پایا تھا کہ شاہ صاحب کا قاصد مکتوب لے کر پہنچ گیا جس میں تحریر تھا کہ خط دیکھتے ہی بلا تاخیر بنارس آجاؤ۔ خط رمضان شریف کی انتیسویں تاریخ کو ملا۔ اس لئے ایک دن رک کر نماز عید ادا کر کے کڑا سے روانہ ہوگئے راستہ ہی میں جھوسی سے چند میل آگے پہنچے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کے وصال کی خبر ملی۔ چنانچہ سرگرداں و پریشاں شب وروز قطع مسافت کرتے ہوئے ۱۰ر شوال المکرّم یوم چہارشنبہ کو منڈواڈیہہ پہنچے ان کے دو دن بعد دیوان محمد رشید بھی جون پور سے آگئے۔ چونکہ شاہ یٰسین بچپن ہی سے شاہ صاحب کے آغوش تربیت میں پلے تھے، اس لئے اس سانحہ کا ان پر خاص اثر تھا، ان کی دلجوئی وتسلی کی غرض سے دیوان محمد رشید اور شیخ ناصر الدین ایک ماہ تک منڈواڈیہہ میں قیام پذیر رہے اور شاہ یٰسین کی اچھی طرح دلجوئی وخاطر داری کر کے اپنے اپنے مقام پر واپس لوٹ آئے۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد شاہ یٰسین نے اپنا اصلاحی تعلق دیوان محمد رشید سے قائم کرلیا اور ان سے بھی خلافت واجازت حاصل کی بعد میں شاہ یٰسین صاحب ہی شاہ صاحب کے جانشین ہوئے اور پوری زندگی منڈواڈیہہ میں اصلاح وتبلیغ کی خدمت انجام

دیتے رہے۔عبادت وریاضت میں بڑا انہماک تھا۔عام طور سے نصف شب کو بیدار ہوجاتے اور فجر تک نوافل اور اشغال میں مصروف رہتے تھے۔

گنج ارشدی میں ہے:

وقریب نصف شب برمی خاست وضونمودہ تا فجر ادائے نوافل واشغال گذرایند بعداذان فجر نماز صبح ادامی فرمود۔(ص۲۵۴)

''نصف شب کے قریب بیدار ہوجاتے اور وضو کر کے فجر تک نوافل اور اشغال میں مصروف رہتے اور بعد اذان فجر نماز فجر ادا کرتے تھے۔''

زندگی کے آخر ایام میں جھوسی تشریف لے گئے تھے وہیں پیام اجل آپہنچا اور ۲۰/ربیع الثانی ۱۰۷۶ھ شب سہ شنبہ کو جان جان آفریں کے سپرد کردی۔جوسی ہی میں اسدالعلماء شیخ نصیرالدین جھوسوی کے مقبرہ میں مدفون ہوئے (گنج ارشدی ص۲۵۴)

مرقع بنارس میں ہے کہ ''مزار منڈواڈیہہ میں ہے'' جو درست نہیں ہے۔

شاہ یٰسین کی علمی یادگار میں آپ کی گراں قدر اور اہم تصنیف ''مناقب العارفین'' ہے جس کا ایک قلمی نسخہ جامعہ مظہرالعلوم بنارس کی ملکیت میں ہے، یہی قلمی نسخہ اس مقالہ کا اصل ماخذ ہے۔شاہ یٰسین نے اس تذکرہ کو اپنے شیخ و مربی حضرت شاہ طیب بنارسی کی وفات کے دس سال بعد ۱۰۵۴ھ میں مرتب کیا تھا، کل صفحات ۲۴۰ ہیں۔لیکن کتاب پر ۲۳۸ کی عدد لکھی ہے۔ابتدائے کتاب سے ۱۲۰ صفحات تک شاہ طیبؒ اور ان کے خاندان کے بزرگوں کے حالات ہیں جسے شاہ یٰسین نے اپنی ذاتی معلومات اور شاہ صاحب کے اعزہ و متعلقین سے دریافت کر کے لکھا ہے۔اس کے بعد پھر دوسرے مشائخ چشت کا سلسلہ وار تذکرہ ہے۔جس کا ماخذ عام طور سے اخبارالاخیار اور سیر العارفین ہے۔

کتاب کے سرورق پر گوشہ میں یہ عبارت درج ہے:

''چند روزے بعاریت باماست کتبہ فقیر خیرالدین محمد'' اوراس سے پہلے شیخ خیرالدین محمد ہی کے قلم سے ایک مختصر نوٹ ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ کچھ دنوں تک شیخ خیرالدین محمد الہ آبادی کے مطالعہ میں رہ چکا ہے۔

(۴) شیخ عالم بنارسی

شیخ عالم بن شیخ اللہ داد بن شیخ داؤد بنارسی شاہ صاحب کے خاندانی چچا تھے۔ صلاح و تقویٰ اور عبادت وریاضت میں امتیازی شان رکھتے تھے یہ اگرچہ شیخ تاج الدین جھوسویؒ کے مجاز تھے۔ لیکن زندگی بھر اپنے آپ کو شاہ صاحب کا خادم و مرید شمار کرتے رہے۔ رشتہ میں چچا ہونے کے باوجود شاہ صاحب کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے اور ہمہ وقت خدمت بجالانے کی فکر میں رہتے تھے۔ شاہ صاحب بھی ان کا بہت احترام ولحاظ کرتے تھے۔ ان کا مستقل قیام منڈواڈیہہ میں تھا۔ لیکن بربنائے عقیدت ومحبت اکثر شریعت آباد تشریف لاتے اور شاہ صاحب کے فیض صحبت سے نفع اندوز ہوتے۔ ایک بار شاہ صاحب نے غلبۂ حال میں ان سے فرمایا: 'دریں ساعت ہر چہ بخواہی خواہ'' یعنی اس وقت جو مانگنا چاہو مانگ لو۔ انھوں نے عرض کیا صرف اتنی خواہش ہے کہ میری وفات آپ کی موجودگی میں ہو اور آپ اپنے ہاتھوں سے میری تجہیز وتکفین فرمائیں۔ ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ شاہ صاحب کے وصال سے ایک سال قبل ۱۰۴۱ھ میں اس حال میں انتقال کیا کہ شاہ صاحب ان کے سرہانے بیٹھے تھے اور یہ دم توڑ رہے تھے۔ حسب وعدہ شاہ صاحب نے اپنے ہاتھوں غسل دیا اور تجہیز وتکفین کی مزار منڈواڈیہہ میں تالاب کے کنارہ اب بھی موجود ہے۔ (مناقب ص۲۰)

(۵) شیخ عبدالمؤمن کشمیری

وطن مالوف کشمیر تھا، بنارس آکر شاہی ملازمت سے وابستہ ہوگئے، لیکن جب حضرت شاہ صاحب سے عقیدت ہوئی اور ان سے بیعت کرلی تو ملازمت کو خیرباد کہہ کر ہمہ تن عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے، ان کے مفاخر ومحاسن میں اہم ترین چیز یہ ہے کہ شاہ صاحب سے ان کی گرویدگی محبت وعشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کے ادنیٰ اعراض سے بھی تڑپ اٹھتے تھے اور جب تک ان کی چشم عنایت کو اپنی جانب مائل نہ کرلیتے قرار نہ آتا تھا۔ شاہ صاحب کی خدمات انہیں سے متعلق تھیں جنہیں یہ تاحیات

بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ۲۸/یا ۲۹/ذی قعدہ ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی، وفات سے کچھ دیر قبل فرمایا کہ قبر تیار کرلو۔ قبر تیار ہوجانے کے بعد تیمارداروں سے کہا پانی گرم کرو، جب پانی گرم ہوگیا تو تکیہ کے نیچے سے کفن نکال کر اوڑھ لیا اور جان مولائے حقیقی کے حوالہ کردی۔ (مناقب ص۲۲)

(۶) شیخ فاضل محمد پھلتی

یہ قصبہ ضلع مظفر نگر پھلت کے باشندہ تھے۔ ابتداء میں انہیں کسی سے عشق ہوگیا تھا۔ محبوب کی مفارقت کے غم میں بحالت شوریدگی گھر سے نکل پڑے۔ دیوانہ وار در بدر کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے خوش قسمتی سے شاہ صاحب کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ ان کی دیوانگی و پریشان حالی پر شاہ صاحب کو بڑا رحم آیا۔ بالآخر تصرفات باطنی کے ذریعہ ان کے عشق مجازی کو عشق حقیقی کی جانب پھیر دیا۔ انجام کار جمعیت کے ساتھ عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ شاہ صاحب ان سے بہت محبت کرتے تھے اور یہ بھی شاہ صاحب پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک لمحہ کی جدائی بھی برداشت نہیں تھی۔ چونکہ گھر سے بعالم دیوانگی غائب ہوئے تھے، اس لئے گھر والے اسی وقت سے تلاش میں تھے۔ تقریباً پانچ سال کے بعد ایک صاحب تلاش کرتے کرتے بنارس بھی پہنچے۔ شہر میں کسی سے معلوم ہوا کہ فاضل محمد نام کے ایک صاحب شریعت آباد میں شاہ طیب بنارسی کی خانقاہ میں رہتے ہیں۔ یہ خانقاہ میں حاضر ہوئے اور گھر والوں کی پریشانیاں بیان کرکے انہیں واپس لے جانے کی اجازت طلب کی، شاہ صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔ مگر یہ خود راضی نہ ہوئے۔ شاہ صاحب نے کسی طرح سے راضی کرکے رخصت کیا۔ پھلت میں انہیں خوب مقبولیت حاصل ہوئی اور ایک کثیر جماعت ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئی بالآخر چند سال کے بعد رہزنوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ تاریخ وفات کا علم نہ ہوسکا۔ (مناقب ص۲۲،۲۳)

(۷) شیخ حسن

یہ نومسلم تھے۔ شیخ محمد رہتکی متوفی سنہ... کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے

اورانہیں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور سلوک کے منازل طے کر کے بلند مقام پر پہنچے۔شاہ صاحب نے اپنے دست خاص سے انہیں خرقہ پہنایا۔

شاہ صاحب کی رحلت کے بعد شہر کے اکثر لوگوں نے انہیں کی جانب رجوع کرلیا تھا۔ ۱۰۴۹ھ میں انتقال کیا اور شریعت آباد میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے احاطے میں دفن ہوئے۔(مناقب ص۲۳)

(۸) شیخ طاہر بنارسی

شیخ طاہر بن شیخ چاندہ بن شیخ حافظ بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ فرید بنارسی، شاہ صاحب کے خاندانی عزیز اور مرید خاص تھے۔عرصۂ دراز تک شریعت آباد میں حجرہ بنا کر علائق دنیوی سے یکسو ہوکر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے،لیکن جب تنگیٔ معاش نے بہت مجبور کردیا اور فاقے پر فاقے گذرنے لگے تو ناچار شاہی ملازمت کرلی جس میں انہیں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ دنیاوی ثروت ووجاہت کے باوجود فقراء سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور خود بھی ہروقت ذکرالٰہی میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔آنکھیں بھی اکثر یادخداوندی میں اشکبار رہتی تھیں۔انہیں بھی شاہ صاحب سے خصوصی تعلق ومحبت تھی۔شاہ یٰسین کا بیان ہے کہ شاہ صاحب کی وفات کے چند دن بعد برائے فاتحہ مزار پر حاضر ہوئے تو فرطِ غم سے روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں،اسی حال میں سسکیاں لیتے ہوئے کہا کہ بزرگوں کی جدائی کا صدمہ سہا نہیں جاتا۔ چنانچہ اس واقعہ کے تین ماہ کے اندر ہی ۱۰رمحرم ۱۰۴۲ھ کو وفات پا کر بزرگوں کے پاس جا پہنچے۔مزار محلّہ بھدوؤں شہر بنارس میں خواجہ مبارک بنارسی کے خطیرہ میں ہے۔(مناقب ۱۰۱)

شیخ طاہر کی یادگار میں ایک مسجد آج بھی گنگا، برنا سنگم پر چندن شہید کے مزار کے متصل موجود ہے (تذکرہ مشائخ بنارس)

☆ ☆ ☆

قطب الاقطاب دیوان محمد رشید عثمانی جونپوری

قدرت کا یہ عجیب نظام ہے کہ ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا سبب ہوتی ہے، ایک جانب ایک شہر اجڑتا ہے تو دوسری طرف دوسرا آباد ہوتا ہے، یہی ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے اسی قانون فطرت کے تحت جب فتنۂ تیموری کی ہلاکت خیزیوں سے مغرب میں دلی کی علمی، تمدنی اور معاشرتی دنیا میں بادخزاں کے تند جھونکے چل رہے تھے تو دوسری جانب دیار پورب کے شہر جونپور میں علم وفن اور تمدن ومعاشرت کے چمنستان میں بہار آئی ہوئی تھی، تاجدار سلطنت شرقیہ ابراہیم شاہ المتوفی ۱۴۴۰ء کے حسن انتظام علم دوستی، علماء نوازی اور فیاضی سے جونپور مرجع ارباب کمال بن گیا تھا، یہاں کے مواضعات وقصبات میں علم وفضل کی مسندیں بچھ گئی تھیں، اہل علم ودانش دور دراز مقامات سے کھینچے چلے آرہے تھے اور شہر جونپور یاتون من کل فج عمیق کا مصداق بنا ہوا تھا، اِن نو وارد اہل کمال میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی ذات گرامی بھی ہے، قاضی صاحب کے جونپور میں آتے ہی اس کے گلستان علم میں بہار نو آگئی، درحقیقت جونپور کی علمی تاریخ کا آغاز قاضی دولت آبادی کی ذات گرامی سے ہوتا ہے، اس میں سلطان الشرق ابراہیم شاہ بھی برابر شریک رہا، سلطنتِ شرقیہ اگرچہ اسّی (۸۰) برس کی قلیل مدّت میں ختم ہوگئی لیکن ملک العلماء اور ملک الشرق نے جس گلستانِ علم کی آبیاری کی تھی وہ تقریباً ساڑھے تین سو سال تک پھولتا پھلتا رہا۔ اور سرزمین جونپور سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے جن کے کارناموں پر ملت اسلامیہ کو آج بھی فخر ہے۔

ان ہی باکمال افراد میں زبدۃ الاخیار، عمدۃ الابرار، استاذ العلماء، ملاذ الفضلاء، فرید العصر، وحید الدہر، صاحب الرشاد والسداد فی مقام الارشاد قدوۃ اہل العلم والتجرید ابوالبرکات الشیخ دیوان محمد رشید الجونپوری العثمانی کی ذات گرامی بھی ہے۔

علمی مقام ومرتبہ

گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں دیوان صاحب امامت وعبقریت کے مقام پر فائزاور شریعت وطریقت کے مسلّم مقتدا تھے،آپ کے اساتذہ ومعاصرین آپ کی جودت طبع ،ذہانت، فطانت اور علمی وفنّی مہارت کے معترف تھے،آپ کے معاصراور استاذ بھائی شیخ رکن الدین بحریا آبادی تلمیذ خاص شیخ مفتی شمس الدین بردنوی المتوفی ۱۰۴۷ھ کو جب کوئی علمی شبہہ وارد ہوتا تو اپنے تبحر علمی کے باوجود دیوان صاحب کی طرف مراجعت فرماتے اور تشفی بخش جواب سے مطمئن ہوتے۔(۱)

استاذ الملک شیخ محمد افضل بن حمزہ عثمانی جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ جو آپ کے استاذ ہیں ایام طالب علمی ہی سے آپ کی قابلیت وفطانت کے قائل تھے۔ایک مرتبہ مختصر المعانی کے درس کے وقت ایک صاحب نے عرض کیا کہ یہ ''کان یکون'' کے معنی بھی سمجھتے ہیں یا یوں ہی پڑھ رہے ہیں، استاذ الملک نے برجستہ فرمایا کہ آپ ''کان، یکون'' کے معنی کے متعلق فرماتے ہیں یہ تو ''سیکون'' کے معنی بھی بیان کرتے ہیں،(۲) اسی اعتماد ووثوق کی بنا پر تحصیل وتکمیل سے فراغت کے بعد ایک مرتبہ آپ استاذ الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت استاذ شریفیہ کا جوفن مناظرہ میں اہم متن ہے کسی طالب علم کو درس دے رہے تھے، دیوان صاحب کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا کہ

متن خوب است اگر کسے شرح ایں نویسد بہتر است۔(۳)

یہ ایک بہترین متن ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھ دیتا تو اچھا ہوتا۔

دیوان صاحب استاذ الملک کے اشارہ کو سمجھ گئے اور ایک ہفتہ کے بعد جب پھر حاضر خدمت ہوئے تو رشیدیہ شرح شریفیہ تالیف فرما کر استاذ عالی مقام کی خدمت میں پیش کردی استاذ الملک نے بیحد پسند فرمایا اور بہت تحسین فرمائی، رشیدیہ جیسی اہم تصنیف اور ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں دیوان صاحب کی خداداد ذہانت وقابلیت ہی کا کرشمہ ہے

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۴۔ (۲) ایضاص ۱۴۔ (۳) ایضاص ۱۴۔

ورنہ ایک ہفتہ میں اس کے مضامین کو حل اور اخذ کرنا بھی غیر معمولی بات ہے، چہ جائیکہ تصنیف کرنا، حاشیہ چلپی کی قرأت کے زمانہ میں دیوان صاحب کا یہ اعلان عام تھا کہ چلپی کے اقوال کو میں رد کرسکتا ہوں جس کا جی چاہے پیش کر کے دیکھ لے، چنانچہ کبھی کبھی ملامحمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ یا کوئی دوسرا رفیق درس چلپی کے قول کو پیش کرتا تو دیوان صاحب اس کی ایسی مدلل تردید فرماتے کہ استاذ الملک بھی داد تحسین دیئے بغیر نہ رہتے۔(۱)

زمانہ طالب علمی ہی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ملاموہن الہ آبادی جوایک متبحر عالم اور جید مناظر تھے۔ استاذ الملک کی ملاقات کی غرض سے تشریف لائے، استاذ الملک اس وقت دیوان صاحب کو درس دے رہے تھے، ملاموہن کی خاطر سے درس موقوف کر دینا چاہا، ملاموہن نے کہا کہ سبق جاری رکھا جائے تا کہ ان کی استعداد کا پتہ چلے، چنانچہ درس جاری رہا، دیوان صاحب قرأت کررہے تھے، ملاموہن نے ایک اعتراض کیا، دیوان صاحب نے جواب دیا اور مباحثہ شروع ہوگیا۔ قریب تھا کہ ملا موہن لاجواب ہوکر خاموش ہوجاتے، یہ صورت دیکھ کر استاذ الملک نے تیز نگاہوں سے دیوان صاحب کی جانب دیکھا، آپ استاذ کا منشا سمجھ کر خاموش ہوگئے۔(۲)

یوں تو دیوان صاحب جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن فقہ، اصول اور تصوف میں خاص امتیاز حاصل تھا،(۳) اسلئے استاذ الملک مقدمات اصول وفقہ دیوان صاحب سے پوچھتے تھے اور مبادیات حکمت وفلسفہ ملامحمود جونپوری سے۔(۴)

۱- دیوان صاحب کے تذکرہ کے مآخذ ومراجع: گنج رشیدی قلمی میں دیوان صاحب اوران کے خاندان کے بیشتر اصحاب کا تذکرہ ہے یہ کتاب دیوان صاحب کا بسیط ملفوظ ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص اور خلیفۂ اجل شیخ محمد نصرت جمال عرف شاہ ملتانی نے جمع کیا ہے، اِس میں ۱۰۷۲ھ سے ۱۰۸۳ھ تک کے ملفوظات درج ہیں، یہ دیوان صاحب کے حالات کا سب سے قدیم اور مستند ماخذ ہے۔

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۳۔ (۲) ایضاً ۱۴۔ (۳) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷۔

(۴) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷، گنج ارشدی ورق ۱۱۴۔

۲- گنج ارشدی قلمی: یہ شیخ محمد راشد بن شیخ محمد رشید دیوان کا ملفوظ ہے، جس کو شیخ ارشد کے خلیفہ شیخ شکر اللہ نے جمع اور شیخ غلام محمد رشید بن شیخ محبّ الدین بن شیخ ارشد نے مرتب کیا ہے، یہ کتاب اپنے حسن ترتیب و تفصیل کے اعتبار سے خاندان رشیدیہ کے حالات میں سب سے مفصل اور جامعیت وافادیت کے لحاظ سے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳- مناقب العارفین مولفہ شیخ محمد یٰسین جانشین شیخ محمد طیب بنارسی، بزرگانِ چشتیہ کے ذیل میں مؤلف نے دیوان صاحب کا مفصل و مکمل تذکرہ لکھا ہے۔ اس کتاب پر خود دیوان صاحب کا لکھا ہوا حاشیہ بھی ہے، چونکہ یہ کتاب آپ کی حیات ہی میں مرتب ہوئی ہے، اس لئے یہ بھی قابل اعتماد ہے، یہ تینوں مذکور الصدر کتابیں خانقاہ رشیدیہ جونپور میں موجود ہیں۔

۴- بحرِ ذخار کے نہر دوم کے شعبۂ دوم میں بزرگان رشیدیہ کا مکمل تذکرہ ہے، یہ اولیاے کرام کے حالات میں بڑی مشہور کتاب ہے، مگر اپنی ضخامت وطوالت کی وجہ سے آج تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی، اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا فصیح الدین جونپوری استاذ مسلم انٹر کالج جونپور کے پاس موجود ہے۔ اور ایک نسخہ دائرۂ محمدی الہ آباد میں ہے جو اچھی حالت میں ہے، راقم السطور نے اس سے استفادہ کیا ہے، نیز دیگر نسخے بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۵- تجلی نور: مؤلفہ ابوالبشارت نورالدین زیدی ظفرآبادی ص ۷۲ و ۷۱ میں دیوان صاحب کا تذکرہ ہے۔

۶- نزہۃ الخواطر جلد پنجم ص ۳۶۷، میں بھی دیوان صاحب کا مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ (۷) سمات الاخیار، (۸) سبحۃ المرجان، (۹) تذکرہ علمائے ہند، (۱۰) حدائق حنفیہ، (۱۱) تحفۃ الابرار، (۱۲) تاریخ شیراز ہند وغیرہ میں بھی دیوان کا ذکر ہے، مگر ان میں کوئی نئی اور مزید باتیں نہیں ہیں۔ سب نے مذکورہ بالا چار کتابوں کی باتوں کو دہرایا ہے، البتہ سمات الاخیار میں دیوان صاحب کی اولاد اور تین خلفاء کا مفصل ذکر ہے، اس مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں ان سب کتابوں سے مدد لی گئی ہے، مگر اصل

ماخذ کی حیثیت گنج ارشدی و گنج رشیدی ہی رکھتی ہیں۔

دیوان صاحب کے بارے میں اہل باطن کی پیشین گوئیاں

جس دن استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری کی وفات ہوئی، اسی دن لاہور میں ملا خواجہ نے جو سلسلۂ قادریہ کے مشائخ میں ہیں، فرمایا کہ

امروز قطبِ جونپور وفات یافتہ وبعدے چند شیخ محمد رشید نامی خواہد گشت (۱)

(آج قطب جونپور کی وفات ہوگئی اور چند دن کے بعد اس مقام پر محمد رشید نامی فائز ہوں گے)

۲۔ شیخ عبدالعزیز جونپوری دہلوی خلیفہ قاضی خاں ظفر آبادی نے اپنی آخری عمر میں فرمایا کہ

بعد ما مردے فقیر پیدا خواہد کہ نام وے محمد رشید خواہد بود۔ (گنج ارشدی ورق ۱۲۳)

(میرے بعد ایک مردِ فقیر پیدا ہوگا جس کا نام محمد رشید ہوگا)۔

شیخ عبدالعزیز بڑے با کمال وصاحب حال وقال بزرگ تھے، ۹۷۵ھ میں آیت پاک سبحان الذی بیده ملکوت کل شیء والیه ترجعون کے سماع پر واصل بحق ہوگئے، دیوان صاحب کے ایام طفولیت میں ایک تقریب کے سلسلہ میں شیخ عبدالجلیل لکھنوی برونہ تشریف لائے، حصول برکت کے لئے آپ کو شیخ کی خدمت میں حاضر کیا گیا، شیخ نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا:

عارف کامل عالم وعامل خواہد بود ونیشکر بسیار تناول نمود (ایضاً ورق ۱۳)

(عالم باعمل وعارف اجل ہونگے اور گنا کثرت سے استعمال کریں گے)۔

ان پیشینگوئیوں سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان صاحب کا مقام علم وولایت کس درجہ کا تھا۔

پیدائش اور نشو نما

آپ دس ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ موضع برونہ میں پیدا ہوئے، موضع برونہ شہر جونپور سے

(۱) گنج ارشدی ورق ۱۲۳۔

تقریباً چھ میل کی مسافت پر مشرق میں واقع ہے اور اس وقت حدود اعظم گڈھ میں ہے۔

دیوان صاحب نے چار بادشاہوں کا زمانہ پایا، جلال الدین اکبر ۱۰۰۰ھ کے عہد میں پیدا ہوئے، جب آپ کی عمر چودہویں سال کو پہنچی تو جہانگیر مسند آرائے سلطنت ہوا، آپ کے سینتیسویں سال میں شاہجہان تخت نشین ہوا اور جب آپ چھہتر (۷۶) سال کے ہوئے تو اورنگزیب عالمگیرؒ سریر آرائے حکومت ہوئے۔ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ جمال نے آپ کی طفولیت ہی کے زمانہ میں اپنے مرشد کے ایماء پر پورنیہ (صوبہ بہار) میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے آپ کی نشونما اپنے حقیقی ماموں شیخ شمس الدین ابن نور الدین برنوی کے زیر نگرانی ہوئی۔

شیخ شمس الدین بڑے عابد و زاہد اور خوش اوقات بزرگ تھے اور ساتھ ہی زیور علم سے بھی آراستہ تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں گنے جاتے تھے اوائل عمر میں ملازمت شاہی سے منسلک تھے، آخر میں ترک فرما کر عزلت گزیں ہو گئے تھے۔ ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی آپ کا مزار محلہ مفتی شہر جونپور میں ہے رکن الدین بحریابادی آپ کے شاگرد رشید تھے۔(۱)

نام ونسب اور آبائی وطن: محمد رشید نام، شمس الحق، فیاض اور دیوان لقب ہے، ابوالبرکات کنیت ہے، شمسی تخلص، آپ کی بعض تحریروں سے اسم گرامی عبدالرشید بھی ظاہر ہوتا ہے مگر محمد رشید ہی آپ کو پسند و محبوب تھا آپ کے کمالات ظاہری و باطنی کو دیکھ کر مشائخ واہل اللہ قطب الاقطاب کہا کرتے تھے۔

سلسلۂ نسب باختلاف روایت اٹھارہویں یا بیسویں پشت میں شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی سے مل جاتا ہے(۲) آپ کی بارہویں پشت میں ایک بزرگ شیخ بخشی نامی ہیں انہی کے اجداد میں سے کسی نے عرب سے ہجرت کر کے کلدہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، کلدہ ملک روم کا ایک مشہور مقام ہے اسی نسبت سے شیخ بخشی کو شیخ رومی کہا جاتا ہے، شیخ بخشی

(۱) سمات الاخیار۔

(۲) گنج ارشدی ص ۱۲، گنج رشیدی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سری تک کل اٹھارہ پشتیں ہیں، لیکن گنج ارشدی اور دوسرے تذکروں سے دو نام اور درمیان میں پائے جاتے ہیں۔

نے مرشد کامل کی تلاش میں ہندوستان کی طرف رخت سفر باندھا، اس وقت دلی میں سلطان المشائخ شیخ نظام الدین دہلوی کے فیوض وبرکات کا دریا بہ رہا تھا اس لئے شیخ رومی دہلی پہنچ کر سلطان المشائخ کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور مدت دراز تک شیخ کی صحبت میں رہ کر کسب فیض کرتے رہے، اس سے فراغت کے بعد شیخ کے اشارے سے موضع سکلائی پرگنہ امیٹھی ضلع بارہ بنکی میں خلق خدا کی اصلاح وتربیت کی غرض سے مستقل سکونت اختیار کرلی، شیخ رومی کو سلطان المشائخ کے علاوہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی، شیخ رومی نے سکلائی ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ شیخ رومی کے بعد ان کی اولاد سکلائی میں مقیم رہی اور آج تک آپ کی نسل وہاں پائی جاتی ہے۔(۱)

دیوان صاحب کے والد بزرگوار شیخ مصطفیٰ جمال بھی موضع سکلائی ہی میں متولد ہوئے، اور وہیں نشو نما پائی، بڑے ہونے کے بعد انھیں طلب علم کا شوق پیدا ہوا اور وہ حصول علم کے لئے سکلائی سے جونپور آئے اور اپنی زادیوم کو خیر باد کہہ کر جونپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہاں کے اساتذہ ومشائخ سے علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل فرمائی، شیخ نورالدین بن عبدالقادر برونوی کی صاحبزادی سے نکاح کیا جو آیندہ کے لئے سکلائی کے بجائے برونہ ضلع جونپور کی وطنیت کا سبب (۲) بنا، یہیں آپ کے تینوں صاحبزادے شیخ محمد سعید، شیخ محمد رشید (صاحب الترجمہ) اور شیخ محمد ولید پیدا ہوئے، شیخ مصطفیٰ جمال کا ابتدائی ایام ہی سے تدین وتقویٰ اور اصلاح باطن کی طرف میلان تھا، چنانچہ سکلائی کے قیام کے زمانہ ہی میں شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی، امیٹھوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے تھے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی صحبت میں جاکر اکتساب فیض کرتے رہتے تھے۔

جونپور آنے کے بعد شیخ قیام الدین بن قطب الدین جونپوری کی جانب رجوع کیا اور انھیں سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی، شیخ مصطفیٰ میں کمال درجہ کا زہد وتقویٰ، توکل

(۱) سمات الاخیار، ص۱۰۔

(۲) نزھۃ الخواطر کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مصطفیٰ جونپوری کی سکونت کے زمانہ میں سکلائی بھی جاتے رہتے تھے لیکن گنج رشیدی وارشدی اس تفصیل سے خاموش ہیں۔

وورع تھا، مشتبہ چیزوں سے انتہائی پرہیز کرتے تھے، اپنے شیخ کے ایماء پر اہل وعیال کو برونہ چھوڑ کر پنڈوہ ضلع پورنیہ میں اقامت فرمالی تھی اور وہیں ١٠ ذی الحجہ ١٠٧٦ھ میں وفات پائی اور پورنیہ محلّہ چمنی بازار میں مدفون ہوئے۔

دیوان صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن و ماویٰ　　　شمسی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگ است

درس وتدریس

دیوان صاحب کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے، جہاں کوئی صاحب کمال ملا، اس کے سامنے زانوے ادب تہ کردیا اور اس کے فیوض علمیہ سے استفادہ کیا، ذیل میں ان اساتذہ کی اجمالی فہرست پیش کی جارہی ہے جن سے دیوان صاحب نے بلاواسطہ استفادہ کیا ہے جس سے اقلیم علم وفن کے تاجدار اور آسمان علم کے آفتاب عالمتاب کے علمی شغف کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔

(١) الشیخ محمد اخوند البرونوی (٢) الشیخ کبیر نور البرونوی (٣) الشیخ محی الدین السدھوروی (٤) الشیخ مخدوم عالم السدھوروی (٥) الشیخ محمد قاسم (٦) الشیخ مبارک مرتضی (٧) الشیخ نور محمد المداری (٨) الشیخ محمد محی الدین بن عبدالشکور (٩) الشیخ عبدالغفور بن عبدالشکور (١٠) الشیخ حبیب اسحاق (١١) الشیخ محمد لاہوری (١٢) الشیخ میر سید عبدالعزیز (١٣) الشیخ میر سیّد عبداللہ برادر عبدالعزیز (١٤) الشیخ المفتی شمس الدین البرونوی (١٥) استاذ الملک الشیخ محمد افضل بن حمزہ الجونپوری العثمانی (١٦) الشیخ المحدث الشاہ نور الحق بن الشاہ عبدالحق المحدث الدہلوی۔(١)

جس لائق، ذکی، فطین شاگرد کی علمی تربیت مذکورۂ بالا باکمال اور اپنے عہد کے ماہر فنون اساتذہ کے دامن میں ہوئی ہو اس سے اسکے کمالات علم وفضل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ان اساتذۂ عظام میں دیوان صاحب کے علمی جوہر کے نکھارنے میں سب سے

(١) نزہۃ الخواطر ج ٥ وسمات الاخیار ص ١٥، وگنج ارشدی۔

زیادہ ہاتھ آپ کے حقیقی ماموں علامۂ عصر مفتی شیخ شمس الدین برونوی اور فرید دہر استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری کا ہے، دیوان صاحب نے ان دونوں سے علمی استفادہ زیادہ کیا ہے، اور اکثر کتابیں ان ہی سے پڑھی ہیں۔

علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل کے بعد بھی شوق طلب کو سیری نہ ہوئی اور عہد شباب گذر جانے کے بعد پیرانہ سالی یعنی ساٹھ سال کی عمر میں کمر ہمت باندھی اور قدوۃ المحدثین شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند وشاگرد شیخ نورالحق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوٰۃ اور بخاری کو شیخ سے پڑھ کر اجازت حاصل کی، شیخ نورالحق نے فراغت کے بعد جو سند اجازت عطا کی ہے اس کے لفظ لفظ سے دیوان صاحب کی علمی جلالت نمایاں ہوتی ہے، قارئین کی دلچسپی کیلئے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

نقل سند اجازت: ان الشیخ الاجل الاوحد الافضل جامع الکمالات الالوھیة المتوجه الی اللّٰہ خلیفة قدوة المتورعین الشیخ طبیب بن معین طلب منی الاجازه بسنن اھل الحدیث وحفظا لسند السلسلة الشریفة مع انی لست باھلھا وکان الاعتذار احری والیق من الاجازة ولکن لما کان امتثال امره واجبًا علی وکان اجری ھذا الطریق مما اوصٰی به الشیوخ اجیبت مسئوله واجزت، رفعه اللّٰہ .

اسکے نیچے یہ عبارت دیوان صاحب نے اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے۔

وانا العبد الاحقر المفتقر الی اللّٰہ الوحید المدعو بین الناس محمد رشید بن مصطفٰی الجونپوری موطنا والعثمانی نسبا والچشتی ارادة والقادری والقلندری والشطاری مشربا المرجو من الشیخ الاوحد ان لاینسانی من صالح دعائه لعل اللّٰہ یرزقنی صلاحا وکان ذلك فی ذی قعده سنة ستین والف من الھجرة النبویة. (۱)

دیوان صاحب کی اس تحریر سے صاحب سمات الاخیار کے اس قول کی پوری تردید

(۱) گنج ارشدی ۱۳۴۔

ہو جاتی ہے کہ دیوان صاحب جب دہلی پہنچے تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی ضعف پیری کی وجہ سے درس دینا بند کر چکے تھے لیکن دیوان صاحب کی درخواست پر یہ منظور فرمالیا تھا کہ درس تو نورالحق دیں گے لیکن میں بھی درس میں موجود رہا کروں گا، کیونکہ دیوان صاحب نے ۱۰۶۰ھ میں اجازت حاصل کی ہے اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات خود صاحب سمات الاخیار کی تصریح کے مطابق ۱۰۵۱ھ میں ہوگئی، پھر محدث دہلوی کا درس میں حاضر رہنا چہ معنی دارد۔

دیوان صاحب بحیثیت استاذ

تحصیل و تکمیل کے بعد دیوان صاحب مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے اور تشنگانِ علوم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کرنا شروع کر دیا، بیشمار بندگان خدا آپ کے علمی فیوض سے مستفید ہوئے۔ طلبہ کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ جس پتھر پر طلبہ جوتیاں اتارتے تھے اس کو میری قبر میں تختہ کے طور پر رکھ دیا جائے۔ (۱)

آپ کے درس و تدریس کو علماء و مشائخ بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس شغل کو باقی رکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے، شیخ طیب بنارسی اپنے ایک مکتوب میں آپ کو خطاب فرماتے ہیں کہ،

> ہموارہ بدرس و تدریس بودہ بر رضائے رحمت چشم دارند کہ حق تعالیٰ را در روز
> شبی ہزار نعمت است کہ بر خلق نازل می شود تسع مایۃ و تسع تسعون للعلماء
> والمتعلمین و واحدۃ لجمیع الخلق ذلک فضل اللہ یوتیہ مین یشاء انتہی (۲)

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں۔

> بندہ می خواہد کی از برائے شما فرمان بوساطت نواب از بادشاہ طلب نماید کہ

(۱) گنج ارشدی ج ا ص ۱۳۴، وسمات الاخیار ص ۳۵۔ (۲) گنج ارشدی ج ا ص ۱۳۸۔

شمادریں بنارس استقامت نمود درس وتدریس فرمائید کہ دریں کان کفر رواج اسلام نمود۔(۱)

دیوان صاحب طلبہ یا مریدین سے خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے اور ارادت مندوں کی خواہش کے باوجود اس کا موقع نہ دیتے تھے، ایک مرتبہ آپ کے تلمیذ خاص اور مرید جان نثار میاں شیخ اسماعیل برونوی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا دیوان جیو تو کسی قسم کی خدمت کا موقع ہی نہیں دیتے کہ ہمارے لئے ذریعہ سعادت ہو، حضرت دیوان صاحب نے فرمایا کہ میرے استاذ شیخ محمد افضل بھی خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے، اپنا سارا کام خود ہی انجام دیا کرتے تھے، اسی لئے مجھے بھی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات خود ہی پوری کرلیا کروں، پھر فرمایا:

تا کار بدست خود تواں میکرد دیگرے گفتن خوب نیست درصحبت یار شاطر باید نہ بارخاطر۔(۲)

(جب تک اپنے ہاتھ سے کام ہوتا رہے دوسروں سے لینا بہتر نہیں، دوستوں کی صحبت میں چاق وچوبند رہنا چاہئے نہ کہ بوجھ بنا رہے)۔

دیوان صاحب کو طلبہ کا تعلیمی نقصان گوارا نہیں تھا ان کو مطالعہ اور ہمہ وقت درس کیلئے مستعد رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے اور اپنے آپ کو بھی اس کے لئے فارغ رکھتے تھے، لیکن آخری وقت میں جب عبادت اور ریاضت اور سیر الی اللہ میں انہماک بڑھ گیا اور اکثر جذب اور استغراق کی کیفیت طاری رہنے لگی اور درس میں ناغہ ہونے لگا تو تلامذہ کو اپنے تلمیذ رشید وخلیفہ اجل شیخ نورالدین مداری کے حوالہ کردیا، اور اس وقت سے تدریس کا کام موقوف ہوگیا۔(۳)

دیوان صاحب کے اکثر شاگرد علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی دیوان صاحب ہی سے استفادہ کرتے تھے، اور ان میں اکثر خلعتِ خلافت سے بھی مشرف ہوئے۔

(۱) ایضاص ۱۲۸۔ (۲) گنج ارشدی، ۱۲۸، ج۱۔ (۳) گنج ارشدی ونزہۃ الخواطر ومقصود الطالبین۔

عرفان وسلوک

دیوان صاحب جس طرح علوم ظاہری میں شہرۂ آفاق تھے، اسی طرح علوم باطنی میں بھی طاق تھے، نو برس کی عمر میں جو کھیلنے کھانے کا زمانہ ہوتا ہے، کسی مرشد سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرنا تو درکنار اس کا تصور آنا بھی غیر معمولی بات ہے۔

دیوان صاحب اسی زمانہ میں اپنے والد شیخ مصطفیٰ جمال سے بیعت ہوگئے تھے، اور خرقۂ خلافت سے بھی مشرف ہوئے، صاحب مناقب العارفین رقمطراز ہیں:

''درمدتِ طفلی کلاہِ ارادت بلک خرقۂ اجازت وخلافت از دست والد شریف خود کہ مرشد دہر وشیخ عصر بودند، پوشند، واثر آن لباس در وکار ہا کرد۔'' انتہی (۱)

لیکن کم سنی اور تعلیم وتحصیل کی مشغولیت سے طریقۂ صوفیہ کے اخذ وکسب کی جانب پوری توجہ نہ ہوسکی تھی، تکمیل علوم وفنون کے بعد شیخ کامل ومرشد صادق کی تلاش وجستجو ہوئی، اتفاقاً اسی زمانہ میں شیخ طیب بنارسی جونپور تشریف لائے ہوئے تھے، خبر پاتے ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر اس ملاقات میں قلب شیخ کی جانب مائل نہ ہوا، کچھ دنوں کے بعد ایک تقریب کے سلسلے میں شیخ طیب کی قیام گاہ منڈواڈیہہ ضلع بنارس جانا ہوا، اور چند دن کی صحبت بھی اٹھائی، اس صحبت نے اپنا اثر دکھایا، اور قلب میں شیخ طیب کی عقیدت ومحبت کا طوفان موجزن ہوگیا، چنانچہ سارے علائق دنیوی حتی کہ درس وتدریس کے مشغلے کو ترک کرکے مستقل قیام کے ارادہ سے شیخ طیب کی خدمت میں حاضر ہوگئے، مگر شیخ نے تدریس کے التوا کو پسند نہیں فرمایا، اور یہ کہہ کر جونپور واپس کردیا کہ

''بجاے وظیفہ صبح درس طلبہ داند، ایں ہم عبادت است'' (۲)

منڈواڈیہہ سے واپسی کے بعد حسب ارشاد مرشد پھر درس وتدریس میں مشغول ہوگئے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے، دو ایک دن کے بعد واپس آجاتے، رمضان میں چونکہ درس موقوف ہوجاتا تھا اس لئے پورا رمضان شیخ کی خدمت

(۱) مناقب العارفین ص ۱۲۵۔ (۲) گنج ارشد یص ۱۲۷، ج: اوّل ایضاً ج او: ص ۱۲۷۔

میں گذارنے کا ارادہ کیا شیخ نے اخیر عشرے کے اعتکاف کا حکم دیا، آپ نے اعتکاف کیا، عید کے دن ۱۰۴۰ھ میں شیخ طیب نے مجمع عام میں سلسلہ چشتیہ کے خرقۂ خلافت سے نوازا اور اس سلسلے کے اوراد واذکار کی تلقین فرما کر جونپور رخصت کیا۔

حصول اجازت کے بعد دیوان صاحب نے مجاہدہ اور ریاضت میں اور اضافہ کر دیا اور چند ہی دنوں میں اتنی صلاحیت بہم فرمائی کہ طیب شاہ نے سلاسل قادریہ اور سہروردیہ کی اجازت وخلافت بھی عطا فرما کر اپنا خلیفۂ مطلق بنا دیا۔(۱)

اس کے بعد دیوان صاحب نے سلسلۂ سہروردیہ میں شیخ تاج الدین سے بھی اجازت وخلافت حاصل کی۔ شیخ یٰسین جانشین طیب شاہ بنارسی لکھتے ہیں۔

> قطب الاقطاب در سلسلۂ سہروردیہ بلا واسطہ از قطب المتورعین حضرت شیخ تاج الحق والشرع والدین جھوسی مجاز است۔(۲)

سلسلۂ قادریہ میں طیب شاہ کے علاوہ شیخ شمس الدین کالپی سے خلافت حاصل ہوئی، حصول خلافت کے واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس واقعہ سے دیوان صاحب کی عظمت وجلالت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے، شیخ شمس الدین بھی ایک مرتبہ جونپور آئے تو دیوان صاحب کی خانقاہ میں تشریف لائے، دیوان صاحب اس وقت درس میں مصروف تھے، جب درس سے فارغ ہوئے تو شیخ شمس الدین نے اپنے پاس بلا کر فرمایا۔

> خدائے تعالیٰ حوالہ نمودن نعمت مرا در پیش شما فرستادہ خدا مفت دادہ است بگیرید آنچہ داشتہ انتہی (۳)

ان سلاسل میں حصول خلافت پر ہی آپ نے قناعت نہیں کی بلکہ اشغال قلندریہ میں استفادہ کی غرض سے شیخ عبدالقدوس جونپوری نبیرۂ شیخ قطب بنیائے دل کی خدمت میں حاضری دینے لگے مگر پورے ایک سال تک نہ شیخ نے آنے کی غرض دریافت کی اور نہ آپ نے از خود بتانا مناسب سمجھا، ایک سال گذرنے کے بعد ایک دن شیخ عبدالقدوس

(۱) گنج ارشدی ۱۲۷۔ (۲) مناقب العارفین۔

(۳) گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۲۹۔

نے خود ہی فرمایا کہ نصف شب گذر جانے کے بعد آیا کرو۔

اس زمانہ میں نصف شب کے بعد پُل کا دروازہ بند ہوجاتا تھا اور شیخ کی خانقاہ دریا کے اس پار تھی مگر اس سے آپ کے پائے طلب میں لغزش تک نہ آتی اور آپ ہر روز آدھی رات کے بعد تیر کر دریا کے پار جاتے اور شیخ سے کسب فیض کرتے، آخر میں شیخ نے سلسلۂ قلندریہ کے ساتھ ساتھ سلسلۂ مداریہ قدوسیہ اور شطاریہ کی خلافت بھی عطا فرمائی، شیخ عبدالقدوس کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب شیخ عبدالقدوس کے پاس کوئی طالب آتا تو فرماتے کہ میں اب ضعیف ہوگیا ہوں میاں محمد رشید بہت اچھا ذکر کرتے ہیں ان کے پاس جاؤ۔(۱)

ان سلاسل میں تکمیل کے بعد بھی ذوق طلب نے چین نہیں لینے دیا اور خواہش پیدا ہوئی کہ سلسلہ قادریہ چشتیہ میں شیخ حسام الحق مانکپوری کے خاندان سے نسبت حاصل کرلینا چاہئے، چنانچہ شاہ راجی سید احمد مانکپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ راجی نے بکمال شفقت ومحبت چند دن اپنے پاس رکھ کر خلعتِ خلافت سے مشرف فرمایا۔(۲)

ان مشائخ کے علاوہ اس دور کے دوسرے مشائخ سے بھی آپ کو اجازت حاصل ہوئی بخوف طوالت ان کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔

اب آخر میں مؤلف مناقب العارفین کی رائے جو دیوان صاحب کے متعلق ظاہر کی ہے نقل کی جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

(بحذف القاب) بندگی میاں شیخ عبدالرشید ابد اللہ تعالیٰ ظلال عاطفتہ علی روس المعتقدین والمریدین کہ فرید عصراست دوحید وہر در شریعت استادہ است دور طریقت صاحب الرشاد مخزنِ حقائق است ومنبع دقائق، طالب مجاہدہ است وصاحب مشاہدہ، قطب ولایت است ویگانۂ زماں، غوث وقت است وقبلۂ جہاں، باوجود ایں ہمہ کمالات اعتقاد بجماعت فقراء وصوفیہ آنقدر دارد کہ ہر کجا نام فقیرے می شنود بلا توقف پیش وے می رود قصد ملاقات وے می کند وشدتِ مجاہدہ کہ وے دارد خارج طوق بشر است نفس امارہ را

(۱) سمات الاخیار ص۴۰ (۲) گنج ارشدی ۱۲۴ ونزہۃ الخواطر، ج۵۔

تابع و مطمئن ساختہ وے سلمہ اللہ قبل از اختیار ایں طریقہ مدتے در تحصیل علم می گذارند و بعد از تحصیل کتب متداولہ در درس می مادند۔ انتہی بلفظہ

یہ تحریر دیوان صاحب کی زندگی کا صحیح و کامل مرقع ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان صاحب کا مقام خود ان کے معاصرین و متعلقین کی نگاہ میں کیا تھا۔

شعر و سخن

دیوان محمد رشید کو شعر و سخن میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، جس پر انکا دیوان شاہد ہے۔

انکے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

گرد شو گرد تا گرد نہ گردی در راہ　　　کے بدانی کہ دراں راہ سوارے باشد

اپنے والد ماجد کے جائے مدفن کے متعلق کتنا عمدہ شعر کہا ہے:

چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن و ماویٰ　　　شمسی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگ است

غزل کا نمونہ

ہر نگاہ او دعاے دیگر است　　　پیچشِ زلفش بلائے دیگر است

من بیکدم سیرِ عالم می کنم　　　روح را دستے و پائے دیگر است

بر بدن صد زخمِ خنجر گر زنی　　　کے بمیرم جاں بجاے دیگر است

از دل شمسی دمے تمکین مجوے　　　ہر دمش چوں ہوو ہاے دیگر است (۱)

تصنیف و تالیف

دیوان صاحب درس و تدریس کے علاوہ تالیف و تصنیف میں بھی اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔

سرعت تالیف میں آپ کے ہمعصروں میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، آپ نے بعض

(۱) دیوان شمسی قلمی۔

ایسی اہم کتابیں لکھیں جو گیارہویں صدی کی علمی یادگار بن گئیں۔ان کے ہر تذکرہ نگار نے اُن کے دوسرے کمالات کے ساتھ تصنیفی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے اور اکثر کتابوں کا تعارف کرایا ہے مگر افسوس کہ ان کتابوں میں دو کے سوا اب تک کوئی کتاب بھی طبع نہ ہو سکی اور نہ آیندہ اس کی امید ہے۔

تلاش وجستجو سے دیوان صاحب کی مندرجۂ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) رشیدیہ عربی: اس کے متعلق صاحب نزھۃ الخواطر رقمطراز ہیں:

ومن مصنفاته الرشيدية فى فن المناظرة وهى اشهر مصنفاته تلقاها العلماء بالقبول تعليقا و تدريساً (۱)

(آپ کی تصانیف میں رشیدیہ بہت مشہور ہے، علماء نے اس کی جانب خاص توجہ کی ہے اوراس پر حواشی وشروح لکھے ہیں اور درس میں داخل کرلیا ہے)۔

رشیدیہ دیوان صاحب کی حیات ہی میں بہت مشہور ہوگئی تھی اور اسی زمانہ میں ملامحمود کے ایک شاگرد ملاعبدالباقی جونپوری نے اس پر کچھ اعتراضات کئے تھے، اس کے جواب میں دیوان صاحب کے ایک شاگرد نے ردالباقیہ نامی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ملاعبدالباقی کے اعتراضات کے جواب کے ساتھ رشیدیہ کے مغلقات کو بھی خوبی سے حل کیا ہے، یہ رشیدیہ کی بہترین شرح ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

حافظ امان اللہ بنارسی المتوفی ۱۱۲۳ھ نے بھی رشیدیہ کی ایک مختصر شرح لکھی ہے، اس کے علاوہ اور علماء نے بھی شروح وحواشی سے اس کی اہمیت وافادیت کو دوبالا کردیا ہے، اس کتاب کو دیوان صاحب نے ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں تصنیف کیا تھا جس کا واقعہ اوپر گذرچکا ہے۔

۲-تذکرۃ النحو: یہ مبادیات نحو میں مختصر سا رسالہ ہے، اسے دیوان صاحب نے اپنے منجھلے صاحبزادے شیخ ارشد کے لئے لکھا تھا۔ یہ رسالہ آج کل خلاصہ کے نام سے نحو میر کے

(۱) نزھۃ الخواطر ج۵۔

آخر میں شائع ہوتا ہے، تقریباً دو صفحہ میں دیوان صاحب نے نحو کے جملہ عوامل کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کر دیا ہے۔

۳- ترجمہ معینیہ: یہ تذکرۃ النحو کی چار ورقی شرح ہے جو اپنے صاحبزادے معین الدین کے لئے لکھی تھی، یہ شرح عصر و عشا کے درمیانی قلیل وقفہ میں تحریر کی تھی۔

۴- ہدایۃ النحو: یہ بھی فن نحو میں ہے جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ خانقاہ رشیدیہ میں نہیں ہے۔

۵- شرح ہدایہ الحکمۃ (عربی)

۶- شرح اسرار المخلوقات (عربی): صاحب تجلی نور اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔ شرحی بعربی بغایت مستحسن وخوب، عربی میں نہایت عمدہ اور بہتر شرح ہے۔

۷- زاد السالکین: فن تصوف میں مختصر سا مگر جامع رسالہ ہے جس میں تصوف کے مسائل کو سلیس فارسی زبان میں قریب الفہم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

۸- مقصود الطالبین: اوراد و اذکار میں مختصر سا رسالہ ہے۔

۹- حاشیہ شرح مختصر عضدی (عربی)۔

۱۰- حاشیہ کافیہ ابن حاجب۔

۱۱- دیوان شمسی۔

۱۲- مکتوبات (۱)

ان کتابوں میں صرف رشیدیہ، تذکرۃ النحو، مکتوبات طبع ہو چکی ہیں، بقیہ کتب میں چند تو خانقاہ میں اب تک موجود ہیں اور اکثر معدوم ہو چکی ہیں، صرف کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

وفات

آپ کو شعبان کی آخری تاریخوں سے بخار آنا شروع ہوا، علاج معالجہ کے باوجود

(۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹ و نزھۃ الخواطر ج ۵، تجلی نور ص ۲۷ و سمات الاخیار ص ۵۴۔

حالت دن بدن بگڑتی گئی، نقاہت وضعف میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن معمولات میں فرق نہیں آنے پایا، نماز باجماعت معمول کے مطابق ادا کرتے رہے، مگر رمضان کی آٹھویں تاریخ یوم پنجشنبہ کو کمزوری بے حد بڑھ گئی اور تیمّم کرکے پلنگ ہی پر نماز پڑھی رات کو حالت زیادہ خراب ہوگئی، لیکن نصف شب کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے تیمّم کیا اور تہجد میں مشغول ہوگئے، اس سے فراغت کے بعد معمول کے مطابق ذکر بالجہر میں مشغول ہوگئے، آواز اتنی بلند تھی کہ باہر والوں کو سنائی دیتی تھی ذکر پورا کرنے کے بعد فجر کیلئے تحریمہ باندھنا چاہا تو لوگوں نے بتایا کہ ابھی وقت نہیں ہوا ہے، فرمایا کہ میاں ہوگیا ہے اور لیٹ گئے، صبح صادق کے قریب اٹھے تیمّم کیا لیکن اس بار شدت ضعف سے تیمّم کرنے میں بھی دشواری پیش آئی مگر کسی طرح تیمّم کرکے فوراً لیٹ گئے، لوگ نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور آپ بھی تحریمہ باندھ کر نماز میں مصروف ہوگئے، دوسری رکعت کے سجدہ میں تھے کہ نویں رمضان ۱۰۸۳ھ یوم جمعہ کو روح مبارک قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر ۔۔۔ کیا دیوانے نے موت پائی ہے

آپ کے تلمیذ خاص وخلیفۂ اجل شیخ محمد ماہ دیوگامی اعظم گڈھی نے نماز جنازہ پڑھائی اور رشید آباد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گنجینۂ علم وفن اور مخزن رشد وہدایت کو سپرد خاک کردیا گیا۔(۱)

اخلاق وسیرت

مزاج میں حد درجہ قناعت واستغنا تھا، امراء وسلاطین کے دربار میں جانا قطعاً پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ نواب سعد اللہ خاں جب شاہجہاں کی وزارت سے مستعفی ہوئے تو شاہجہاں نے ان سے کہا کہ اپنا قائم مقام تجویز کرلو، انھوں نے دیوان صاحب کا نام نامی پیش کیا شاہجہاں نے ایک شخص حاجی محمد سعید نامی کے ذریعہ دو ہزار روپئے زاد راہ کے لئے

(۱) سمات الاخیار ص ٦۱ تجلی نور ص ۲۷ ج ۱، ونزہۃ الخواطر ج ۵ ص ٦۷ ۳، تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ تحریمہ کے وقت وفات ہوئی۔

اور ایک عریضہ دیوان صاحب کی خدمت میں ارسال کیا اور اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، دوسرا خط حاکم جونپور مرزا اکرم خاں کے نام روانہ کیا کہ جس طرح ہو سکے دیوان صاحب کو آمادہ کر کے میرے پاس دہلی بھیج دو لیکن زبردستی نہ کرنا، دیوان صاحب نے شاہجہاں کی پیشکش کو قبول نہیں کیا، بعد میں دو ہزار روپئے بطور نذرانہ پیش کئے مگر اسے بھی قبول نہیں فرمایا۔(۱)

سنت نبوی کو حتی الوسع ترک نہ فرماتے (۲)، جملہ امراض میں شہد اور کلونجی استعمال فرماتے اور شفایاب ہوتے، ایک مرتبہ بخار آیا ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ نے علاج کیا مگر صحت نہ ہوئی تو آپ نے کلونجی اور شہد منگا کر استعمال کیا اور بخار زائل ہو گیا، ملا محمود نے تعجب کے لہجے میں فرمایا ''کہ دوائے گرم در تپ صفراوی چگونہ مفید شد'' دیوان صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ''شمارا بر قول حکماء اعتماد است و مرا بر قول خدا و رسول'' (۳)

وضو، نماز اور مصلیٰ کی پاکی میں حد درجہ اہتمام تھا، جب تک دریا کا پانی ملتا کنویں کے پانی سے وضو اور غسل نہیں کرتے تھے۔(۴)

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

تاکسے بجمعیت خاطر با حتیاط وضو کند نماز او ہم بجمعیت میسر آید و چوں در وضو احتیاط نمی کند در نماز تفرقہ خاطر آید (۵)

مائے مستعمل اگر کپڑے میں لگ جاتا تو اسے دھوتے اور فرماتے کہ ہر چند موافق فتویٰ آب آن طاہر است اما تقویٰ شستن رامی خواہد۔(۶)

علمی کمالات کے ساتھ بڑے شجاع و دلیر تھے، تیر اندازی میں مہارت رکھتے تھے،

---

(۱) گنج ارشدی ج ا و: ۳۰۲ و نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۶ و سمات الاخیار ص: تذکرہ علمائے ہند ص: ۱۱۹۔

(۲) تجلی نور ص ۲۷ ج ا۔

(۳) سمات الاخیار، گنج ارشدی و: ۱۴۰۔

(۴) گنج ارشدی و ۱۳۷۔

(۵) گن ارشدی ۱۴۰۔

(۶) تجلی نور ج ا ص ۷۱ و گنج ارشدی ج ا و ۱۳۷۔

ایک مرتبہ سیر کو نکلے، آپ کے شاگرد شیخ عبدالشکور منیری بھی ہمراہ تھے، راستے میں نواب شاہ نواز خاں قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، آپ اس کے قریب پہنچے تو ایسے مقام پر بیٹھ گئے جو تیر کی آماجگاہ تھا اور شیخ عبدالشکور منیری سے فرمایا کتاب لاؤ، کچھ پڑھ پڑھالیا جائے اور درس شروع کردیا، اثنائے درس میں ایک تیر بالکل چہرے کے پاس سے گذر گیا مگر تقریر میں کسی طرح کا انتشار نہیں پیدا ہوا، نواب آپ کی اس جرأت وشجاعت پر متحیر ہوگیا۔(۱)

زہد وبے نیازی کا یہ عالم تھا کہ پختہ تعمیر پسند نہ تھی، اگر کسی کو مضبوط عمارت بناتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ یہ کیا بے خبری ہے کہ شئی فانی کو باقی رکھنے کی کوشش میں لگا ہے، خانقاہ کا چھپر بہت معمولی تھا، ایک دفعہ کثرت بارش کی وجہ سے اس قدر پانی ٹپکا کہ گدّی میں پانی بھر گیا، ایک صاحب نے کہا کہ عمدہ قسم کا چھپر بنادیا جائے تو آپ نے منع فرمادیا اور کہا

> چھپر برائے مانع آب نساختند برائے منع آفتاب است چرا کہ ایام بارش چہار ماہ است اول وآخر کم بارد ودرمیان ہم شب وروز باستیعاب بارش نمی شود، اگر کسے حساب نماید پانزدہ شانزدہ روز خواہد بود پس کار عاقل نیست کہ برائے ایں قدر ایام خانہ سازد وآفتاب تمام روز می باشد خانہ برائے آنست۔(۲)

پالکی کے مقابلہ میں گھوڑے کی سواری پسند تھی، اکثر پیدل چلتے تھے اور بہت تیز، چنانچہ نماز فجر کے بعد جونپور سے چلتے اور منڈواڈیہہ میں جو جونپور سے ۳۴ میل کے فاصلہ پر ہے ظہر کی نماز جماعت سے ادا کرتے۔(۳)

وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ کفن میں عمامہ نہ دیا جائے اور نہ ایصال ثواب کے لئے گوشت وغیرہ دعوت کی صورت میں پکایا جائے اور نہ تین دن سے زیادہ میرا سوگ منایا جائے، نہ قبر کو پختہ بنایا جائے۔(۴)

---

(۱) گنج ارشدی ج ا و:۱۵۔
(۲) گنج ارشدی ج ۱، ورق ۱۵۔
(۳) گنج ارشدی وسمات الاخیار۔
(۴) نزھۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷۔

اولاد

مبدأ فیاض نے دیوان صاحب کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ آپ کے نو بچے پیدا ہوئے جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے ایام رضاعت ہی میں فرط آخرت بن گئے۔(۱)

چار لڑکے زندہ رہے اور اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے، سب سے بڑے شیخ محمد حمید تھے اور سب سے چھوٹے شیخ غلام قطب الدین درمیان میں شیخ محمد ارشد و شیخ غلام معین الدین تھے، ان چاروں کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) شیخ محمد حمید: یہ ۱۰۳۷ھ میں پیدا ہوئے دیوان صاحب نے تاریخی نام ابوعضد محمد حمید تجویز فرمایا، اور اوائل عمر میں شاہی فوج میں داخل ہوئے اور فن سپہ گری کے جوہر دکھائے، لیکن آخر میں ملازمت ترک کر کے درس و تدریس و افادۂ خلق میں مشغول ہو گئے، چند کتب کے علاوہ جملہ کتابیں دیوان صاحب ہی سے پڑھی تھیں اور اجازت و خلافت بھی دیوان صاحب سے حاصل تھی (۲)، ان کی ذکاوت و فطانت اور مہارت علم پر خود دیوان صاحب کو پورا اعتماد تھا، ایک دفعہ ایک تقریب کے سلسلہ میں دیوان صاحب شیخ پورہ ضلع الہ آباد تشریف لے گئے، ساتھ میں شیخ محمد حمید بھی تھے، قاضی الہ آباد شیخ محمد آصف دیوان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ایک تصنیف (حاشیہ تفسیر بیضاوی) ملاحظہ کیلئے پیش کی، دیوان صاحب نے شیخ حمید کو دیدیا، قاضی کو یہ بات گراں گذری کہ خود نہیں دیکھا اور صاحبزادے کو دے دیا وہ کیا دیکھیں گے، اور شیخ محمد حمید کا امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ چند مقامات پر کچھ اشکال ہیں، اگر آپ رفع فرمادیں تو نوازش ہوگی اور چند سخت اشکالات پیش کردئے، شیخ محمد حمید نے سنتے ہی مدلل تشفی بخش جواب دیا، قاضی صاحب اس حاضر دماغی اور تبحر علمی پر حیرت زدہ ہوئے۔(۳)

---

(۱) گنج رشیدی۔

(۲) گنج ارشدی ج۱، وص ۱۵۔

(۳) گنج ارشدی ج۱، و۱۶۔

سرعت تحریر میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے ایک دفعہ ایک طالب علم نے درخواست کی کہ مجھے حسامی عنایت فرمادیں تو نوازش ہوگی، آپ نے اسی رات کو پوری حسامی لکھ کراس طالب علم کے حوالہ کردی۔(۱)

دیوان صاحب کے مرض الموت میں امامت آپ ہی کے سپرد تھی، دیوان صاحب کی وفات کے بعد شہر کے علماء ومشائخ نے دستار جانشینی آپ کے سر پر باندھ کرآپ کو دیوان صاحب کی جگہ پر بیٹھانا چاہا جس کے آپ مستحق بھی تھے لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور مجلس کے اختتام پر فرمایا:

عزیزان خواستند کہ درمیان برادران منازعت پیدا نمایند الحمد اللہ کہ نشد،(۲)

اپنے جد امجد شیخ محمد مصطفیٰ کے مزار کی زیارت کے لئے پورنیہ تشریف لے گئے، واپسی پر راستے میں بحالت مسافرت ۲۴؍رمضان ۱۰۸۶ھ کو بعمر ۴۹ سال رحلت کی، نعش جونپور لاکر رشید آباد میں دیوان صاحب کے جوار میں دفن کی گئی۔(۳)

(۲) شیخ محمد ارشد: ان کی ولادت ۱۰۴۱ھ میں ہوئی، دیوان صاحب نے ابی الکشف محمد ارشد سے تاریخ پیدائش نکالی اور بدرالحق لقب عنایت فرمایا، اکثر کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور چند استاذ الملک سے، بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی کمال حاصل کرلیا اور دیوان صاحب نے خرقۂ خلافت سے مشرف فرمایا(۴)، روزانہ کا معمول تھا کہ دوپہر تک درس وتدریس میں رہتے اور ظہر کی نماز اول وقت جماعت کے ساتھ ادا کرکے پھر افادۂ طلبہ میں منہمک ہوجاتے، اس مشغولیت کے باوجود وظائف اور اشراق وچاشت کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی تھی، ریاضت شاقہ کے برداشت کرنے میں بالکل دیوان صاحب کے مثیل تھے، سنت نبوی پر شدت کے ساتھ عمل

(۱) ایضاً ورق ۱۶۔
(۲) ایضاً ورق ۱۶۔
(۳) ایضاً ورق ۱۶۔
(۴) گنج ارشدی و ۱۰ج ۱۔
(۵) ایضاو ۱۰، گنج ارشدی و ۱ اوسمات الاخیار۔

تھا، بیماروں کی تیمارداری اور جنازوں میں پیدل شرکت کا خاص اہتمام تھا، توکل اتنا تھا کہ اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بھی خوشی کا اظہار فرماتے، دیوان صاحب کو آپ کے زہد وتقویٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ پورنیہ کے سفر میں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت دستور ہے کہ جب دوست دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ تحفہ پیش کرتا ہے آپ جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو کیا ہدیہ پیش کریں گے، دیوان صاحب یہ سن کرآبدیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ ارشد کو پیش کردوں گا۔

تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ خاندان رشیدیہ میں شیخ محمد ارشد کا مقام دیوان صاحب کے بعد سب سے بلند ہے، آپ کو ۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ھ کو بخار آنا شروع ہوا خاندانی طبیب کلمن مصراوید کا علاج ہوا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا، متعلقین نے دوسرے اطباء کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا، بخار بدستور قائم رہا اور ضعف ونقاہت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، دوران مرض ایک دن مفتی محمد جمیل صاحب عیادت کے لئے تشریف لائے اور حال دریافت کیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

دل بعشق آں پری پیکرنمی دانم چہ شد　　درد سر باقی بجاؤ سرنمی دانم چہ شد

ای کہ میگوی چرا آشفتہ خاطر گشتۂ　　دل بزلفش بستہ ام دیگرنمی دانم چہ شد

غرض مرض بڑھتا گیا نقل وحرکت کی طاقت سلب ہوگئی ۲۴ر جمادی الاخری کو عصر کی نماز شروع کی تو کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ارکان پورے طور سے ادا نہ ہوسکے، یہ حالت دیکھ کر آپ کے جانشین اور خلیفہ شیخ غلام محمد رشید بن محبّ الدین بن ارشد رونے لگے اور عرض کی کہ جس ولی کی نماز میں دنیا میں فرق آجائے وہ دنیا میں باقی نہیں رہتا، ایسا ہی ہوا۔ ۲۴ر جمادی الاخری ۱۱۱۳ھ کی شب میں کلمۂ لا الٰہ کا ورد کرتے ہوئے واصل بحق ہوگئے، پسماندگان میں تین صاحب زادے اور ایک صاحبزادی اور تقریباً ۳۰ خلفاء اور بے شمار تلامیذ وارادتمند چھوڑے۔(۱)

(۳) شیخ غلام معین الدین: ان کی پیدائش ۲۴ر شوال ۱۰٦۳ھ کو ہوئی ان کے اور شیخ

(۱) سمات الاخیار ص ۸۵۔

ارشد کے درمیان میں دیوان صاحب کے دولڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں مگر بچپنے ہی میں سب کے سب فوت ہوگئے۔

دیوان صاحب نے آپ کا تاریخی نام ابوالواعظ رکھا(۱)، دیوان صاحب کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت انہی سے تھی، ان کی اکثر معروضات کو دیوان صاحب کے دربار میں قبولیت حاصل تھی(۲)، انھوں نے ابتدائی کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور متوسطات کو شیخ ارشد سے، ۲۹/رمضان ۱۰۸۰ھ کو جمعہ کے دن دیوان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۱۰۸۳ھ کو ان کی وفات سے چند ماہ پہلے خلعت خلافت سے مشرف ہوئے۔(۳)

غلام معین الدین نے درس و تدریس کے بجائے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا لیکن اصلاح باطن وتزکیۂ نفس سے کبھی غافل نہیں ہوئے، تقویٰ، طہارت، عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، آپ فرماتے تھے کہ

مرا در سپاہ گری از ہیچ کس شرمندگی نمی آید اما وقتی کہ کمالات قطب الاقطاب ونام پیر دستگیر مذکور می شود شرمساری می گردم کہ ازاں بزرگان نسبت دارم و ہیچ وصف حضرات ایشان درخود نمی بینم۔(۴)

شاہ عالم کے ہمراہ حیدرآباد کی مہم پر گئے ہوئے تھے، اثنائے راہ میں ۲۸/ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ کو وفات پائی، تابوت جونپور لایا گیا اور اپنے آبائی قبرستان رشیدآباد میں شیخ ارشد کے بائیں دفن ہوئے، وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۳ سال ایک ماہ ۳ دن تھی، آپ کے چھوٹے بھائی غلام قطب الدین نے یہ تاریخ وفات لکھی۔

حریف نفس را دولت قریں بس — شہید زہد را قصر بریں بس
فنا فی اللہ چوں گشتی رسالت — معین الدین ترا ایزد معیں بس(۵)

---

(۱) گنج ارشدی و ۲۱۱۔ (۲) گنج ارشدی ج ۱، و ۲۱۔

(۳) ایضاً ۲۵۔ (۴) گنج ارشدی و ۲۱۔

(۵) گنج ارشدی ۲۱، سمات الاخیار۔

(۴) شیخ غلام قطب الدین: ۱۱ / ربیع الثانی ۱۰۶۷ھ کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے، اپنی تاریخ پیدائش آپ نے خود بیان کی ہے۔

روز آدینہ یازدہم ربیع الثانی (۱)

۷ ۶ ۰ ۱

۱۰۷۰ھ میں دیوان صاحب سے بیعت اور مشرف بخلافت ہوئے (۲)، ایک دن شیخ ارشد کی مجلس میں اہل تصوف کا لباس زیب تن کئے بیٹھے تھے، ملا محمد نصیب خلیفہ شیخ محمد ارشد نے عرض کیا کہ آپ درویش ہیں یا سپاہی، برجستہ جواب دیا کہ

نہ سپاہی نہ درویش من طالب علم ام

میں سپاہی ہوں نہ ولی بلکہ ایک طالب علم ہوں۔

شیخ ارشد یہ جواب سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ سچ کہا۔ (۳)

صبح دو گھنٹہ تلاوت کے بعد ذکر و اذکار میں مشغول ہو جاتے، اس سے فراغت کے بعد مطالعۂ کتب میں لگ جاتے فارسی اور ہندی کے اشعار بہت عمدہ کہتے تھے، تاریخ نویسی میں کمال حاصل تھا، جرأت و شجاعت میں یکتاے روزگار تھے۔

گنج رشیدی ملفوظات قطب الاقطاب (دیوان صاحب) اکثر مطالعہ میں رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ

از مطالعہ ایں خود را در مجلس قطب الاقطاب می یابیم (۴)

(اس کے مطالعہ سے اپنے آپ کو دیوان صاحب کی مجلس میں پاتا ہوں)۔

اسّی (۸۰) برس کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ کو چہار شنبہ کے دن رحلت فرمائی، شیخ غلام محمد رشید جانشین شیخ ارشد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (۵)

(۱) گنج ارشدی و۲۲۔

(۲) ایضاً و۲۲۔

(۳) گنج ارشدی ۲۲۔

(۴) گنج ارشدی و۲۳ و سمات الاخیار۔

(۵) سمات الاخیار بحوالہ گنج فیاضی قلمی، گنج ارشدی و۳۲۵۔

دیوان صاحب کے خلفا ومجازین: آپ کے خلفاء کی تعداد تقریباً چالیس ہے، انمیں مشاہیر کے نام یہ ہیں:

(۱) شیخ محمد ارشد: ان کا مفصل ترجمہ گذر چکا ہے۔

(۲) شیخ میر سید قیام الدین: یہ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڈھ کے باشندہ تھے لیکن گورکھپور میں سکونت اختیار کر لی تھی اسی لئے گورکھپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

(۳) شیخ میر سید جعفر پٹنوی: دیوان صاحب کے خلفاء میں آپ کا مقام بہت بلند ہے، دیوان صاحب فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مجھے جعفر کے طفیل بخش دیں گے، آپ کا اور شیخ میر قیام الدین کا مفصل حال سمات الاخیار میں مذکور ہے۔

(۴) شیخ نصرت جمال عرف ملتانی شاہ جامع گنج رشیدی المتوفی ۱۰۹۰ھ

(۵) شیخ نورالدین مداری المتوفی ۱۰۹۳ھ آپ دیوان صاحب کے ارشد تلامذہ سے ہیں۔

(٦) شیخ عبدالشکور منیری المتوفی ۱۰۹۰ھ آپ کو بھی دیوان صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

(۷) شیخ محمد ماہ دیوگامی دیوان صاحب کے خاص شاگرد ہیں، آپ ہی نے دیوان صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

(۸) شیخ آیت اللہ المتوفی ۱۰۷۷ھ

(۹) شیخ محی الدین متوکل جونپوری۔

(۱۰) قاضی محمد مودود جونپوری تلك عشرة كاملة.

☆ ☆ ☆

مولانا سخاوَت علی جونپوری

آٹھویں صدی ہجری کی ابتداء سے بارہویں صدی تک دیار پورب میں شہر جونپور اسلامی تہذیب وثقافت کا اہم ترین مرکز رہا ہے۔اس سرزمین سے بیشمار علماء وفضلاء اور صوفیا پیدا ہوئے جنھوں نے مدرسہ اور خانقاہ، دونوں کو اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں سے آباد کیا۔

حاجی معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

وكانت جونپور من ارق مدن الهند في ايام الدولة الشرقيه وخرج منها خلق من العلماء لايحصرهم عدد(۱)

سلطنت شرقیہ کے دور میں جونپور ہندوستان کے شہروں میں بہت بارونق شہر تھا اور اس میں بے شمار علماء پیدا ہوئے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۴۸ھ، شیخ ابوالفتح سون بریس المتوفی ۸۵۸ھ، میر سید عبدالاول محدث المتوفی ۹۶۸ھ، مولا علاء الدین الہٰ داد المتوفی ۹۳۹ھ، استاذ الملک محمد افضل عثمانی متوفی ۱۰۶۸ھ، ملا محمود مصنف شمس بازغہ متوفی ۱۰۶۸ھ، دیوان رشید مصنف مناظرہ رشیدیہ متوفی ۱۰۸۲ھ، ملا محمد جمیل مرتب فتاویٰ عالمگیریہ متوفی ۱۱۲۳ھ وغیرہ اپنے اپنے عہد میں یہاں کے علمائے فحول اور مشائخ کبار میں گزرے ہیں۔

ان میں العالم النبیل والفاضل الجلیل مولانا سخاوت علی بن رعایت علی حنفی جونپوری اپنے معاصرین میں خاص شہرت اور مقام کے مالک تھے۔

تیرہویں صدی کے علماء مشرق میں مولانا شریعت وطریقت کے مسلم مقتدا

---

(۱) معجم الامکنہ ج۱ص۶۱۔

اور امامت وعبقریت کے اعلامقام پرنظر آتے ہیں۔ بالخصوص حدیث وفقہ میں کامل دستگاہ اور خاص مہارت رکھتے تھے۔ صاحب اتحاف نے فقہائے ہند کی فہرست میں آپ کا شمار نہایت شاندار اور پرشوکت الفاظ میں کیا ہے۔آج کی صحبت میں جونپور کی تاریخ علمی سے آپ ہی کی داستان زیرعنوان ہے۔

نام ونسب اور خاندانی حالات

سخاوت علی بن رعایت علی بن درویش علی بن نذر علی عمری (۱) اس سے آگے سلسلۂ نسب تلاش وتتبع کے باوجود حاصل نہ ہوسکا۔آپ نسلاً شیخ فاروقی ہیں اور شیخ محمد کوفی کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا نے خود فرمایا از اولاد شیخ محمد کوفی ہستم پس محمدی نسبت است بہ یکی بطون فاروقی (۲)

خواجہ محمد (۳) نے کوفہ کب اور کن حالات میں چھوڑا۔ ہندوستان کی اقامت کو دوسرے اماکن پر کیوں ترجیح دی؟ اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ راقم نے مولانا کے خاندان کے بعض اہل علم سے اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی بس اتنا معلوم ہوسکا کہ شیخ کوفی کوفہ سے ہرات آئے پھر وہاں سے ہندوستان آکر قصبہ منڈیاہوں، مضافات جونپور میں فروکش ہوگئے۔

شیخ کوفی کا ہندوستان کے مشہور شہروں کو چھوڑ کر ایک غیر معروف قصبہ کو جائے اقامت کے لیے انتخاب کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی آمد ہندوستان میں فتنۂ تیموری کے لگ بھگ ہے جبکہ دلی کی تمدنی ومعاشرتی دنیا میں بادخزاں کے تیز وتند جھونکے چل رہے تھے اور دیار پورب میں شہر جونپور سلطان ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے حسن انتظام، علم دوستی اور علماء وفضلاء کے ساتھ داد ودہش اور فیاضانہ سلوک کی وجہ سے

(۱) نزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲۔

(۲) جواب سوالات تسعہ ص ۱۴۲۔

(۳) خواجہ محمد بن مخدوم شیخ اسدالدین آفتاب ہند کے خلفاء میں تھے اور انھیں کے ہمراہ دہلی سے ظفرآباد تشریف لائے پھر یہاں سے منڈیاہوں کو شرف وطنیت سے نوازا۔ (حبیب الرحمٰن)

مرجع خلائق بنا ہوا تھا اور اطراف عالم سے ارباب کمال دارالخیور شہر جونپور کی جانب کھنچے چلے آرہے تھے۔قرینِ قیاس ہے کہ انھیں وجوہ کی بناء پر شیخ کوفی نے بھی ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کے بجائے یہاں کی سکونت اختیار کی۔

سن پیدائش وابتدائی حالات

آپ ۲۶ یا ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے خاندان میں علم وفضل کا خاص چرچا تھا اور خاندان کے اکثر لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جس کی وجہ سے علم کے ساتھ گھر میں فراغت ورفاہیت بھی تھی اس لیے آپ کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی۔مبتداء فیاض نے ذہانت وفطانت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا جس کے آثار ایام طفولیت ہی سے نمایاں تھے(۱)

سن تمیز کو پہنچے تو خاندان کے طریق کے مطابق اولاً حفظ قرآن شروع کیا اور صرف چھ ماہ کی مدت میں حفظ سے فراغت حاصل کرلی۔اس کے بعد فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا قدرت علی ردولوی سے پڑھیں اور متوسطات مولانا احمد اللہ انّامی اور مولانا احمد علی چریاکوٹی کی خدمت میں ختم کیں اور تکمیل وقت کے عدیم المثال محدث اور مجاہد حضرت شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی بڈھانوی کے زیر تربیت کی اور عمر کے مختصر سے حصہ میں آمد روزگار ہوگئے۔(۲)

تبحر علمی

آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کے تبحر علمی کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔زیدی لکھتے ہیں:

دراندک زمان فاضل جلیل وعالم نبیل گشت شہرہ فضیلش برسرآسماں رسید وعلم

(۱) تجلی نور ص ۱۰۶ ونزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲۔

(۲) القول الجلی ص ا، وتجلی نور ص ۱۰۶، وتذکرہ علمائے ہند۔

تفوق بہ اقران افراشت وسر دبازاریٔ علمائے وقت گردید ملک العلماء وقت واستاذ الملک زمانہ بود دردور آخری زندہ کنند علوم جونپوروزیبندہ مسند فضلائے گزشتہ شد(۱)

(قلیل مدت میں جلیل القدر عالم ہوگئے اوران کی فضیلت کا چرچا بام آسمان تک پہنچ گیا۔ معاصرین میں سب سے آگے نکل گئے اور وقت کے ملک العلماء اور استاذ الملک قرار پائے۔ آخری دور میں جونپور کے علوم کو زندہ کرنے اور فضلائے گزشتہ کے مسند کو زینت بخشنے کا شرف آپ کی حصہ میں آیا)۔

مولانا سید عبدالحئی الحسنی تحریر فرماتے ہیں۔

الشیخ العالم الکبیر المحدث احد العلماء المشھورین(۲)

بیعت وخلافت

تحصیل علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور مجدّد دین احمدیؐ حضرت سید احمد بریلوی قدس اسرارہم کی خدمت میں حاضر ہوکر طریقۂ مجددیہ نقشبندیہ میں شرف بیعت حاصل کیا۔

نزھۃ الخواطر میں ہے۔

واخذ الطریقۃ عن السید الامام احمد بن عرفان الشھید البریلوی ولازمہ برھۃ من الزمان(۳)

حضرت سید احمد بن عرفان شہید بریلوی سے سلوک اخذ کیا اور ایک زمانہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔

علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی میں بھی کمال جدوجہد اور مجاہدہ وریاضت فرمائی

(۱) تجلی نور ص۱۰۶۔

(۲) نزھۃ الخواطر ج۷ص۱۹۲۔

(۳) نزھۃ الخواطر ج۷ص۱۹۲۔

تا آں کہ حضرت سید صاحب نے خلافت سے سرفراز فرما دیا۔

مولانا خود لکھتے ہیں:

اس فقیر کو بیعت طریقہ چشتیہ اور قادریہ اور نقشبندیہ اور مجددیہ اور محمدیہ، ہاتھ پر امیر المومنین سبط اکبر مجدد ثالث عشر امام اوحد سید احمد دامت برکاتہم الی یوم التناد ہے اور اجازت بیعت لینے کی بھی حاصل ہے الخ (۱)

تعلیم و تدریس

ان جملہ کمالات ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد آپ نے مسند تدریس کو زینت بخشی اور ہر قسم کے علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو کر اشاعت علوم میں مصروف ہو گئے۔ مولانا کی علمی حذاقت و مہارت اور زہد و تقویٰ کا آوازہ چہار سو پھیلا اور طلباء کا اتنا ہجوم ہوا کہ جونپور کی مجلس علمی میں نئے سرے سے جان آ گئی۔

ہزار ہا طلبائے دیار و امصار فیض علوم چیدند و صدہا فارغ التحصیل گشتند در دور آخری زندہ کنندہ علوم جونپور شد (۲)

(دور نزدیک کے ہزاروں طلباء نے آپ کے فیض علم سے استفادہ کیا اور سیکڑوں فارغ التحصیل ہوئے اور اس طرح آخری دور میں جونپور کے علوم کو آپ کی ذات سے نئی زندگی ملی)

جونپور سے باندہ

شدہ شدہ آپ کے کمالات کی شہرت نواب ذوالفقار بہادر مرحوم باندہ تک پہنچی۔ نواب مرحوم چونکہ علم دوست، علماء نواز تھے اس لیے بہ ہزار اصرار مولانا کو باندہ بلایا۔ مولانا نے نواب کی خواہش کو قبول کر لیا اور کچھ دنوں کے لیے باندہ کی اقامت منظور کر لی۔

(۱) رسالہ وصول ص ۳۶۔

(۲) تجلی نور ج ۱ ص ۱۰۶۔

نواب باندہ نے ہر طرح سے آپ کی توقیر و تعظیم کا خیال کیا اور آپ کے فضل و کمال کو دیکھ کر انتظام مدارس اور افسریت علماء کے مناصب آپ کو تفویض کر دیے، اس وقت نواب کے دربار میں بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء موجود تھے مگر جو قدر و منزلت نواب کے دل میں مولانا کی تھی وہ کسی کو حاصل نہ تھی۔

اسی زمانہ میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی بھی باندہ میں نواب کے دربار سے منسلک تھے۔ مولانا عبدالحلیم مولانا کی جلالت علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بہت سی کتابیں مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے اور ساتھ ہی درس و تدریس، وعظ و افتاء کی تربیت بھی مولانا سے حاصل کی۔ (۱)

مولانا فطرتاً آزاد منش واقع ہوئے تھے اس لیے باندہ کے قیام کو زیادہ دنوں کے لیے برداشت نہ کر سکے اور بصد عزت و رفعت ایک سال بعد جونپور واپس چلے آئے۔

استخلاص الجامع الشرق و قیام مدرسہ قرآنیہ

اس زمانہ میں الجامع الشرق (بڑی مسجد شہر جونپور) پر شیعوں کا قبضہ تھا جس میں وہ تعزیہ داری اور اس کے سات تاشہ نقارہ وغیرہ بجاتے۔ اس سے بھی آگے کی بات یہ تھی کہ مسجد کو بارات ٹھہرانے کا بنگلہ بنا دیا تھا جس میں باراتی ہر قسم کی رنگ رلیوں کا پروگرام مناتے۔ غرض اسی طرح کی اور بھی بہت سی شنیع حرکات سے مسجد کی عزت و حرمت کو بالکل پامال کر دیا تھا۔ (۲)

مولانا کی غیرتِ ایمانی خانۂ خدا کی اس بربادی کو کب برداشت کر سکتی تھی چنانچہ آپ نے ابتداء میں انھیں لوگوں کو مسجد کی عزت و حرمت کی جانب توجہ دلائی مگر ان لوگوں نے اس کا کچھ اثر نہیں لیا تو آپ نے حاکم وقت کے دربار میں استغاثہ پیش کر دیا اور بڑی جدوجہد اور سعی کوشش کے بعد مولانا کی دلی مراد بر آئی اور مسجد کو براءت حاصل ہوئی۔

(۱) القول الجلی ص ۳۔

(۲) القول الجلی ص ۳۔

آپ نے فوراً مسجد کو صاف کرایا اور اس میں نماز پنجگانہ اور جمعہ کا انتظام فرمایا۔

اس کے بعد مولانا کو یہ خیال ہوا کہ اس میں کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مسجد کی آبادی کا سبب ہو اس خیال کے ماتحت آپ نے حسبۃً للہ مدرسہ قرآنیہ کی بناء ڈالی اور سب سے پہلے حافظ امام الدین لاہوری کو جو ایک خدارسیدہ اور صاحب حال بزرگ تھے، مدرس مقرر فرمایا اور خود قیام ہندوستان تک مدرسہ کے انتظام و انصرام کی دیکھ ریکھ فرماتے رہے اور ہجرت کے وقت اہل جونپور اور دیگر مضافات کے علاقہ کے لوگوں کو مدرسہ کی بقاء و ترقی کی وصیت بھی فرمائی۔ بحمداللہ مدرسہ آج تک جاری ہے اور علوم دینیہ بالخصوص حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا ہے جس سے بے شمار علماء، فضلاء اور حفاظ نے فیض اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ (۱)

مختصر تاریخ مسجد

ملک الشرق ابراہیم شاہ شرقی المتوفی ۸۴۴ھ کے نقشہ کے مطابق ان کے بڑے لڑکے سلطان محمود شاہ شرقی المتوفی ۸۶۲ھ نے اس مسجد کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کا اندرونی صحن ۲۱۷×۲۱۹ فٹ ہے اور پورا احاطہ ۳۲۰ فٹ پورب و پچھّم اور ۳۰۷ فٹ اتر دکھن ہے۔ اور بلندی ۲۰۰ فٹ سے زیادہ ہے۔

تاریخ تعمیر کے بارے میں مورخین کی آراء مختلف ہیں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۱۴۳۸÷ اور ۱۴۷۰÷ کی درمیانی مدت میں اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ (۲)

ہجرت مکہ معظّمہ

مولانا ۱۲۶۴ھ میں اپنے ماموں مفتی محمد غوث صدر الصدور کی معیت میں فریضۂ حج ادا کر چکے تھے اور اپنی نگاہوں سے تجلیات ربانی کے مظہر اتم کو دیکھ آئے تھے اس لیے دل

(۱) تذکرہ علمائے ہند و نزھۃ ج ۷ ص ۱۹۲، والقول الجلی ص ۳۔

(۲) تاریخ شیراز ہند۔

ہر وقت ادھر ہی لگا رہتا تھا۔اور ادھر مولانا امیر علی شہید کے واقعہ شہادت نے ہندوستان سے مزید دل برداشتہ کر دیا۔ بالآخر ۱۲۷۲ھ میں آپ نے ہجرت کا عزم مصمم کرلیا اور سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اس سلسلے میں آپ نے کسی سے کسی قسم کی کوئی اعانت لینا پسند نہیں فرمایا اس لیے زاد راہ کے لیے اپنی والدہ کا وظیفہ جو بنارس کلکٹری میں مقرر تھا، فروخت کر دیا اور متوسلین و معتقدین کے سدراہ ہونے کے باوجود اپنے اہل وعیال کو ہمراہ لے کر بذریعہ کشتی بنارس، غازی پور، بلیا اور عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچ گئے اور چند یوم مولانا بدیع الزماں کے یہاں قیام فرما کر مکہ معظّمہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے بغایت آرام واطمینان سے بلدۂ امین میں پہنچا دیا۔

صاحب نزہۃ لکھتے ہیں:

ثم سار الى الحرمين الشريفين مع خاله المفتى محمد غوث الجونفورى سنة اربع وستين و مأتين والف فحج وزار ورجع الى الهند ودرس وافاد مدة ثم هاجر الى المكة المباركة مع عياله سنة اثنين وسبعين الخ(۱)

بعدازاں اپنے ماموں مفتی محمد غوث جونپوری کی معیت ۱۲۶۴ھ میں فریضۂ حج ادا فرما کر ہندوستان مراجعت کی اور درس وافادہ میں لگ گئے۔ پھر ایک مدت کے بعد مکہ معظّمہ کی جانب مع اہل وعیال کے ہجرت فرمائی....

وفات

ہجرت کے بعد کے حالات بالکل پردۂ خفا میں ہیں کسی تذکرہ نگار نے اس کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا۔مولانا کے خاندان کے لوگ جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں، ان سے بھی اس سلسلے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔

حاصل کلام اسی دار ہجرت میں وقت موعود آ گیا اور ۶؍شوال ۱۲۷۴ھ کو جان جان آفریں کو تفویض فرما کر جوار رحمت میں داخل ہوگئے۔ مکہ معظّمہ کے مشہور قبرستان جنت

(۱) نزہۃ ج ۷ص ۱۹۲، والقول الجلی ص ۴، وتجلی نور ج ۱، ص ۱۰۸۔

المعلی میں اس گنجینۂ علم وفضل کو دفن کیا گیا۔(۱)

تاریخ وفات:

گفت زیدی از سر تاریخ سال　　　ختم شد شور علوم جون پور

مولانا کا مسلک

مولانا مسلکاً حنفی تھے اور حنفی ہونے پر آپ کو فخر بھی تھا۔ چنانچہ مولانا نے ہجرت کے وقت جو وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا اس میں بصراحت ارقام فرماتے ہیں کہ فقیر اب اس ملک سے سفر کرتا ہے ایسا نہیں کہ کم علم لوگ پیچھے لوگوں کو گمراہ کریں اور فقیر کی طرف نسبت کریں کہ حنفی ہونے کو بد سمجھتے تھے اور حالانکہ فقیر حنفی ہے یا تقلید صحیح کے منکر تھے یا اہل حدیث خواہ فقہ سے انکار تھا اور عمل حدیث (؟) خواہ فقہ پر نہ تھا جس کو شبہ ہو فقیر کے پاس آکر رفع اشتباہ کرلے اور جس چیز سے غافل ہو ہوشیار ہو جائے اب زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں والسلام (۲)

ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

آنچہ اعتراضات متعصبین است بجواب آں پرداختن شان اہل حق نیست اگر فرضاً علماء اعلام حنفی نہ باشند چہ وجہ طعن ست حنفی وشافعی بودن خود واجب نیست چنانچہ درفواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت مرقوم است ونسبت فقیر حاجت استفسار نیست حنفی ام وبہ حنفیت... حقہ اتباع امام اعظم رافخر میدانم الخ(۳)

(متعصبین جو اعتراضات کرتے ہیں اس کے جواب کی جانب متوجہ ہونا اہل حق کی شان نہیں ہے۔ بالفرض اگر بڑے بڑے علماء حنفی نہیں تھے تو اس میں وجہ طعن کچھ بھی نہیں کیونکہ حنفی وشافعی ہونا واجب نہیں جیسا کہ فتوح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں ہے اور فقیر

---

(۱)　تجلی نور ج ۱، ص ۱۰۸۔

(۲)　رسالہ نصائح ص ۱۱۔

(۳)　جواب سوالات تسعہ ص ۱۵۔

کے بارے میں پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں حنفی ہو اور حنفیت حقہ کے ساتھ امام اعظم کی اتباع کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہوں)

مولانا کی تحریروں کے بعد کسی کا اس بات پر اصرار کہ مولانا غیر مقلد تھے اور موجودہ اہل حدیث کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے نزدیک کوئی مقام رکھتا ہو لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

تصانیف

مولانا کو درس و تدریس سے فرصت بہت کم ملتی تھی اس لیے تصنیف و تالیف کی جانب چنداں رجحان نہیں ہوا پھر بھی بہت سے رسائل آپ کے قلم فیض رقم سے پیکر تحریر میں آئے جو آپ کے تبحر علمی کی واضح دلیل ہے۔

ان رسائل میں سے اکثر اب ناپید ہیں۔ راقم الحروف کو بڑی تلاش وجستجو کے بعد مندرج رسائل دستیاب ہو سکے افادہ عام کے لیے ان کا تعارف درج ہے۔

(۱) رسالہ فقر: فن تصوف پر ایک مختصر سا رسالہ ہے جسے چار فائدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فائدہ اوّل تقویٰ کے بیان میں ہے۔ دوسرا اہل تصوف کی عادات میں، تیسرا قلوب کی بیماریوں اور اس کے علاج پر مشتمل ہے۔ چوتھے میں انقطاع دنیا وترکِ خواہشات کا تذکرہ ہے۔

اس رسالہ کے مضامین خود مصنف کے بیان کے مطابق فتوح الغیب مصنفہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے ماخوذ ہیں۔

(۲) رسالہ نصائح: یہ چند ورقی ایک کتابچہ ہے جس میں پندرہ بیش قیمت نصیحتیں نہایت مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہیں دراصل مولانا کی پندرہ وصیتیں ہیں جو آپ نے سفر ہجرت کے موقع پر اپنے متعلقین کو تحریراً فرمائی تھیں۔

(۳) رسالہ عرفان الاوقات: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ نماز پنج گانہ کے اوقات کے متعلق ہے۔ یہ ایک جامع رسالہ ہے جس میں آیات واحادیث کی روشنی میں

مدلل طور پر فرائض خمسہ کے اوقات کی تجدید کی گئی ہے۔ اس رسالہ میں ہر قسم کے تعصّبات سے الگ ہو کر اوقات مختلفہ میں معتدل فیصلہ کیا گیا ہے۔

(۴) رسالہ وصول: یہ رسالہ بھی فن تصوف میں ہے۔

(۵) رسالہ در بیانِ کلماتِ کفر: یہ چھ ورقی رسالہ کلمات کفر کے بیان میں ہے اس رسالہ میں مصنف نے کلمات کفر کے ساتھ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کو بھی بالتفصیل بیان کیا ہے اور اصل مقصد کے شروع کرنے سے پہلے ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے، جس میں کلمات کفر اور گناہ کبیرہ وصغیرہ کو بڑے ستھرے انداز میں تحریر کیا ہے۔

(٦) رسالہ ناسخ ومنسوخ: یہ رسالہ ایک مقدمہ دو فصل اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں نسخ کی تعریف اور اس کے لغوی واصطلاحی معنی سے بحث کی گئی ہے اور دو فصلوں میں سے پہلی فصل میں آیات منسوخہ کو بیان کیا ہے اور دوسری فصل میں احادیث منسوخہ کو اور خاتمہ میں مسئلہ تقلید سے بحث کی گئی ہے۔ اثبات تقلید کو ایسے اچھوتے اور دلنشیں انداز سے بیان کیا ہے کہ طالب حق کے لیے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود بہت ہی مفید اور مولانا کی علمی عبقریت بالخصوص قرآن وحدیث پر آپ کی دقت نظر کے لیے کافی ثبوت ہے۔

(۷) رسالہ تقویٰ: اس رسالے میں پانچ فرقوں کا بیان ہے۔ مقدمہ میں مولانا رقمطراز ہیں کہ اس دیار میں پانچ قسم کے کلمہ گو موجود ہیں۔ ایک اہل سنت وجماعت، دوسرے شیعہ امامیہ۔ تیسرے صوفی روش، چوتھے منکر مذاہب۔ پانچویں جاہل تابعدار رسم وعادت وخواہش نفسانی۔ اس میں کتاب وسنت کی روشنی میں بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ ان فرقوں میں صحیح راستہ پر صرف اہل سنت والجماعت ہیں۔

(۸) قویم فی احادیث نبی الکریم: مولانا کی یہ سب سے اہم اور نادرۂ روزگار تصنیف ہے اس کتاب کو مولانا نے صحاح ستہ کے علاوہ تقریباً چالیس کتب احادیث و رجال کو سامنے رکھ کر مرتب فرمایا ہے۔

کتاب کی ترتیب ابواب فقہی پر ہے اور ہر باب میں احناف کے مستدلات کو حوالہ اور

درجۂ حدیث کے بیان کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب اس لائق ہے کہ احناف کے ہرادارہ میں اس کو رکھا جائے اوراہل مدارس اپنے نصاف میں داخل کرلیں تا کہ طلبہ کی نظر سے مسائل کے ساتھ ساتھ دلائل بھی گزرتے جائیں اور تقلید محض کے بجائے تحقیق کا ذوق پیدا ہو۔ راقم کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ مترجم ہے اور پانچ سوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے کتاب الطہارت ہے اور سب سے آخر میں کتاب الفرائض۔

ان رسائل کے علاوہ رسالہ فصیح فی مسئلہ تقلید صحیح، رسالہ اسرار، رسالہ تعداد لغات۔ اسلم فی المنطق، رسالہ علم الفرائض، رسالہ عرض نیک در ردشیعہ بھی آپ کی مشہور تصانیف ہیں مگر انتہائی کوشش کے باوجود یہ رسائل دستیاب نہ ہوسکے۔ لعل الله يحدث بعد ذلك امرا.

اولاد

مبدء فیاض نے مولانا کو علم وفضل کی دولتِ جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطافرمائی تھی۔ مولانا کے چھ بچے تھے جن میں دولڑکیاں مریم، اور جویریہ نامی تھیں اور چار بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے مولانا شیخ محمد اور سب سے چھوٹے مولانا ابوالخیر محمد مکی تھے۔(۱)

(۱) شیخ محمد: یہ ہمیشہ اپنے والد ماجد کے ساتھ رہے۔ علم فضل، زہد وورع، درس وافتاء اور تقریر وتحریر میں نادرۂ روزگار تھے۔ مولانا سلامت اللہ کانپوری سے ان کا ایک مناظرہ آج بھی اہل علم میں مشہور ہے۔ ایک رسالہ کتاب البیوع میں تحریر فرمایا جو اہل علم کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر افسوس کہ اس گنجینۂ علم وفضل کا عین شباب میں ۲رشوال ۱۲۷۳ھ کو انتقال ہوگیا۔

(۲) مولانا حکیم محمد جنید: سفر ہجرت میں یہ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ تھے اور ہر طرح کے فیضان علمی وعملی سے اکتساب کرتے رہے۔ مولانا کی وفات کے بعد جونپور

(۱) ازافادہ مولانا علی اعلیٰ نبیرۂ مولانا محمد شبلی۔

واپس تشریف لائے اور مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی استاذ مدرسہ امام بخش سے متوسطات پڑھ کر مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے بقیہ کتابوں کی تکمیل کی۔ پھر طب کی طرف متوجہ ہوئے اور حکیم اولاد علی جونپوری کے مطب میں کچھ دنوں تک تحصیل کر کے اس فن میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔

یہ بھی ہر قسم کے محاسن صوری ومعنوی سے آراستہ تھے۔ افتاء، درس وتدریس، وعظ و نصائح اور انتظام مدرسہ قرآنیہ کے ساتھ طبابت بھی کرتے تھے اور اس طرح سے بندگان خدا کی روحانی وجسمانی دونوں خدمتیں انجام دیتے تھے۔ یہ بھی زندگی کی بہاروں سے زیادہ متمتع نہ ہوسکے اور اپنے برادر کبیر کی طرح عالم شباب ہی میں ۱۲۸۱ھ میں واصل بحق ہوگئے۔(۱)

(۳) مولانا محمد شبلی: یہ ۲۵؍شعبان ۱۲۶۳ھ کو پیدا ہوئے۔ مولانا کے سفر ہجرت کے وقت چونکہ صغیر سن تھے اس لیے ہمراہی کے شرف سے قاصر رہے اور اپنے نانا قاضی ضیاء اللہ صدر الصدور کی زیر نگرانی تعلیم کا آغاز کیا۔ خاندانی روایت کے مطابق سب سے پہلے حافظ نعمت اللہ سرائے میری سے حفظ قرآن کیا۔ پھر کتب فارسیہ متداولہ سے فراغت کے بعد مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوگئے اور انھیں کی خدمت میں درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ مفتی صاحب نے فراغت کے موقع پر جو سند انھیں لکھ کر دی تھی وہ ان کے علمی کمال پر روشن دلیل ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں سند نقل نہیں کر رہے ہیں۔

علوم ظاہری کی تحصیل وتکمیل کے بعد آپ نے علوم باطنی کی جانب توجہ کی اور اپنے والد ماجد کے تلمیذ رشید حضرت سید خواجہ احمد نصیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ بیعت حاصل کیا اور مدت تک سید صاحب کی خدمت میں رہ کر فیضان روحانی سے مستفید ہوتے رہے۔ اسی زمانہ میں خواجہ احمد نے آپ کے دل میں حدیث کا شوق پیدا کردیا چنانچہ اپنے مرشد کے حکم سے مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں صحاح ستہ کے علاوہ دوسری کتب حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ ان جملہ کمالات کے بعد ۱۲۸۶ھ میں اپنے شفیق مربی اور نانا قاضی ضیاء اللہ کی معیت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔

(۱) القول الجلی ص ۸۔

اس مبارک سفر سے واپسی کے بعد علوم دینیہ کی خدمت میں اپنے اسلاف کی طرح مصروف ہوگئے۔ بالخصوص مدرسہ قرآنیہ کے انتظام وانصرام میں کافی دلچسپی لی اور جو مدرسہ اب تک صرف حفظ قرآن کی خدمت انجام دے رہا تھا اس میں اتنی ترقی ہوئی کہ درس نظامیہ کی مکمل تعلیم ہونے لگی۔

۲۱؍رمضان ۱۳۱۱ھ کو بعمر ۶۵ سال اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

(۴) مولانا ابوالخیر محمد مکی: ان کی ولادت ۱۹؍جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ کو مکہ معظمہ میں ہوئی والد مرحوم کی وفات کے بعد اپنی والدہ اور علاتی بھائی مولانا جنید کے ساتھ جونپور تشریف لائے۔ سن تمیز کو پہنچے تو حافظ نعمت اللہ سرائے میری سے حفظ کلام پاک شروع کیا اور حافظ احمد جونپوری سے تکمیل کی اسی زمانہ میں کتب فارسیہ سے فراغت حاصل کرلی۔ اس کے بعد اپنے برادر بزرگ مولانا محمد شبلی سے عربی کتابیں شروع کیں۔ مختصرات کو ان کی خدمت میں مکمل کرکے ۱۲۹۲ھ میں مولانا حکیم محمد عبداللہ چھراوتی تلمیذ رشید مفتی محمد یوسف سے متوسطات شروع کیں اور کچھ کتابیں مولانا سعادت حسین عظیم آبادی تلمیذ مولانا سخاوت علی اور محمد اکرم آروی سے پڑھیں اور تکمیل ابوحنفیہ وقت حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی خدمت میں کی۔

اس کے بعد حضرت سید ضیاء النبی بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوکر سلوک کی راہ میں قدم رکھا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر اس راہ کی بھی تکمیل فرمائی۔

بعد ازاں درس وتدریس وعظ وافتاء اور اپنے پیشرو بزرگوں کی طرح مدرسہ قرآنیہ کے انتظام میں ہمہ تن منہمک ہوگئے۔ مولانا کی حیات تک یہ مدرسہ علوم ظاہری وباطنی کا ایک سنگم تھا اور مدرسہ ہر اعتبار سے ترقی پذیر تھا اور ہندوستان کے مشہور مدارس میں اس کا شمار ہوتا تھا مگر مولانا کے بعد مدرسہ میں وہ رونق باقی نہ رہی۔

وہ دھوپ تھی جو سنگ گئی آفتاب کے

آپ نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی۔(۱)

(۱) القول الجلی ص ۹، ونزھۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۵۷۔

تلامذہ

یوں تو مولانا کے چشمۂ علم وفضل سے بے شمار تشنگان علوم سیراب ہوئے مگران میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، مولانا سید خواجہ احمد نصیرآبادی، مولانا کرامت علی اوران کے برادر خورد مولانا رجب علی جونپوری، مولانا شاہ امید علی جونپوری، مولانا غلام جیلانی غازیپوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظمی، مولانا شیخ محمد محدث مچھلی شہری، مولانا محمد یعقوب بہاری، مولانا رحیم اللہ بستوی ارشد تلامذہ میں ہیں اوران میں سے ہرایک آسمان علم وفضل کا مہر درخشاں تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
کے سفر حرمین شریفین کی تفصیلی روداد

یہ روداد امام الہند شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے تلمیذ رشید وخلیفہ اجل شیخ محمد عاشق پھلتی متوفی فی حدود ۱۱۸۷ھ نے قلمبند فرمائی ہے جو اس سفر میں حضرت شاہ صاحب کے رفیق سفر تھے اس لئے اس کے مندرجات شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ پر مشتمل ہیں جسے شیخ پھلتیؒ نے اپنی نادرۂ روزگار تالیف "القول الجلی فی ذکر آثار الولی" میں صفحہ ۳۹ سے صفحہ ۴۹ تک میں تحریر فرمایا ہے چونکہ القول الجلی ایک مدت سے نایاب تھی اس لئے حضرت شاہ صاحب پر کام کرنے والے حضرات اس سے استفادہ نہیں کرسکے حالانکہ یہ روداد اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی علمی وعرفانی منزلت اور عظمتِ شان نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور ایک ایسے مستند ذریعہ سے جس پر خود شاہ صاحب نے بھی اعتماد کیا ہے۔

مدت ہوئی ایک مرتبہ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نوراللہ مرقدہ سے سنا تھا کہ تکیہ کاکوری میں القول الجلیل کا ایک قلمی نسخہ ہے بعد میں معلوم ہوا کہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں بھی اس کا ایک ناقص مخطوطہ ہے، ان دونسخوں کے علاوہ اب تک کسی تیسرے نسخہ کا علم نہیں ہوسکا اسی کاکوری نسخہ کا عکس لے کر شاہ ابوالخیر اکاڈمی شاہ ابوالخیر مارگ دہلی۔۶ نے ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء میں اس نایاب کتاب کو شائع کردیا ہے، میرے سامنے یہی مطبوعہ نسخہ ہے جو کاکوری والے نسخہ کا عکس ہے کاتب اس نسخہ کی کتابت سے جمعہ ۲۵ رشعبان ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۲/ اگست ۱۸۱۳ء کو فارغ ہوئے ہیں، کتابت میں جابجا غلطیاں ہیں بالخصوص عربی عبارت میں غلطیاں بیحد ہیں جس کی وجہ سے استفادہ میں بڑی دشواری پیش آتی ہے پھر بھی شاہ صاحب پر ایک مستندترین کتاب اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ گئی جسے ایک نعمت غیرمترقبہ ہی کہا جاسکتا ہے، اسی کتاب مستطاب سے سفر حرمین شریفین کی روداد کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ (حبیب الرحمٰن قاسمی)

آغاز سفر

جب حرمین شریفین کے سفر اور اس کار کا داعیہ پختہ اور عزم مصمم ہو گیا تو ۸؍ ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ کو قدوۃ اصحاب معرفت وعمدۃ ارباب حقیقت شیخ عبید اللہ سلّمہم اللہ تعالیٰ (والد ماجد شیخ محمد عاشق پھلتی اور دیگر احباب و اصحاب جن میں ایک شیخ محمد پھلتی مؤلف القول الجلی بھی شامل تھے) کے ہمراہ براہ لاہور (وطن مالوف) دہلی سے کوچ کیا، راستے میں ''پانی پت'' سے گذر ہوا تو شاہ شرف الدین قلندر، شاہ شمس الدین ترک اور شاہ جلال الدین قدس اسرارہم کے مزارات پر برائے فاتحہ گئے، یہاں سے چل کر سرہند پہنچے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے روضہ کی زیارت کی، اسی طرح لاہور ورود ہوا تو شیخ علی ہجویریؒ کے مزار پر فاتحہ کے لئے گئے، لاہور کے بعد ملتان پہنچے تو شیخ بہاء الدین سہروردی اور شیخ رکن الدین قدس اسرارہم کی تربت پر فاتحہ پڑھا، ملتان میں طلبہ وعلماء کی ایک کثیر تعداد نے حضرت شاہ صاحب سے بیعت کی اور سلوک کے اوراد واشغال حاصل کئے، یہاں سے روانگی کے وقت بہت سے لوگوں نے سفر میں رفاقت کی خواہش ظاہر کی، مگر حضرت شاہ صاحب نے بہ مصلحت وقت انھیں تسلی دی اور واپس کر دیا۔

جب دیار سندھ سے گذر ہوا تو آپ کی آمد کی خبر سن کر اپنے اپنے مقامات سے لوگ ملاقات کے لئے دوڑ پڑے، جن میں سے ایک جماعت شرف زیارت سے فیض یاب ہوئی اور کچھ لوگ تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے ملاقات سے محروم رہ گئے، شہر ٹھٹھ کے مضافاتی قصبہ نصر پور میں جب قافلہ پہنچا تو بہت سے علماء وفضلاء پانچ پانچ چھ چھ کوس سے مسافت طے کر کے رات کے وقت وہاں پہنچے اور اسی وقت خدمت میں باریابی حاصل کر کے سلسلۂ بیعت سے منسلک ہو گئے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے، نصر پور کے بعد شہر ٹھٹھ میں شرف نزول فرمایا وہاں بھی دیگر شہروں کی طرح تمام مقامی علماء اور صوفیاء خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں سے ایک بڑی جماعت نے بیعت کی سعادت بھی حاصل کی، یہیں حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ مخدوم محمد معین (جو اس دیار

کے علمائے کبار میں شمار ہوتے تھے اور کتاب وسنت و جمیع علوم منقول ومعقول میں تبحر تام رکھتے تھے، نیز قوم (یعنی صوفیا) کی اصطلاحات سے پوری واقفیت اور علم حقانی کے ادراک میں ذہن ثاقب کے مالک تھے اور حضرت شاہ صاحب کے جمال وکمال کے گرویدہ تھے) خدمت میں حاضر ہوئے اور اس صحبت کو غنیمتِ کبریٰ سمجھ کر خوب خوب فیوض و برکات حاصل کئے، اور بیعت وارشاد کی اجازت سے بہرہ یاب ہوئے۔

بندر سورت سے روانگی

چونکہ ہر مقام پر طلبہ وعلماء کے قافلے زیارت و ملاقات کے لئے حاضر خدمت ہوتے رہے جس کی بنا پر راستے میں بہت زیادہ توقف ہوا، اور جہازوں کی روانگی کا وقت بالکل قریب آ گیا، اس لئے ہم خدام کو اضطراب اور پریشانی لاحق ہوئی کہ مبادا ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی جہاز روانہ ہو جائیں اور ہم حج کی دولت سے محروم رہ جائیں، ہمارے اس اضطراب و بے چینی کو محسوس کر کے حضرت شاہ صاحب نے ہمیں اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا (گھبراؤ نہیں) انشاء اللہ اسی سال حج سے مشرف ہوں گے، الحاصل ہمارا قافلہ بندر سورت پر پہنچا جب کہ جہازوں کی روانگی کا وقت تقریباً گذر چکا تھا اور سارے جہاز مسافروں کو لے کر روانہ ہو چکے تھے، صرف ایک جہاز باقی رہ گیا تھا مگر وہ بھی مسافروں سے بھر چکا تھا، اس بنا پر بہت سارے لوگ واپس لوٹ رہے تھے مگر بفضل الٰہی ہمیں جگہ مل گئی، حضرت شاہ صاحب نے اس جہاز پر سوار ہونے کا ارادہ فرمایا تو اکثر احباب نے عرض کیا کہ جہازوں کے سفر کا وقت ختم ہو گیا ہے (اس لئے اب سفر مخدوش ہوگا) پھر یہ جہاز بھی نہایت خستہ حال ہے اور سست رفتار بھی ہے، خود جہاز رانوں کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں بھی اس جہاز پر اطمینان نہیں ہے اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ توقف کیا جائے، احباب کے ان خدشات کو حضرت شاہ صاحب نے کوئی اہمیت نہیں دی اور قافلہ کو لے کر جہاز میں سوار ہو گئے اور فرمایا ''انشاء اللہ امسال حج خواہم کرد'' انشاء اللہ ہم اسی سال حج کریں گے، بہر حال جیسے ہی لنگر اٹھا اور جہاز روانہ ہوا

(بفضلہٖ تعالیٰ) بادموافق چل پڑی (اوراپنی خستہ حالی وسست رفتاری کے باوجود) ۴۵ دن میں یہ جہاز جدہ پہنچ کرلنگر انداز ہوگیا، جہاز کی اس تیز رفتاری اوراس قدر جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جانے سے دیگر جہاز رانوں کو حیرت ہوئی۔

مکہ معظّمہ میں حاضری اور وہاں کے علماء وفضلاء سے ملاقات

۱۵/ذی قعدہ (۱۱۴۳ھ) کو مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے اورعمرہ تمتع ادا فرمایا، پھرذی الحجہ میں ادائیگی حج سے بہرہ یاب ہوئے، مکہ معظّمہ میں اقامت کے دوران وہاں کے علماء وفضلاء سے علمی مذاکرے اورتبادلۂ خیالات ہوتے رہے۔

بعض علماء نے حضرت شاہ صاحب کے علمی مقام ومرتبہ کومعلوم کرنے کی غرض سے کچھ اہم علمی سوالات بھی کئے، حضرت شاہ صاحب نے ان کا نہایت شافی جواب دیا جس سے وہ سمجھ گئے کہ یہ جمیع علوم منقول ومعقول میں سب پر فائق ہیں، تو ان کی جانب سے درس وافادہ کا اصرار ہوا، چنانچہ ان کے سوال واصرار پر حضرت شاہ صاحب نے مسجد حرام میں حنفی مصلیٰ کے قریب درس دینا شروع کردیا، مستفیدین کی اس قدر کثرت ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کا سارا وقت درس وافادہ میں مشغول ہوگیا، اورحل دقائق وکشف مغلقات میں آپ کی اس قدر شہرت ہوئی کہ وہاں کے علماء کبار علمی مشکلات میں آپ سے رجوع کرنے لگے، اورتھوڑے ہی دنوں میں وہاں کے علمی حلقوں میں آپ کی علمی عظمت و مرتبت کا سکہ ایسا بیٹھ گیا کہ وہاں کے اکابر علماء آپ کی صحبت کوغنیمت شمار کرنے لگے اور آپ کے ساتھ انتہائی توقیر وتعظیم کا معاملہ کرتے اور باہم کہتے کہ واللہ باللہ تمام اہل مکہ میں آپ کی علمی شان ومرتبہ کا کوئی نہیں ہے، بہت سے حضرات نے آپ سے گذارش کی کہ اب واپسی کا ارادہ فسخ کرکے یہیں توطن اختیار فرمالیں، اس وقت کے گورنر پاشا نے قیام کی ساری ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری پر آمادگی کا اظہار بھی کیا مگر حضرت شاہ صاحب نے اسے قبول نہیں کیا، تو وہاں کے اکابر نے آخر میں یہاں تک فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اہل مکہ کے ساتھ خیر کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو اسی جگہ مقیم کردیں گے۔

مکہ معظّمہ کے دوران قیام میں ایک سوڈانی عالم نے جو ایک عرصہ سے مکہ میں مجاور تھے خواب دیکھا کہ ایک عزیزان سے کہہ رہے ہیں کہ اگر عقیدۂ اقطاب سیکھنا چاہتے ہو تو شیخ ولی اللہ سے استفادہ کرو، اس خواب کے بعد وہ سوڈانی عالم حضرت شاہ صاحب سے بیعت ہوگئے، اور سلوک کی تعلیم حاصل کر کے بعض اسرار سے ہم کنار ہوئے، بعد ازاں حرمین کے بہت سے حضرات نے آپ سے بیعت کی اور طریقت کے اوراد و اشغال کی تعلیم حاصل کی۔

مدینہ منورہ کی حاضری

فریضۂ حج سے فراغت کے بعد دو ماہ مکہ معظّمہ میں قیام رہا، بعد ازاں زیارت نبوی ...... کی غرض سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اس بابرکت سفر میں بہت سارے اسرار آپ پر منکشف ہوئے، اور جب مدینہ منورہ پہنچ کر روضۂ اقدس علی صاحبہا افضل الصلوات واہمّ التسلیمات کی زیارت سے مشرف ہوئے تو اپنی جانب آنحضرت ...... کی بے غایت عنایات و کرامات مبذول پائی، روزانہ جب مواجہہ شریف میں مراقب ہوتے تو اسرار جدیدہ سے ہم کنار ہوتے، کوئی مجلس بھی اس فیضان سے خالی نہیں رہی۔

ایک بزرگ کا خواب

مدینہ منورہ حاضری سے پہلے ہی شیخ عبدالکریم انصاری نے (جو خادم رسول انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے اور اہل مدینہ کے اکابر میں شمار ہوتے تھے) حضرت شاہ صاحب کو خواب میں دیکھا، علاوہ بریں مواجہہ شریفہ علی صاحبہا الصلوات اتمہا ومن التسلیمات اکملہا میں بھی آپ کی کرامت و بزرگی معلوم کی تھی، اسی بناء پر وہ آپ کے منتظر تھے، چنانچہ جب آپ مدینہ پہنچ گئے تو قافلہ والوں سے معلومات کر کے آپ کی خدمت میں تشریف لائے اور اپنے خواب کا ذکر کیا اور اسی کے ساتھ اپنی سند سے حدیث مسلسل بالاولیۃ کی اجازت بھی روضۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے قریب مقام اصحاب صفہ میں عطا فرمائی۔

ایک عالم کی جانب سے دعوت طعام اور علمی سوالات

مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے مدرسین میں سے شیخ طیب نے جن کا فضلاء مدینہ میں شمار تھا حضرت شاہ صاحب کی دعوت کی اور اس مناسبت سے شہر کے دیگر علماء وفضلاء کو بھی بلا رکھا تھا، چنانچہ حضرت شاہ صاحب وقت پر پہنچے شیخ طیب نے دوران گفتگو حضرت شاہ صاحب سے دریافت کیا، آنجناب عربی میں تقریر پر قابو یافتہ ہیں، شاہ صاحب نے ازراہ تواضع فرمایا ہاں ٹوٹے پھوٹے انداز میں کچھ بول لیتا ہوں اس کے بعد انھوں نے کہا بہت سے علماء علمی تبحر اور حل دقائق کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن بعض معقولی مسائل کی تشریح اچھی طرح نہیں کر پاتے کہ اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے، جیسے کہ ''مسئلہ تجدد امثال'' ہے کہ اشاعرہ اعراض میں اس کے قائل ہیں مگر جواہر میں اس کو جائز نہیں سمجھتے اس مسئلہ کی تحقیق اور دونوں صورتوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

حضرت شاہ صاحب نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ عربی میں اس مسئلہ پر تقریر فرمائی جسے سن کر مجلس میں موجود فضلاء عرب دنگ رہ گئے اور مسئلہ زیر گفتگو کی تحقیق میں ایسے دقیق نکات اور عمیق تدقیقات بیان فرمائیں کہ شیخ طیب نے اسے غنیمت کبریٰ خیال فرمایا۔ اور اس کے بعد پھر کبھی حضرت شاہ صاحب کے سامنے کسی علمی مسئلہ کو نہیں چھیڑا۔

ایک اور علمی سوال اور اس کا حل

مدینہ منورہ کے زمانہ قیام میں ایک عالم نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی تصنیف غنیۃ الطالبین کی ایک عبارت پر جو حنفیہ سے متعلق ہے اشکال پیش کیا اور اس کے حل کے طالب ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے تحریری طور پر اس کا ایسا جواب دیا جسے وہاں کے سارے علماء نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا شاہ صاحب نے اس مسئلہ سے متعلق تحریر فرمایا:

تفصیل اشکال

ایک صاحب نے حضرت امام الطریقہ قطب الحقیقہ شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے قول کے بارے میں سوال کیا کہ شیخ جیلانی قدس سرہ نے غنیۃ الطالبین میں فرقہ غیرناجیہ کی قسمیں بیان کرتے ہوئے مرجیہ کے بارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے جن میں احناف کو بھی شمار کیا ہے، پھر مرجیہ کے ان بارہ فرقوں کی تفصیل کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ حنفیہ ابوحنیفہ نعمان کے متبع ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان اقرار وتصدیق ہے یعنی اللہ اوراس کے رسول ......اور رسول جو کچھ منجانب اللہ لاتے ہیں کو ماننا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا جیسا کہ برہوتی نے کتاب الشجرہ میں لکھا ہے۔

حضرت شیخ جیلانی قدس سرہ کی اس عبارت پر دو اشکال وارد ہوتا ہے، اول یہ کہ جن حضرات علماء کے قول پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حنفیہ اہل سنت میں سے ہیں، لہٰذا انھیں فرقۂ مرجیہ میں شامل کرنا اوران کی تضلیل وعدم نجات کا قائل ہونا کیونکر درست ہے؟

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس عقیدہ کی بنا پر فرقۂ مرجیہ کو مرجیئہ کہا جاتا ہے اسے بیان کرنے کے بعد شیخ نے احناف کو بھی مرجیئہ کے زمرہ میں شمار کیا ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ حنفیہ بھی اسی عقیدہ کو مانتے ہیں جس کے مرجیئہ قائل ہیں جبکہ واقعہ ایسا نہیں ہے، چنانچہ خود شیخ جیلانی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ مرجیئہ کا خیال ہے کہ جس مکلّف نے بھی لاالٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیا اسے کوئی بھی گناہ ضرر نہیں پہنچا سکتا اور نہ وہ دوزخ میں جائے گا اور بلا ریب حنفیہ اس عقیدہ سے بری اور پاک ہیں۔

جواب اشکال

اس کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ ارجاء کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کے ارجاء کا قائل اہل سنت سے خارج ہو جاتا ہے، دوسری قسم کے قائل ہونے سے اہل سنت سے خروج

نہیں ہوتا، پہلے ارجاء کی تعریف یہ ہے کہ اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ جس نے بھی زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کر لی اسے کبھی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا، دوسرے ارجاء کی تعریف یہ ہے کہ اس بات کا معتقد ہونا کہ عمل داخل ایمان نہیں ہے البتہ ثواب وعقاب اعمال پر مرتب ہونگے، اول ارجاء والوں کی تخطیہ و تضلیل پر صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے، اور ارجاء ثانی کے تخطیہ پر سلف کا اجماع ظاہر نہیں ہوا، بلکہ اس باب میں دلائل متعارض ہیں بہت سی آیات واحادیث اور آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان عمل سے الگ ایک شئی ہے اور بہت سے دلائل میں قول وعمل کے مجموعہ پر ایمان کا اطلاق ہوا ہے۔

اور درحقیقت یہ ایک لفظی نزاع ہے کیونکہ (جو حضرات عمل کو ایمان میں داخل نہیں مانتے اور جو حضرات قول وعمل کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں) دونوں فریق کا اس پر اتفاق ہے کہ گنہ گار ایمان سے خارج نہیں ہوتا ہاں عقاب وعذاب کا مستحق ہے، پھر جن دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان قول وعمل کا مجموعہ ہے، ادنیٰ توجہ سے انھیں ظاہر معنی سے پھیرا جا سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اسی دوسری قسم کے ارجاء کے قائل ہیں اور کبار اہل سنت میں ہیں بلکہ امام اہل سنت ہیں، البتہ ان کے متبعین اور اہل مذہب میں مختلف رائے کے لوگ پیدا ہوئے، بعض ان میں معتزلی عقیدہ کے تھے جیسے جبّائی، ابو ہاشم، زمخشری وغیرہ اور بعض مرجیئہ تھے اور بعض ان کے علاوہ اور یہ سب صرف فروع میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے تابع تھے اصول اعتقادیہ میں ان سے الگ تھے لیکن اپنے فاسد عقیدہ کو (اس کی تشہیر و تائید کی غرض سے) امام صاحب کی جانب منسوب کرتے تھے، نیز امام صاحب کے بعض اقوال سے (غلط طور پر) تمسک کرتے تھے جب حنفیہ میں سے اہل حق مثلاً طحاویؒ وغیرہ کو اس فتنہ کا ادراک ہوا تو انھوں نے اصول اعتقادیہ میں امام صاحب کے مذہب کو واضح کیا، اور مبتدعین نے جو غلط باتیں (تلبیساً) ان کی جانب منسوب کردی تھیں انھیں دفع کیا، ان امور سے وہ علماء واقف ہیں جن کے مطالعہ سے تمام مذاہب کی مصنفات گذر چکی ہیں۔

ان مقدمات کی تمہید کے بعد عرض ہے کہ شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے فرقۂ ضالہ میں

(گمراہ فرقہ) ان اہل ارجاء کا ذکر کیا ہے جو اہل سنت سے خارج ہیں، اسی بناء پر ان کی وجہ تسمیہ میں ان کے عقائد کو بیان کیا ہے اور اس فرقہ میں حنفیہ میں سے ان لوگوں کو داخل کیا ہے جو فروع میں امام ابوحنیفہ کی اتباع کرتے ہیں اور (غلط) دعویٰ کرتے ہیں کہ امام صاحب ان کے ہم عقیدہ ہیں، اس کے بعد امام صاحب کے اقوال میں سے اس قول کو نقل کیا ہے جس سے یہ گمراہ لوگ (امام صاحب سے عقیدہ میں اپنی موافقت پر) استدلال اور تمسک کرتے ہیں، یعنی امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایمان نام اقرار کا ہے۔

اس تقریر سے شیخ جیلانیؒ پر وارد دونوں اعتراض پا در ہوا ہو گئے اور واضح ہو گیا کہ شیخ جیلانیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کو (عقیدہ مرجیئہ سے) متہم نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے اس کی نسبت ان مرجیئوں کی جانب کی ہے جو فروع میں اپنے آپ کو امام صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور ان کے ظاہر اقوال سے اپنے فاسد عقیدہ پر تمسک کرتے ہیں اور امام صاحب کے اقوال کو غلط معنی پہناتے ہیں، والحمد للہ علی ما انعم باظہار الحق۔

روایت حدیث کی اجازت

آغاز تعلیم و تحصیل ہی سے حضرت شاہ صاحب کو علم حدیث سے قلبی تعلق تھا، چونکہ مدینہ طیبہ حدیث پاک کا منبع و مرکز ہے اس لئے آپ کا ارادہ ہوا کہ کسی عالی سند شیخ سے کتب حدیث کی روایت اور سند حاصل کی جائے (اس وقت) شیخ ابوطاہر کردی مدنی (جو ایک معمر اور جامع علوم صوفی و محدث تھے) سے عالی سند مشائخ حرمین میں سے کوئی نہیں تھا اس لئے شاہ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی طلب و خواہش کا اظہار کیا اور مکمل صحیح بخاری پچاس مجلسوں میں کچھ قرأۃً اور کچھ سماعاً پوری کر لی اور کامل مسند دارمی مسجد نبوی میں محراب عثمانی کے قریب آٹھ مجلسوں میں سماعاً پڑھی اور بقیہ کتب حدیث کے اوائل پڑھ کر اجازت لی، اثناء درس میں (کبھی کبھی) شیخ مشکل و غامض احادیث کے معانی کی تحقیق شاہ صاحب سے دریافت کرتے تو بلا تامل فوراً شاہ صاحب ایسی عمدہ تحقیق بیان کرتے کہ شیخ حیرت میں پڑ جاتے کہ اس نوعمری میں یہ علوم و معارف کس طرح سے حاصل ہو گئے۔

ختم بخاری کے دن شیخ نے خوشی میں اپنی جانب سے دعوت کا اہتمام کیا اور اس موقع پر شیخ نے شاہ صاحب کی بیحد عزت افزائی اور توقیر فرمائی، آخر میں جب شاہ صاحب کے بعض اسرار باطنی ان پر ظاہر ہوگئے تو اس وقت سے شاہ صاحب کے عقیدت مند ہوگئے اور استاذ و شیخ ہوتے ہوئے شاہ صاحب کے ساتھ شاگردوں جیسا معاملہ فرماتے اور تصوف وغیرہ کے بعض اشکالات جوان کے والد سے (حالانکہ وہ یکے از علماء محققین تھے) بھی حل نہ ہو سکے تھے شیخ صاحب نے ان کے حل وکشف کی فرمائش کی جنھیں شاہ صاحب نے تشفی بخش طور پر حل کردیا (شاہ صاحب کے ان علمی و احسانی کمالات کے مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر شیخ غایت درجہ شاہ صاحب کا اکرام کرتے تھے) اور جب شاہ صاحب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان پر نظر پڑتے ہی سروقامت کھڑے ہو جاتے خود اپنے ہاتھ سے فرش درست کرکے تکیہ رکھتے اور پورے جذبۂ توقیر و تعظیم کے ساتھ شاہ صاحب کو بٹھاتے اور خود شاگردوں کی طرح سامنے بیٹھتے۔

اظہار تواضع واعتراف کمال

آخر میں جب شاہ صاحب نے شیخ سے تحریری اجازت نامہ کی درخواست کی تو فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو اجازت نامہ تحریر کروں، میں نے تو خود آپ سے استفادہ کیا ہے، لیکن جب شاہ صاحب کی شدّت اشتیاق کو محسوس فرمایا تو اجازت نامہ تحریر فرمادیا اور اس میں بھی واضح طور پر اسی پہلی بات کا اعتراف و اظہار فرمایا، چنانچہ اجازت نامہ میں رقم بعض اشعار جو اس بات کے مظہر ہیں درج کئے جاتے ہیں:

(۱) اجزتك لكن مثلكم من يجيزني   ولم تستفد منّي ولكن تفيدني
(۲) واكثرما استفادني انت في غنى   عنه بل في جلّه انت فقتني
(۳) فكم حكمة منكم تلقنتها ولم   تستفد معسار ما قد افدتني
(٤) وما كنت اهلا ان اجيزك انما   دعوت فلبيت النداء اذ دعوتني(۱)

(۱) ان اشعار کی کتابت میں بے پناہ غلطیاں ہیں غور وفکر کے بعد صحیح نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

ترجمہ: (۱) میں نے آپ کو اجازت دی لیکن آپ جیسے (صاحب کمال) تو وہ ہیں جو مجھے اجازت دیتے ہیں، آپ نے مجھ سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ مجھے فائدہ پہنچایا ہے۔

(۲) اکثر وہ علوم وآداب جو آپ نے مجھ سے حاصل کئے ہیں آپ کو ان کی چنداں احتیاج نہیں بلکہ ان کے اکثر میں آپ مجھ پر فائق ہیں۔

(۳) بہت ساری حکمتیں ہیں جنھیں میں نے آپ سے سیکھیں، آپ نے اس کا دسواں حصہ بھی مجھ سے حاصل نہیں کیا جس قدر فائدہ آپ نے مجھے پہنچایا۔

(۴) میں آپ کو اجازت دینے کا اہل نہیں تھا، بات تو صرف اتنی ہے کہ آپ نے مجھ کو آواز دی تو میں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔

مختلف سلاسل تصوف کی اجازت

شیخ ابوطاہر کردیؒ نے متعدد سلسلۂ تصوف یعنی شطاریہ، سہروردیہ، شاذلیہ، رفاعیہ، حدادیہ وغیرہ کی اجازت سے بھی شاہ صاحب کو مشرف فرمایا (ان جملہ سلاسل میں شیخ اپنے والد شیخ ابراہیم کردی قدس سرہ سے مجاز تھے، شیخ ابراہیم کردیؒ اپنے زمانہ کے مشاہیر صوفیا اور محدثین میں سے تھے) اور منبر نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قریب اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کو خرقہ کلاہ پہنایا۔

ایک رسالہ کی تالیف

(قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دن شاہ صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کے رسالہ رد روافض فارسی کا تذکرہ اپنے شیخ حدیث شیخ ابوطاہر جمال الدین محمد مدنی کردی کورانی سے کیا تو شیخ نے اس کی تعریب کا حکم دیا) چنانچہ شیخ کی حسب مرضی شاہ صاحب نے ترجمہ کر کے مزید فوائد کا اضافہ کر کے ایک رسالہ بنام المقدمه السنية فى الانتصار للفرقه السنية مرتب کردیا، جس کی فصاحت وبلاغت کو دیکھ کر علماء عرب متحیر رہ گئے، شیخ نے وہ رسالہ کاتب حروف (شیخ محمد عاشق پھلتی) سے نقل کرا کرا اپنے پاس رکھ لیا۔

شاہ صاحب کا ایک دوسرا رسالہ بنام ”القول الجلیل فی بیان سواء السبیل“ جو سلسلۂ قادریہ، نقشبندیہ اور چشتیہ کے اشغال کے بیان میں ہے، علاوہ ازیں شاہ صاحب کو اس زمانہ میں حضرت رسالت مآب ...... کی جانب سے جو اسرار و مشاہدات حاصل ہوئے تھے، اور شاہ صاحب نے انھیں قلم بند کرلیا تھا، یہ دونوں رسالے شیخ نے خود اپنے قلم سے نقل کر کے حضرت کو سنایا۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ کو واپسی اور بوقت واپسی شیخ کا اکرام

جب شاہ صاحب شیخ سے رخصت ہوکر عازم مکہ معظّمہ ہوئے تو شیخ نے گھر سے نکل کر کافی دور تک مشایعت فرمائی، شیخ کے فرزند اور دیگر اعزہ تین کوس تک حضرت شاہ صاحب کے ہم رکاب رہے، راستے میں شاہ صاحب جب کسی جگہ (برائے استراحت) بیٹھتے تو یہ حضرات اپنے کپڑے حضرت کے پیر پر ڈال دیتے اور بوقت رخصت فیضِ صحبت سے محرومی پر اظہار تاسف کیا۔

مکہ معظّمہ میں دوبارہ حاضری

مدینہ منورہ سے چل کر ۱۵؍شعبان ۱۱۴۴ھ کو دوبارہ مکہ معظّمہ پہنچے، سب سے پہلے عمرہ فرمایا، ماہ رمضان میں بھی متعدد عمرے کئے اور ماہ رمضان کے اخیر عشرہ میں مسجد حرام میں بمواجہ بیت اللہ اعتکاف فرمایا، مکہ معظّمہ میں جب تک قیام رہا وہاں کے لوگ آپ سے فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے، اسی وقفہ قیام میں رسالہ فیوض الحرمین تالیف فرمایا اور حرمین شریفین میں جو حقائق و دقائق اور غوامض و اسرار منکشف ہوئے تھے سب اس رسالہ میں درج کیا۔

بعض تصانیف کی شہرت ومقبولیت

شاہ صاحب کے دو رسالے ”القول الجلیل فی بیان سواء السبیل“

اور"المقدمة السنيّه فى الانتصار للفرقة السُنيه" حرمین شریفین میں خوب مشتہر ہوئے، القول الجلیل کو دیار مغرب اور بصرہ مصر، فلاّن وغیرہ کے علماء نقل کر کے لے گئے اور شاہ صاحب سے اس کی اجازت بھی لی، المقدمۃ السنیہ تا تارتک پہنچا، رسالہ فیوض الحرمین بھی بعض مخصوص حضرات کو عنایت ہوا۔

شاہ صاحب کی والدہ محترمہ کی وفات

مجاورت بیت اللہ کے زمانہ میں بندہ سے کئی بار فرمایا کہ جب کبھی گھر کی جانب توجہ ہوتی ہے تو یک گونہ غم واندوہ کی تیرگی اور خانگی انتظام میں انتشار کی کیفیت محسوس ہوتی (اس گفتگو پر) چند ہی دن گذرے تھے کہ شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ کی وفات کی خبر پہنچی، اس موقع پر اکابر مکہ نے مراسم تعزیت ادا کیئے، بعد میں شاہ صاحب نے فرمایا وہ تیرگی جو محسوس ہو رہی تھی اس کا سبب یہی (والدہ کی وفات) تھا۔

وطن کی واپسی

(چودہ ماہ حرمین شریفین میں گذار کر وہاں کے فیوض ظاہری وباطنی سے مالا مال ہوکر) وطن واپسی کا ارادہ ہوا، جہاز پر سوار ہوئے تو پھر بفضلہٖ تعالیٰ ہوا موافق وسازگار رہی، اور صرف ۲۳ دن میں جدہ سے چل کر بندر سورت پر پہنچ گئے، چند دن سورت میں قیام فرما کر براہ دکن سوئے وطن روانہ ہوئے، راہ میں جس شہر سے بھی گذر ہوا وہاں کے علماء ومشائخ نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔

گوالیار پہنچے تو شیخ خانون اور شیخ محمد غوث قدس سرہما کے مزارات پر گئے، اور ایصال ثواب کیا، اسی طرح جب اکبرآباد پہنچے تو شیخ امیر ابوالعلاؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور ان کے برکات وحسنات کا تذکرہ فرمایا، وہاں سے چل کر ۱۴/رجب ۱۱۳۵ھ کو باخیر وخوبی دار الخلافہ شاہ جہاں آباد (دہلی) میں شرف نزول فرمایا، وطن سے روانگی اور واپسی دونوں کی تاریخیں خود شاہ صاحب نے یوں نظم کی ہے۔

تاریخ روانگی:

زدہلی برآمد ولی بہر حج ☆ بہشتم صباح از ربیع دویم
ہزار و صد و چہل وسہ سال بود ☆ کہ ایں داعیہ گشت بافعل ضم

تاریخ واپسی:

ولی چوں پس از حج بدہلی رسیدہ ☆ سرآمد سفر منقطع گشت رنج
بتاریخ رابع عشر از رجب ☆ نہ سال ہزار و صد و چہل وپنج

آپ کے برادر خورد شاہ اہل اللہ دہلوی نے پہلے حج کی تاریخ یوں نظم کی ہے۔

بدل می داشتم عمرے کہ دراحرام حج کوشم
بحمداللہ والمنۃ بداں مقصد ہم آغوشم
زہاتف سال تاریخش نخستیں طوف می جستم
قبلت منک طاعاتک رسید از غیب درگوشم

☆ ☆ ☆

قافلۂ فضل وکمال یعنی
حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی
صدر مدرس اوّل دارالعلوم دیوبند کے
مشاہیر تلامذہ

مولانا کی مختصر سوانح

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بن مولانا مملوک علی ۱۳؍صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ قرآن کریم وطن ہی میں حفظ کیا محرم ۱۲۶۰ھ میں حضرت مولانا مملوک علی انھیں اور حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کو بغرض تعلیم وتحصیل دہلی لے گئے۔ دہلی کالج اور گھر پر اپنے والد بزرگوار سے علوم وفنون کی تحصیل کی اور حدیث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجدّدی رحمہما اللہ سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد بھی ایک سال تک دہلی میں قیام رہا بعد ازاں بمشاہرہ چالیس روپئے ماہانہ گورنمنٹ کالج اجمیر میں ملازمت کرلی اور ۵ سال تک وہاں رہے۔ اس کے بعد سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز ہوئے، لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء کی بنا پر جلد ہی اس عہدہ سے مستعفی ہوکر میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں ملازمت کرلی۔ جب ۱۵؍محرم ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو مولانا اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ ۱۹ سال تک یہ خدمت جلیلہ انجام دیتے رہے۔ اس مدّت میں تقریباً ۱۵۱ طلبہ نے آپ سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی سے بیعت تھے اور سلوک و تصوف کی راہیں انھیں کی زیرِ نگرانی طے کیں — مولانا پر بالعموم جذب و کیف کی حالت طاری رہتی تھی۔ سراپا عجز و انکسار تھے۔ دنیا اور علائق دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مولانا کے حلقۂ درس کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

حلقہ درس کیا ہوتا تھا حلقۂ توجہ ہوتا تھا یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے۔ آیت کا مطلب بیان کر رہے ہیں اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں۔" (اشرف السوانح ج ۱ ص ۳۳)

اسباق میں عجیب و غریب مضامین اور لطائف بیان ہوتے تھے حضرت تھانویؒ نے زیادہ تر علوم عجیبہ و غریبہ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ہی سے اخذ کئے تھے اور نہایت لطف لے لے کر انھیں مولانا کے حوالہ سے بیان کرتے تھے۔

۳ر ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۱ر دسمبر ۱۸۸۴ء کو بمرض ہیضہ وطن مالوف نانوتہ میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔(۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ۱۵۱ تلامذہ کی فہرست میں جن حضرات کے حالات اس وقت تک دستیاب ہو سکے ہیں۔ سن وفات کی ترتیب کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہیں۔ اور اہل علم و نظر سے گذارش ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

(۱) حضرت مولانا فخر الحسنؒ گنگوہی

حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ کا وطن گنگوہ تھا ۱۲۸۴ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۰ھ میں حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کی رفاقت میں تکمیل کی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے علاوہ انھوں نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے بطور خاص استفادہ کیا۔ اور بالعموم سفر و حضر میں حضرت کے ساتھ رہتے تھے۔ مناظرہ سے خاص دلچسپی تھی۔ تقریر دلچسپ اور شیریں ہوتی تھی مزاج میں ظرافت تھی اس کے باوجود حق گوئی کا

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۸۸، تاریخ دیوبند ص ۴۴۴۔

دامن ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیتے تھے۔ حکیم محمود خاں سے دہلی میں طب کی تحصیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد خورجہ کے مدرسہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ پھر مدرسہ عبدالرب دہلی میں منتقل ہوگئے۔ آخر میں کانپور میں سکونت اختیار کرلی تھی وہیں ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا فخر الحسن صاحب مطب کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی رکھتے تھے۔ مباحثہ شاہجہانپور کے علاوہ التعلیق المحمود حاشیہ سنن ابی داؤد، حاشیہ ابن ماجہ، حاشیہ تلخیص المفتاح آپ کی علمی یادگار ہیں۔ آپ نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کی ایک مفصّل سوانح حیات بھی لکھی تھی مگر وہ کانپور میں نذر آتش ہوگئی۔ (۱)

(۲) مولانا فتح محمّد تھانوی

قیام دارالعلوم کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۸۵ھ میں فارغ ہوئے۔ مولانا دارالعلوم میں تعلیم وتحصیل کے ساتھ تدریس کا خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد اپنے وطن مالوف میں مدرسہ حوض والی مسجد میں مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا فتح محمد فضلاء دارالعلوم کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی سے بھی حظِّ وافر رکھتے تھے اور صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا یگانۂ روزگار عالم ومجدد آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہے۔ حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی شرح حزب البحر فارسی کا آپ نے سلیس اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۲)

(۳) مولانا امیر باز خاں مظفر نگری

۱۷ر جمادی الآخر ۱۲۵۸ھ کو بھوج پور ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے ۱۲۸۳ھ کی ابتداء میں داخل ہوئے۔ سال اوّل میں شرح وقایہ، نورالانوار، مسلم شریف، میبذی، شرح عقائد نسفی، مقامات حریری اور سبعہ معلقہ کی تحصیل کی۔

(۱) تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۸ مطبوعہ ساہیوال پاکستان، نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۳۵۴۔

(۲) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۵۳

تعلیم کے ساتھ دارالعلوم میں ابتدائی کتابوں کا درس بھی دیتے رہے۔
شیخ عبدالرحیم سہارنپوری خلیفہ شیخ عبدالغفور صواتی المعروف بہ اخوند صاحب سے بیعت کا شرف حاصل تھا استدراک الامیر من الاسرار اللطیف الخبیر کے نام سے اپنے مکاشفات کو جمع کیا تھا جو ہلالی پریس ساڈھورہ میں طبع ہوا ہے۔ جامعہ سہارنپور میں بحیثیت واعظ کے مولانا کا تقرر ہوگیا تھا۔ حضرت مولانا محمد مظہر صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور کے زمانۂ صدارت میں دو مرتبہ قائم مقام صدر مدرس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۹/ربیع الآخر ۱۳۲۵ھ کو راہیٔ عالم جاودانی ہوئے۔(۱)

(۴) مولانا منفعت علی دیوبندی

مولانا منفعت علی بن بلند بخش دیوبندی کی ولادت اور نشو ونما دیوبند میں ہوئی ۱۲۸۴ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوکر ۸/سال میں تمام علوم متداولہ کی تحصیل کر کے ۱۲۹۲ھ میں سند فراغ حاصل کی حضرت مولانا یعقوب نانوتوی کے علاوہ مولانا سیّد احمد دہلوی اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے بھی تحصیل علم کی۔ فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں مدرس ہوگئے اور ۱۳۱۸ھ تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دے کر مدرسہ فتح پوری دہلی میں چلے گئے پھر وہاں سے مدرسہ جامع العلوم کان پور میں منتقل ہوگئے۔ ہیئت، ہندسہ، حساب، فقہ اور فرائض میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ فن فرائض میں بزبان اُردو آپ کا ایک مفصل رسالہ ہے۔ ۷/ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ کو کانپور میں فوت ہوئے۔(۲)

(۵) مولانا احمد حسن امروهوی

امروہہ کے مشہور خاندان سادات سے تعلق تھا۔ ۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم امروہہ ہی میں حاصل کی اور طب بھی امروہہ ہی میں حکیم امجد علی خاں سے پڑھی پھر دارالعلوم میں داخلہ لیا اور مولانا یعقوب صاحب وغیرہ اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ خصوصی طور پر حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے بھی استفادہ کیا۔ درس وتقریر

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۷ و تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۴۔

(۲) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۸۲ و مختصر تاریخ دارالعلوم ص ۱۰۸، تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۴۔

میں حضرت نانوتوی کے علوم و معارف نہایت دلنشین انداز میں بیان کرتے تھے۔ فراغت کے بعد اوّلاً خورجہ کے مدرسہ میں درس دیا پھر سنبھل اور دہلی کے مختلف مدارس میں صدر مدرس رہے اور جب ۱۲۹۶ھ میں مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد قائم ہوا تو اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی سے الگ ہوکر اپنے وطن امروہہ کے ایک قدیم مدرسہ جامع مسجد امروہہ کی نشأۃ ثانیہ کی اور اس سے اس درجہ تعلق خاطر ہوا کہ مرنے کے بعد بھی اس سے جدا نہیں ہوئے (۱)

مولانا امروہی کی درسی تقریر نہایت جامع، سلیس اور پُر مغز ہوتی تھی۔ قاسمی علوم کے امین اور مجسم تصویر تھے۔ سینکڑوں تشنگانِ علوم نبوی آپ کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ مولانا امروہی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ یوں تو مولانا تمام علوم مروجہ میں کامل مہارت رکھتے تھے لیکن حدیث، تفسیر اور فقہ کی جانب رجحان طبع زیادہ تھا۔ ۱۳۲۹ھ میں مؤتمر الانصار (تنظیم فضلاء قدیم دارالعلوم) کا جو پہلا جلسہ مرادآباد میں ہوا وہ مولانا امروہوی ہی کی صدارت میں ہوا تھا۔

۲۸/ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں بمرض طاعون انتقال فرمایا اور اپنے لگائے ہوے چمنستانِ علم مدرسہ جامع امروہہ کے صحن کے جنوبی گوشے میں آسودۂ خواب ہیں۔ حضرت مولانا امروہیؒ کے قلمی آثار میں صرف مضامین کا مجموعہ افادات احمدی کے نام سے شائع ہوسکا ہے بقیہ تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکیں۔

(۶) مولانا احمد ہزاروی

حضرت مولانا احمد بن مولانا عبداللہ بن شاہ ولی کالنجر تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش کا علم باوجود تلاش وجستجو کے نہ ہوسکا۔ درس نظامی کی اکثر کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم کیلئے دیوبند حاضر ہوئے اور یہاں داخلہ لے کر ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی و دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ مسجد چھتہ میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم

(۱) نزہۃ الخواطر ۸ ص ۴۱، تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۸۹۔

صاحب نانوتوی صاحب سے بھی قدرے استفادہ کیا۔ ۱۷ر شوال ۱۲۹۸ھ کو حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی دیو بندیؒ کے ساتھ آپ کی دستار بندی ہوئی۔

اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ مولانا احمد صاحب نے حضرت مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی سے بھی کسبِ فیض کیا۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد تدریسی مشغلہ شروع کیا اوّلاً دارالعلوم دیو بند میں تقریباً چھ سال درس دیا، اس کے بعد وطن مالوف کی جانب مراجعت کی اور سکندر پور ضلع ہزارہ میں احمد المدارس کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیا درکھی اور تا مدّت العمر اپنے لگائے اسی چمنستانِ علم کی آبیاری کرتے رہے ہزارہ کے اکثر قدیم علماء آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔

۱۷ر صفر المظفر ۱۳۳۱ھ یوم یکشنبہ کو آپ کا وصال ہوا۔ اولاد میں ایک فرزند مولانا عبدالسلام صاحب اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں (۱)

(۷) مولانا محمد مراد فاروقی مظفر نگری

حضرت مولانا محمد مراد فاروقیؒ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء میں پاک پٹن کے ایک قریبی گاؤں امب میں پیدا ہوئے سلسلۂ نسب اٹھارہویں پشت میں حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ سے مل جاتا ہے۔ عمر کے ابھی صرف چار سال گذرے تھے کہ والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے، ماموں نے یتیم بھانجے کو ان کی والدہ کے ساتھ اپنے گھر لے جا کر اپنی نگرانی اور کفالت میں رکھا۔ سن شعور کو پہنچے تو ایک دن تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر ماموں کی سرزنش سے دلگیر ہو کر چپکے سے لاہور چلے آئے اور وہیں اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر یہاں سے دہلی پہنچے اور حافظ غلام رسول ویراں سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں علی گڈھ جا کر حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ پھر رام پور جا کر مولانا ارشاد حسین مجدّدیؒ سے بھی بعض کتابوں کی تحصیل کی۔ آخر میں دارالعلوم آئے اور یہاں پانچ سال رہ کر علوم مروجہ کی تکمیل کر کے ۱۲۸۸ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

(۱) مشاہیر علماء دیو بند ص ۳۲ ج ۲ و نزہۃ الخواطر ص ۳۸ ج ۸۔

مولانا محمد مراد صاحب اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت کی بنا پر اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے بیعت وخلافت سے بھی مشرف تھے۔۱۲۹۴ھ میں جب جامع مسجد حوض والی مظفر نگر میں مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے صدر مدرس منتخب ہوئے۔ اور اپنی پوری زندگی مدرسہ کی ترقی اور سر بلندی کے لئے وقف کردی اور تقریباً ۴۰ سال تک مسلسل اسی مدرسہ میں درس وتدریس اور طلبہ کی تعلیم وتربیت میں گذار کر ۳/رجب ۱۳۳۲ھ کو عین جمعہ کی اذان کے وقت راہی ملک بقاء ہوئے۔(۱)

(۸) مولانا سیّد محمد عِرفان ٹونکی

مولانا سیّد محمد عرفان بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم حسنی بریلوی ثم ٹونکی امام المجاہدین سیّد احمد شہید بریلویؒ کے نواسے تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی ابتدائی کتابیں اپنے دیار کے علماء مولانا عبدالغفور شیخ عبدالملک، شیخ عبدالمالک، اور قاضی امام الدین وغیرہ سے پڑھیں۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر اکتساب فیض کیا حدیث کی تحصیل مولانا مفتی عبدالقیوم بن عبدالحئ بڑھانوی سے کی — مولانا عامل بالحدیث تھے۔ لایعنی باتوں سے کلیتہً احتراز کرتے تھے۔ تلاوتِ قرآن حکیم سے خاص شغف تھا، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی(۲)

(۹) مولانا منصور علی خاں مرادآبادی

حضرت مولانا منصور علی بن مولانا حسن علی بن مولوی عبداللہ بن امان اللہ خاں مرادآبادی ہندوستان کے مشہور علماء میں سے تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے زمانہ صدارت ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ ایک عرصہ تک حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کے ساتھ سفر وحضر میں رہ کر

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ج۲ص ۱۸۶۔

(۲) مشاہیر دیوبند ص ۵۴۰، ج ۲۔

اکتساب فیض کرتے رہے۔ مولانا کا شمار حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ میں ہوتا ہے۔ حضرت مولانا احمد علی محدّث سہارنپوری سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد جامعہ طبیہ حیدرآباد میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ایک مدّت تک نہایت حسن وخوبی سے اس خدمت کو انجام دیا۔ آخر میں مکہ معظّمہ ہجرت کرکے چلے گئے تھے اور وہیں ۱۳۳۷ھ میں وفات پائی۔ قلمی آثار میں مذہب منصور ۲ جلدیں، فتح المبین اور معیار الادویہ آپ کی یادگار ہیں۔ (۱)

(۱۰) حضرت شیخ الهند مولانا محمود حسن دیوبندی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن بن مولانا ذوالفقار علی دیوبندی قدس سرہما کی ولادت ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۱۵÷ میں بریلی میں ہوئی۔ یہاں آپ کے والد ماجد سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ چھ برس کی عمر سے تعلیم وتحصیل کی ابتداء ہوئی۔ میاں جی منگلوری، اور میاں جی عبداللطیف سے قرآن پاک اور فارسی کی کتابیں پڑھ کر اپنے چچا اور دیوبند کے مشہور معلّم مولانا مہتاب علیؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ کو جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو دارالعلوم میں داخل ہوگئے اور تین سال دارالعلوم میں رہ کر ملاّ محمود اور مولانا یعقوب نانوتوی سے فقہ، اصول فقہ، ادب، بلاغت، منطق، فلسفہ وغیرہ پڑھ کر ۱۲۸۶ھ میں صحاح ستّہ اور بعض دیگر کتابیں حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ سے شروع کیں اور سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہ کر دو سال میں تعلیم کو مکمل کیا۔

زمانۂ تعلیم ہی سے حضرت شیخ الہندؒ کا شمار حضرت نانوتوی کے ممتاز تلامذہ میں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی وفکری صلاحیتوں کے پیش نظر ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوگیا اور بتدریج ترقی کرکے ۱۳۰۸ھ میں شیخ الحدیث وصدارت تدریس کے منصب پر فائز ہوئے اور مسلسل ۱۳۳۳ھ تک حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی تدریس وترویج کی مبارک خدمت انجام دی اس مدّت میں ۸۶۰ طلبہ نے آپ سے حدیث کی تحصیل کرکے سند واجازت حاصل کی۔

(۱) تاریخ دارالعلوم ص ۱۹۰ ج ۲ ومشاہیر دیوبند ص ۱۰۳، ج ۱۔

حضرت شیخ الہند کو تدریس سے انتہائی شغف تھا۔ صحت وسہولت سے بے نیاز ہوکر نہایت جانفشانی اور تندہی کے ساتھ درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے اور حلقہ درس کیا ہوتا تھا سلف صالحین واکابر محدثین کا نمونہ ہوتا تھا۔

چونکہ ہوش سنبھالتے ہی آپ اس تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے جس کی ضرورت کا احساس ۱۸۵۷÷ کی جنگ شاملی کے بعد اکابر دیوبند کے قلوب میں منجانب اللہ پیدا ہوچکا تھا اور جس کا مظہر اتم دارالعلوم دیوبند کی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوا تھا۔ اس لئے انھیں تعلیم وتدریس کی مصروفیات کے ساتھ تحریک احیاء ملت کی قیادت کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے جس کے لئے کبھی آپ نے ثمرۃ التربیت قائم کی اور کبھی اپنے شاگرد رشید مولانا عبیداللہ سندھی کے ذریعہ جمعیۃ الانصار کی داغ بیل ڈالی۔ اور کبھی تحریک ریشمی رومال کے ذریعہ سامراجی طاقتوں کی صف میں ہلچل مچادی۔ یہ سرگرمیاں اس قدر دقت طلب بنیں کہ حضرت شیخ الہندؒ اطمینان ویکسوئی کے ساتھ تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ نہ ہوسکے پھر بھی سیکڑوں تلامذہ اور یادگار زمانہ ملّی وسیاسی خدمات کے علاوہ تقریباً ایک درجن تالیفات بھی اپنی یادگار چھوڑیں جو یہ ہیں۔

(۱) ادلۂ کاملہ (۲) ایضاح الادلّہ (۳) احسن القریٰ (۴) الجہد المقل (۵) افاداتِ محمودیہ (۶) الابواب والتراجم (۷) کلیات شیخ الہند (۸) حاشیہ مختصر المعانی (۹) تصحیح ابی داؤد شریف (۱۰) ترجمہ قرآن پاک وحواشی (۱۱) تقریر ترمذی (۱۲) فتاویٰ (۱)

(۱۱) مولانا ناظر حسن دیوبندی

مولانا ناظر حسن ابن امیر بخش بن ظہور عالم دیوبندی اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے۔ آپ کی ولادت اور نشو ونما دیوبند میں ہوئی دارالعلوم کے اساتذہ مولانا محمد یعقوب وغیرہ سے پڑھ کر ۱۲۹۶ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے بھی کسب فیض کیا۔ تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ

(۱) حضرت شیخ الہند کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے حیات شیخ الہند، شیخ الہند حیات وکارنامے، اسیرانِ مالٹا، علماءحق وغیرہ۔

میں ایک مدّت تک تدریسی خدمات انجام دیں اس کے بعد ۱۳۳۸ھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں آپ کا تقرر ہوا اور چند سال وہاں پڑھانے کے بعد مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے پرنسپل مقرر ہوئے ڈھاکہ ہی میں ۱۳۴۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ تصانیف میں الفرقان فی قرأۃ ام القرآن اور کشف انعطاء عن مسئلۃ الربو، آپ کی علمی یادگار ہیں۔(۱)

(۱۲) مولانا عبدالحق پورقاضوی

پورقاضی مظفرنگر کے شمال میں شرفاء کی ایک قدیم بستی ہے وہیں تقریباً ۱۲۵۸ھ میں مولانا کی ولادت ہوئی ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور تین سال یہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۲۸۶ھ میں فراغت حاصل کی ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم کے سب سے پہلے جلسۂ دستاربندی میں حضرت شیخ الہند وغیرہ ممتاز فضلاء کے ساتھ آپ کی دستار بندی ہوئی۔ فراغتِ تعلیم کے بعد ریاست رتلام میں کاؤنٹینٹ جنرل مقرر ہوئے اور تادمِ واپسیں اسی عہدے پر فائز رہے۔ مولانا والیٔ ریاست کی نظر میں ہمیشہ معتمد اور قابل ستائش رہے، علماء سلف کا نمونہ تھے۔ آپ کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہرعلوم سہارنپور سے ہوئی تھی۔ صاحبزادی صاحبہ کو مولانا نے جو قیمتی نصیحتیں لکھ کر دی تھیں انھیں بعد میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے بہترین ''جہیز'' کے نام سے اپنی مشہور تالیف ''بہشتی زیور'' میں شائع فرمادیا۔ ۸/صفر ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳÷ کو رتلام میں وفات پائی۔(۲)

(۱۳) مولانا عبداللہ انبیٹھوی

مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے باشندہ تھے تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ اور اپنے وقت کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ وغیرہ سے پڑھ کر ۱۲۸۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد ایک مدت تک سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۴۹۱۔

(۲) تاریخ دارالعلوم ص ۱۸۵، ج ۲۔

سرہ کی خدمت میں رہ کر روحانی فیوض وبرکات حاصل کیے اور خلافت پائی۔

قصبہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں جب منشی مہربان علی مرحوم نے مدرسہ منبع العلوم قائم کیا تو اس کے صدر مدرس منتخب ہوئے پھر ۱۳۱۱ھ میں سرسید مرحوم نے انھیں ایم، اے، او کالج (مسلم یونیورسٹی) میں کام کرنے کی دعوت دی جہاں وہ آخر عمر تک ناظم دینیات کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا کا صحیح سن وفات معلوم نہیں۔ البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ ۱۳۴۴ھ سے پہلے آپ کی وفات ہوچکی تھی۔ حضرت مولانا عبدالحئی حسنیؒ نے نزہتہ الخواطر میں جو سن وفات تحریر فرمایا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اپنے آبائی قبرستان انبیٹھہ میں آسودۂ خواب ہیں حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کی بڑی صاحبزادی اکرام النساء انھیں سے منسوب تھیں(۱)

(۱۴) مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی

مولانا حکیم محمد حسن بن ذوالفقار علی دیوبندی حضرت شیخ الہندؒ کے برادر خورد تھے شروع سے آخر تک جملہ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کر کے حضرت مولانا یعقوب صاحب کے زمانۂ صدارت ۱۲۹۶ھ میں فراغت پائی۔ دینیات کی تحصیل کے بعد دہلی جا کر حکیم عبدالحمید خاں صاحب سے طب وحکمت کی تعلیم حاصل کی۔ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کا بھی شرف حاصل تھا۔ ۱۳۰۲ھ میں بحیثیت مدرس عربی وطبیب آپ کا دارالعلوم میں تقرر ہوا۔ اور طب کی تعلیم کے ساتھ تفسیر وحدیث وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں بھی پڑھاتے تھے۔ دارالعلوم میں ۴۳ سال تک علمی وطبی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۵/ربیع الاوّل ۱۳۴۵ھ کو سفر آخرت فرمایا۔

(۱۵) حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری

حضرت الحاج الحافظ المحدث مولانا خلیل احمد قدس سرہ کا آبائی وطن انبیٹھہ تھا جو ضلع سہارنپور کا ایک تاریخی قصبہ ہے اور سہارنپور کے جنوب میں گنگوہ جانے والی سڑک پر واقع ہے ۱۲۶۹ھ/۱۵۵۲÷ میں آپ کی ولادت ہوئی پانچ سال کی عمر میں اپنے نانا حضرت

(۱) تاریخ دارالعلوم ۸۶/۱۸۵، ج ۲۔

استاذ الکل مولانا مملوک علی سے بسم اللہ کی۔قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم وطن انبیٹھہ اور نانیہال نانوتہ میں پائی۔صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مولانا انصار علی سے گوالیار میں پڑھیں پھر یہاں سے واپس آکر مولانا سخاوت علی انبیٹھوی سے کافیہ تک نصاب مروجہ کی تحصیل کی بعد ازاں ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ چنانچہ حضرت مولانا کو دارالعلوم دیوبند سے جو سند دی گئی ہے اس میں ہے۔

''مولانا خلیل احمد ساکن انبیٹھہ نبیہ جناب مولانا مملوک علی صاحب مرحوم ۱۲۸۵ھ میں اس مدرسہ میں داخل ہوئے اس وقت کافیہ پڑھتے تھے قریب ایک سال کے عرصہ میں کتب مفصّلہ ذیل تحصیل کیں، کافیہ، شرح ملاجامی، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، مرقات، شرح تہذیب بعد اس کے بضرورت قرب وطن مدرسہ سہارنپور میں کتب درسیہ، حدیث، فقہ، تفسیر واصول وعقائد معانی ومنطق تکمیل کو پہنچائیں آخر ۱۲۸۹ھ میں پھر اسی مدرسہ میں آکر رسالہ میرزاہد شمس بازغہ، مقاماتِ حریری، دیوان متنبّی، حماسہ، وتاریخ یمنی میں کچھ پڑھا، استعداد درست اور ذہن وذکا خوب اور مناسب ہے۔ اخلاق واوضاع پسندیدہ اور مزاج سنجیدہ ہے الخ (۲۳؍ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ)

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد درس وافاضہ کی بزم سجائی اور منگلور، بھوپال، سکندرآباد، بھاول پور، بریلی، دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے شیخ ومرشد قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایماء پر مظاہر علوم سہارنپور تشریف لائے اور صدارتِ تدریس کے منصب پر فائز رہتے ہوئے پورے ۳۱ سال تدریس وتصنیف کے ذریعہ علوم دینیہ بالخصوص حدیث پاک کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

اس ۳۱ سالہ مدت میں ۳۹۱ طلبہ نے آپ سے حدیث کا درس لے کر سند واجازت حاصل کی جن میں مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سابق صدر مدرس مظاہر علوم، مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی وغیرہ

خاص شہرت واہمیت کے حامل ہیں۔

محدث سہارنپوری کا حافظہ نہایت قوی تھا ہزاروں حدیثیں مع سند کے آپ کو زبانی یاد تھیں درس میں کسی مسئلہ سے متعلق تمام علمی و مذہبی معلومات اپنے حافظہ سے فراہم کردیا کرتے تھے۔

علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطن میں بھی آپ کو کامل دستگاہ حاصل تھی سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی دونوں اکابر سے خلافت واجازت سے مشرف تھے۔ اور طالبین کی تزکیہ وتلقین میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی۔ ان خدمات کے ساتھ تصنیف، تالیف کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اور وقت کے اہم مسائل پر متعدد رسائل اور کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن کی فہرست یہ ہے۔

(۱) ہدایات الرشید فی افہام العنید (۲) مطرقۃ الکرامہ علی مرأۃ الامامہ (دو حصے) (۳) تنشیط الآذان فی تحقیق محل الاذان (۴) المہند علی المفند (۵) براہین قاطعہ علی ظلام الانوار الساطعہ (۶) اتمام النعم (۷) بذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤد، محدث سہارنپوری کی یہ وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جس کی ابتداء ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اور تکمیل حدیث کے منبع ومرکز مدینۃ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہوئی۔ پوری کتاب پانچ جلدوں میں ہے جن کے صفحات ۱۹۳۸ ہیں۔ اس ضخیم کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ آخر عمر میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور تقریباً دوسال جوار رسول ...... میں رہ کر ۱۵/ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو دار دنیا سے دار آخرت کو رحلت فرمایا اور دیرینہ خواہش کے مطابق جنت البقیع میں دفن کئے گئے (۱)

(۱۶) مولانا عبدالقدیر دیوبندی

مولانا عبدالقدیر صاحب کی ولادت اور نشو ونما دیوبند میں ہوئی۔ دیوبند کے مشہور

(۱) علماء دیوبند اور علم حدیث وتاریخ دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۸۶ وغیرہ تفصیلی حالات کے لئے تذکرۃ الخلیل ملاحظہ ہو۔

بزرگ حضرت شاہ رمزالدین متوفی ۱۱۲۲ھ کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۲۸۷ھ میں بغرض تعلیم دارالعلوم میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے تعلیم حاصل کر کے ۱۲۹۳ھ میں فارغ ہوئے۔ پھر علم حدیث میں اختصار پیدا کرنے کی غرض سے مظاہر علوم پہنچے اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔ سہارنپور میں آپ کے رفقاء درس میں حضرت مولانا منصور علی مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد علی مونگیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالقدیر صاحب کی پوری زندگی دین اور علوم دین کی خدمات میں گذری۔ ۱۳۰۷ھ سے ۱۳۰۹ھ تک آپ دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم بھی رہے۔ آخر میں منشی نولکشور لکھنؤ کے مطبع سے متعلق ہوگئے تھے جہاں کتابوں کے ایڈیٹ کرنے کے ساتھ عربی وفارسی کی اہم کتابوں کے ترجمہ کا کام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ علم الحیوانات میں علامہ کمال الدین دمیری کی مشہور تالیف حیات الحیوان کا دوجلدوں میں ترجمہ اسی زمانہ کی آپ کی علمی یادگار رہے۔ لکھنؤ ہی کے قیام میں پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا اور ۱۳۴۷ھ/ 1918÷ میں راہئ ملک بقا ہوئے۔(۱)

(۱۷) مولانا عبدالمؤمن دیوبندی

قصبۂ دیوبند کے مشہور علمی خاندان شیوخ عثمانی کے رکن رکین اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے برادر نسبتی تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۹ سال زیر تعلیم رہ کر ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی سے دورۂ حدیث پڑھا اور سند واجازت حاصل کی، چوتھے جلسۂ دستار بندی ۱۳۰۱ھ کے موقع پر حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کے ساتھ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی کے دست مبارک سے آپ کو دستار فضیلت حاصل ہوئی۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اہل میرٹھ کی طلب پر آپ میرٹھ تشریف لے گئے

(۱) تاریخ دارالعلوم ج ۲ ص ۱۸۸ و نیا دور کا منشی نول کشور نمبر۔

پھر یہ سرزمین اتنی پسند آئی کہ پوری زندگی وہیں گذاردی۔ کچھ دنوں مدرسہ قومیہ میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دے کر دارالعلوم صدر میرٹھ کی مسند صدارت کو زینت بخشی۔

مولانا عبدالمومن صاحب مرحوم بڑے ذکی، ذہین اور وسیع النظر عالم تھے، تفسیر وحدیث اور فقہ کی اکثر کتابیں آپ کو ازبر تھیں۔ اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کے طرز پر درس کی تقریر مختصر مگر جامع اور دلنشیں فرماتے تھے۔ بایں ہمہ جلالت علمی زندگی نہایت متوکلانہ گذارتے تھے، سلوک وتصوف میں بھی مولانا کو درجۂ کمال حاصل تھا۔

میرٹھ میں آپ سے علمی فیض خوب جاری ہوا، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مشہور عالم ومصنف نے از اوّل تا آخر مولانا عبدالمومن ہی سے اکتساب کیا تھا۔ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ اور مولانا سراج احمد میرٹھی بھی آپ ہی کے شاگرد تھے۔ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی ناظم اعلیٰ عالمی مؤتمر ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند کو بھی مولانا مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ۱۳۴۷ھ میں دہلی میں جہاں بغرض علاج مقیم تھے وفات پائی اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔

(۱۸) مولانا مفتی عزیزالرحمن عثمانی

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی بن حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے ۹؍سال کی عمر میں دارالعلوم کے شعبۂ تحفیظ القرآن میں داخل ہوکر حفظ کا آغاز کیا جس سے ۱۲۸۷ھ کو فراغت ہوئی اس کے بعد اُردو، فارسی وغیرہ کی تحصیل کر کے عربی تعلیم شروع کی اور از ابتداء تا انتہا دارالعلوم میں پڑھ کر ۱۲۹۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا عبدالعلی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۹۸ھ کے جلسۂ دستار بندی میں حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہیؒ نے دستار فضیلت سے مشرف کیا۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد مادر علمی دارالعلوم میں معین مدرس مقرر ہوگئے اور

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے دارالعلوم میں چند ماہ قیام کے بعد حضرات اساتذہ کی تجویز پر مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ ضلع میرٹھ تشریف لے گئے اور کئی سال تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۳۰۹ھ میں دوبارہ دارالعلوم آئے اور نیابت اہتمام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ایک سال تک کارہائے نیابت انجام دینے کے بعد آپ کو شعبۂ تدریس میں لے لیا گیا اور اسی کے ساتھ افتاء کی ذمہ داری بھی آپ ہی سے متعلق تھی۔ اس وقت سے مسلسل ۱۳۴۷ھ تک دارالعلوم میں رہ کر درس وافتاء کی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کو فتویٰ نویسی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ بڑے بڑے معرکتہ الآراء، سوالوں کا جواب قلم برداشتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ سفر میں بھی دارالافتاء کی ڈاک ساتھ رکھتے تھے اور بلا مراجعت کتب محض اپنی حذاقت ومہارت پر بے تکلف فتاویٰ تحریر فرماتے رہتے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہوتی تھی کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ لیتے تھے۔ اس خصوصیت میں حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی اور مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی کے علاوہ کوئی شریک نہیں ہے۔

حضرت مفتی صاحب ایک عالم اور فقیہ ہی نہ تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحب باطن بزرگ بھی تھے حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند کے خلیفہ خاص تھے۔ اور خود بھی بیعت وارشاد کا شغل رکھتے تھے۔ ہزارہا طالب خدا آپ کی تلقین و تربیت سے منزلِ مقصود تک پہنچے۔

۱۳۴۶ھ کی مشہور اصلاحی تحریک کے موقع پر حضرت محدثِ عصر مولانا انورشاہ کشمیری کے ہمراہ آپ بھی بہت سے دیگر اساتذہ دارالعلوم کی طرح اس وقت کے نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے تھے۔ ۱۳۴۷ھ میں جب حضرت محدث کشمیری علالت کی بناء پر ڈابھیل سے دیوبند چلے آئے تو ارباب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے اصرار پر حضرت مفتی صاحب وسط ربیع الثانی میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کے باقی ماندہ حصہ کی تکمیل کرائی۔ وہاں سے واپسی پر راستے میں

طبیعت علیل ہوگئی۔ دیو بند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہوا اور ۱۷/ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸÷ کی شب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا اصغر حسین محدث دیو بندی نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان قاسمی میں سپرد خاک ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب کو مستقل تصانیف کا موقع کم ملا۔ جلالین شریف کا ترجمہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ایک رسالہ میزان البلاغۃ کے حاشیہ کے علاوہ آپ کے لکھے ہوئے وہ فتاویٰ جو فتاویٰ دار العلوم کے نام سے اب تک ۱۷/ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں آپ کے قلمی آثار ہیں۔

(۱۹) مولانا حافظ محمد احمد قاسمی دیوبندی

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کے فرزند تھے ۱۲۷۹ھ/ ۱۸٦۲÷ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن کے بعد والد ماجد نے گلاوٹھی مدرسہ منبع العلوم میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ یہاں کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے اور حضرت نانوتوی کے تلمیذ رشید حضرت مولانا احمد حسن امروہی سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں اس کے بعد دیو بند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب وحضرت شیخ الہند وغیرہ سے کتب حدیث کی تحصیل کی بعد ازاں گنگوہ حاضر ہوکر حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی سے دورۂ حدیث کی تحصیل وتکمیل کے بعد سند واجازت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵÷ میں بحیثیت مدرس کے دار العلوم میں آپ کا تقرر ہوا ۱۳۱۳ھ میں اہتمام کی ذمہ داری آپ کو تفویض ہوئی۔ جو آخر عمر تک قائم رہی۔ حضرت حافظ صاحب کے دور اہتمام میں دار العلوم نے خوب ترقی کی اور بقول مصنف تاریخ دار العلوم ''ہر چند دار العلوم معنوی حیثیت سے دار العلوم بن چکا تھا مگر اپنی عمارتوں اور ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں مدرسہ سے دار العلوم بنا'' کار اہتمام کے ساتھ تدریس کا مشغلہ بھی آخر تک قائم رکھا بالعموم مشکوٰۃ شریف، جلالین، ابن ماجہ وغیرہ زیر درس رہتی تھیں — دینی ونسبی شرافت ووجاہت کے

ساتھ حافظ صاحب کو دنیاوی شان وشوکت بھی حاصل تھی۔ اور برطانوی گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو شمس العلماء کا خطاب حاصل تھا۔ علاوہ ازیں ریاست حیدرآباد کے تقریباً تین برس تک مفتی اعظم بھی رہے جس کے صلہ میں حافظ صاحب کے ساتھ پورے خاندان کو ریاست کی جانب سے وظیفہ ملتا تھا۔

۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸÷ میں نظام حیدرآباد دہلی آرہے تھے حافظ صاحب اس موقعہ پر انھیں دارالعلوم لانا چاہتے تھے چنانچہ اسی غرض سے حیدرآباد کا سفر کیا۔ سفر سے پہلے ہی سے طبیعت کچھ ناساز تھی حیدرآباد پہنچنے پر مرض شدت اختیار کرگیا اور نظام سے ملاقات کئے بغیر حالت کی نزاکت کے پیش نظر دیوبند واپسی کے ارادے سے وہاں سے چل پڑے مگر ابھی ٹرین حیدرآباد کے حدود ہی میں تھی کہ نظام آباد اسٹیشن پر حافظ صاحب دیوبند کے بجائے سفر آخرت کو سدھار گئے۔ ۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸÷ کو یہ حادثہ پیش آیا۔ اسٹیشن پر میت اتار لی گئی متعلقین اور نظامِ دکن کو بذریعہ تار حادثہ کی اطلاع دی گئی۔ اور نظام ہی کے حکم پر جنازہ دیوبند کے بجائے حیدرآباد لے جایا گیا۔ اور وہیں ایک مخصوص قبرستان ''خطۂ صالحین'' میں سرکاری مصارف پر تجہیز وتکفین علم میں آئی۔ حافظ صاحب نے کل ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دیئے۔

(۲۰) مولانا محمد صدیق صاحب مرادآبادیؒ

حضرت مولانا محمد صدیق بن مولانا محمد امین الدین صدیقی مرادآباد کے ایک علمی خانوادہ کے گل سرسبد تھے ۱۲۶۳ھ کے حدود میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار اور مولانا میر بشارت علی سنبھلی ومولانا محبوب علی سنبھلی سے حاصل کی اور فن طب کی تحصیل اپنے نانا حکیم محمد عطا حسین سے کی جو اپنے عہد کے نامور اطبّاء میں سے تھے۔

فارسی دینیات کی تکمیل کے بعد اپنے برادر خورد مولانا شمس الدین کے ہمراہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ کی خدمت میں میرٹھ پہنچے اور چندے استفادہ کے بعد واپس مرادآباد آگئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا سید احمد دہلوی وغیرہ سے حلقہ درس میں شامل ہوکر

مروجہ کتابیں پڑھیں۔

تحصیل وتکمیل کے بعد ۱۴/ربیع الاوّل ۱۲۸۹ھ کو میرٹھ میں حضرت حجۃ الاسلام قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور ذکر وشغل کے ساتھ علمی استفادہ بھی کرتے رہے۔ تکمیل سلوک کے بعد حضرت نانوتویؒ نے انھیں خلافت سے مشرف فرمایا۔ حضرت نانوتوی کے علاوہ حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی اور حضرت سیّد الطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بھی آپ کو خلافت واجازت حاصل تھی۔ مولانا محمد صدیق صاحب علوم ظاہری وباطنی میں کمال کے ساتھ اُردو اور فارسی کے قادرالکلام شاعر بھی تھے قاسمی اور صدیق تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

بسے چوں قاسم دیوانہ را فرزانہ می سازد   بہ بیں صدیق! فیض قاسم فرزانۂ مارا

فیوض قاسم الخیرات را صدیق می نازم   رود دیوانہ گر در بزم او فرزانہ می آید،

روحانی علاج کے ساتھ جسمانی علاج میں بھی مولانا کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ نبض شناسی اور تشخیص امراض میں آپ کو حیرت انگیز کمال حاصل تھا۔

۳/شوال ۱۳۴۷ھ کو شب جمعہ میں بعمر ۸۴ سال آپ کا وصال ہوا نماز جنازہ تلمیذ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نواب محی الدین خاں فاروقی نے پڑھائی(۱)

(۲۱) مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری

مولانا حکیم رحیم اللہ بن مولانا علیم اللہ بجنور کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم وچراغ تھے آپ کے والد مولانا علیم اللہ صاحب حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی کے رفقاء درس میں سے تھے۔

حکیم صاحب نے منطق، فلسفہ، کلام اور ریاضی کی کتابیں مولانا عبدالعلی رام پوری سے پڑھیں پھر دارالعلوم میں داخل ہوکر بقیہ کتبِ درس کی تکمیل کی اور ۱۲۹۵ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فن

---

(۱) الفرقان لکھنؤ شمارہ مارچ ۱۹۷۶ء۔

طب کی کتابیں حکیم ابراہیم لکھنوی سے پڑھیں اور طویل مدّت تک ان کی خدمت میں رہ کر عملی تجربات کیئے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی سے بھی ان کی آخری عمر میں استفادہ کیا۔

حکیم صاحب کو عقائد وکلام اور مناظرے میں خاص دسترس حاصل تھی اور ان علوم میں ایک درجن سے زائد کتابیں اپنی تصنیفی یادگار چھوڑیں جن میں بعض یہ ہیں۔

(۱) الکافی للاعتقاد الصافی (۲) تہدید المنکرین بقدرۃ رب العٰلمین (۳) اظہار الحقیقہ (۴) ابطال اصول الشیعہ بدلائل العقلیہ والنقلیہ (۵) احسن الکلام فی اصول عقائد الاسلام (۶) اثبات القدرۃ الالٰہیہ باقامۃ الحجۃ الالہامیہ۔

حکیم صاحب خدمتِ خلق کے طور پر گھر پر مطب کرتے تھے اوراد و وظائف کے پابند اور بڑے باوضع بزرگ تھے۔ سفر حج کے موقع پر حضرت سیدۃ الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت سے مشرف ہوئے۔ آخر عمر میں ہجوم امراض کی بناء پر نہایت کمزور ہوگئے تھے۔ ۱۴راگست ۱۹۲۹÷ مطابق ۱۳۴۷ھ کو ظہر کی نماز شدّتِ نقاہت سے بیٹھ کر ادا کی اور جیسے ہی سلام پھیرا روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند جو بجنور کے ہر دلعزیز قومی رہنما اور با اثر شخصیت ہیں حکیم صاحب کے نواسے ہیں۔

(۲۲) مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن بن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی ایک متبحر عالم اور عربی کے بہترین ادیب تھے، آپ کا تدبّر، سیاست، فراست، انتظام اور دوراندیشی حلقۂ دیوبند میں آج بھی ضرب المثل ہے از ابتداء تا انتہاء آپ نے دارالعلوم ہی میں پڑھا اور ۱۳۰۰ھ میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی ۱۳۲۵ھ میں حضرت حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کے کثرت مشاغل و اسفار کے پیش نظر مجلس شوریٰ دارالعلوم نے دارالعلوم کے انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ایک منتظم اور لائق شخص کی ضرورت محسوس کی چنانچہ اس اہم خدمت کے لئے مجلس کی نگاہ انتخاب آپ ہی پر پڑی اور باوجود انکار کے آپ کو نیابت

اہتمام کا منصب سپرد کردیا۔

مولانا عثمانی علیہ الرحمہ اگرچہ نحیف الجثہ اور پیدائشی طور پر کمزور تھے لیکن قدرت نے ضعف وکمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت عطا کی تھی امور اہتمام میں شب وروز انہماک کے ساتھ مطالعہ کتب کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کتب بینی کے شوق نے آپ کی معلومات میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کردی تھی عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا آپ کی علمی یادگار میں عربی قصائد اور متعدد اہم علمی وتحقیقی تصنیفات ہیں جن میں درج ذیل مصنفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) حاشیہ مقامات حریری (۲) قصیدہ لامیۃ المعجزات (۳) اشاعتِ اسلام (۴) تعلیماتِ اسلام (۵) حاشیہ تفسیر جلالین۔

دارالعلوم کے معاملات میں آپ مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کے ہمیشہ دستِ راست بلکہ مختار مطلق رہے اور حضرت حافظ صاحب کے زمانہ کے دارالعلوم کی ترقیات درحقیقت مولانا عثمانی کی رفاقت ہی کا نتیجہ ہیں حافظ صاحب مرحوم کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قرار پائے مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہیں کی اور اس منصب پر فائز ہونے کے ٹھیک چودہ ماہ بعد ۴؍رجب ۱۳۴۸ھ کی شب میں اس جہان فانی سے رحلت فرماگئے۔

نوٹ: تدریسی مصروفیت کی وجہ سے مضمون مکمل نہیں ہوسکا۔

☆ ☆ ☆

حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات

(۱) حضرت شیخ الہند سے کثرت استفادہ

(۲) مسجد نبوی میں تدریس

(۳) الجزائر کے جہاد آزادی میں رہنمائی

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی بظاہر ایک شخصیت کا نام ہے، لیکن بباطن وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے "ان ابراهيم كان امة" کی تفسیر تھے، کیونکہ وہ بیک وقت علوم ومعارف کے امام، مجلس ارشاد کے صدر نشین، عزیمت واستقامت کے جبل عظیم، فقر و تواضع کے بحر عمیق، بصائر وحکم کے سرچشمہ، زہد وقناعت کے مجسمہ، اخلاص وایثار کے پیکر، سخاوت وشجاعت کے مخزن، میدان صبر ورضا کے شہ سوار، قافلۂ جہد وعمل کے تاجدار اور سلفِ صالحین کی مکمل ومتحرک یادگار تھے "كثر الله امثاله"

آپ نے سیاست کے بحرِ مواج میں اپنے سفینہ کی تختہ بندی کی، مگر اس بصیرت کے ساتھ کہ اس کی چھینٹیں آپ کے دامنِ حیات کو نمناک نہ کرسکیں آپ نے مذہب و سیاست کے جام وسندان کو باہم آمیز کردیا، مگر اس کمال فراست کے ساتھ کہ دونوں کی نزاکتوں سے ایک لمحہ کیلئے بھی صرف نظر نہیں کیا۔

خدمات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر

۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ کو آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۱۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء) کو ساڑھے اکیاسی سال کی عمر میں اس جہان فانی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاودانی ہوگئے، اس اکیاسی سالہ حیات کے ۲۰ سال تعلیم وتحصیل میں بسر ہوئے اور

تقریباً ۸ر سال سے کچھ کم وبیش قید فرنگ کی نذر ہو گئے، زندگی کے باقی ۵۳ سال میں سے اگر کم از کم ۱۰ برس خواب وخور اور دیگر حوائج بشریہ کی تکمیل کے لئے نکال دیئے جائیں تو کارکردگی کی مدت صرف ۴۳ سال رہ جاتی ہے، ان ۴۳ سال کے محدود ایام کو پیش نظر رکھ کر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیمی تربیتی، تصنیفی اور سیاسی خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیجئے کہ مدینۃ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، مدرسہ عالیہ کلکتہ، اور آسام کے علاوہ صرف دارالعلوم دیوبند میں چار ہزار سے زائد وہ تلامذہ ہیں جنھوں نے آپ کے شمع علم سے اکتساب نور کیا۔ لاکھوں سے زیادہ وہ طالبین حق ہیں جنھوں نے تربیت گاہ مدنی سے تصحیح عقائد، تحسین اخلاق وتزکیۂ باطن کا درس لیا جن میں ڈیڑھ سو سے اوپر وہ خوش بخت اور جوان ہمت بھی ہیں جو احسان وسلوک کی منزلیں طے کرکے سند اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے، اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کیلئے اس وسیع وعریض ملک کے چپے چپے کا دورہ، اسلامی عنوانات پر ہزاروں سے زائد خطبات وتقریریں، استخلاص وطن، حریت قومی اور ملت کی سربلندی اور اپنے عصر کی سب سے بڑی استعماری طاقت سے محاذ آرائی، علوم اسلامی کی اشاعت کی غرض سے ہزاروں مکاتیب دینیہ و مدارس اسلامیہ کی سرپرستی ونگرانی، پھر ان ہمہ جہت ومختلف النوع مشاغل کے ساتھ مختلف دینی، علمی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر کتب ورسائل کی تالیف وتصنیف، نیز ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان مکاتیب کی تحریر جن میں تفسیر آیات، تشریح احادیث، تفصیل عقائد، توضیح مسائل فقہیہ، رموز احسان اور تاریخ وسیاست سے متعلق بیش بہا نادر معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کردیا ہے جس کے متعلق پورے اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ مکتوبات وملفوظات کی طویل فہرست میں مخدوم شرف الدین احمد منیری متوفی ۷۸۲ھ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ اور شیخ حسام الدین مانک پوری کے مجموعۂ مکاتیب کے بعد شیخ الاسلام کے مکتوبات اپنی افادیت، اپنی اثر آفرینی، کثیر معلومات اور جامعیت میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مکتوبات قلم برداشتہ اور بالعموم اسفار یا قید وبند کی حالت میں لکھے گئے ہیں جس سے حضرت شیخ الاسلام کے علمی استحضار وعبقریت کا کسی

قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے پھر تکمیل ذات کیلئے آہ نیم شبی کا مشغلہ اور رب کریم و آقائے بے نیاز سے عرض و نیاز جو زندگی کا ایک جز بن گیا تھا، بسا اوقات پورا دن ٹرین، تانگہ اور بیل گاڑیوں کے تکلیف دہ سفر میں گذر جاتا، اور رات کا بیشتر حصہ جلسہ اور وعظ میں، لیکن کیا مجال کہ رات کے اس محبوب معمول میں ذرا بھی فرق آجائے، الحاصل آپ کی زندگی فی اللیل رہبان وفی النہار فرسان کا مکمل نمونہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسی جامع کمالات اور گوناں گوں صفات کی حامل شخصیت پر قلم اٹھانے والا محامد و محاسن کے ہجوم میں متحیر ہوکر رہ جاتا ہے، وہ اگر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور دارالعلوم دیوبند میں آپ کے درس و تدریس، اصحاب عمل اور مردان کار کی تعلیم و تربیت کو موضوع سخن بنانا چاہتا ہے تو اسی لمحہ میدانِ جہاد میں آپ کے محیر العقول کارنامے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیتے ہیں، وہ اگر آپ کے صدارت جمعیۃ کے عہد پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی آن عرفان واحسان کی وہ کیف آگیں بزم جس کے آپ صدر نشین تھے اس کے رہوار تخیل کی زمام اپنی سمت موڑ لیتی ہے، وہ اگر آپ کے تبلیغی مواعظ اور اصلاحی مکاتیب کے سلسلے میں اپنے تاثر بیان کرنا چاہتا ہے تو آپ کے خطبات صدارت اور کراچی کی عدالت میں سنگینوں کے زیر سایہ اعلان حق، تاریخ عزیمت کا ایک نیا باب اس کی نگاہوں کے سامنے کردیتے ہیں وہ اگر آپ کے محاسن اخلاق اور بلندئ کردار کو اپنی بحث و تحقیق کا عنوان بنانا چاہتا ہے تو آپ کے بحر علم سے اسرار و حکم و علوم و معارف کی اٹھتی ہوئی موجیں اس کے اشہب فکر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور بالآخر فضائل و کمالات کی ان مسلسل اور بے پناہ جلوہ طرازیوں سے مبہوت ہوکر وہ پکار اٹھتا ہے۔

داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گلچیں تو ز تنگی داماں گلہ دارد

یقین جانئے یہ شاعری یا عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں ہے بلکہ ان مشکلات و کیفیات کا صحیح اظہار ہے جن سے ان سطور کو سپرد قلم کرتے ہوئے گذرنا پڑا ہے، ظاہر ہے اس پریشان خیالی میں کسی مرتب و مفصل تحریر کی ہوس بے سود تھی اس لئے یوسف کے خریداروں

میں نام لکھوانے کی غرض سے یہ بضاعۃ مزجاۃ بعنوان ''تین امتیازات'' لے کر حاضر ہوگیا ہوں—— گر قبول افتد زہے عز وشرف۔

امتیاز (۱) شیخ الہندؒ سے طویل استفادہ

حضرت شیخ الاسلام ماہ صفر ۱۳۰۹ھ میں بغرض تحصیل علم دیوبند پہنچے اور آخر شعبان ۱۳۱۶ھ تک یہاں آپ کا قیام رہا، ساڑھے چھ سال کی اس مدت میں سترہ فنون پر مشتمل سرسٹھ درسی کتابیں اساتذۂ دارالعلوم سے پڑھیں جن میں ۲۴ کتابیں خود حضرت شیخ الہند نے پڑھائیں، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا، اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

(۱) حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے دستور المبتدی، زرّادی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصورات، قطبی تصدیقات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد شریف، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی حاشیہ خیالی، مؤطا امام مالک، موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۲) مولانا ذوالفقار علی (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما) = فصول اکبری۔

(۳) مولانا عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس دوم دارالعلوم =
مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، سبعہ معلقہ، حمد اللہ، صدرہ، شمس بازغہ، توضیح تلویح۔

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = تلخیص المفتاح۔

(۵) مولانا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = پنج گنج، صرف میر، مختصر المعانی، سلم العلوم، ملاحسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین۔

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = شرح جامی

بحث فعل، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، مائۃ عامل، اصول الشاشی

(۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بغوی، مدرس دارالعلوم دیوبند = نور الانوار، حسامی، قاضی مبارک، شمائل ترمذی۔

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم = میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی۔

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم = شرح جامی بحث اسم۔

(۱۰) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب = مقامات حریری، دیوان متنبّی۔

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا سید محمد صدیق صاحب) منشعب، ایساغوجی[۱]

(۱) تعلیم وتحصیل کا یہ ساڑھے چھ سالہ دور حضرت شیخ الہند کے زیر سایہ اور ملازمت میں بسر ہوا، کیونکہ اس پوری مدت میں آپ کا قیام حضرت کے مکان کے متصل ایک کوٹھی میں رہا، اس قربت مکانی کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب حضرت شیخ الہند کے خدام میں سے تھے، اس تقریب سے ابتدا ہی سے آپ کو حضرت شیخ الہند کا تقرب حاصل ہوگیا۔

(۲) فراغت تعلیم اور مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہوجانے کی بعد ۱۳۲۷ھ میں جب عارضی طور پر ہندوستان تشریف لائے تو تقریباً ایک سال مزید حضرت شیخ الہند کی خدمت میں رہ کر ترمذی و بخاری کو دوبارہ بحث وتحقیق سے پڑھا۔ لکھتے ہیں

> ۱۳۲۶ھ کے آخر میں (مدینہ منورہ) سے روانہ ہوکر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا اور ترمذی، بخاری میں شریک ہوگیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پڑھا مسائل پر پوری بحث کرتا تھا، حضرت رحمۃ اللہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جواب نہایت وضاحت سے دیتے تھے[۱]

(۳) علاوہ ازیں اسارت مالٹا کا پورا زمانہ حضرت شیخ الہند کی معیت وصحبت میں

(۱) نقش حیات ج ۱ ص ۴۵، ۴۶۔

گزرا، اور اس کنج تنہائی میں حضرت شیخ کے آفتاب فیض سے باطمینان خاطر علم وفکر کی روشنی اخذ کرتے رہے، اس طرح مجموعی طور پر دس گیارہ سال تک آپ کو حضرت شیخ الہند کی صحبت وملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا امتیاز ہے جس میں ان کے رفقاء ومعاصرین میں کوئی بھی ان کا شریک وسہیم نہیں، علم وفکر کی پختگی میں شیخ سے طولِ ملازمت کا جو مقام ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں، سچ پوچھئے تو اسی اتصال و یک نفسی نے حضرت شیخ الاسلام کی ذات کو ایک ایسا آئینہ بنادیا تھا جس میں شیخ الہند کے سراپا کو بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

امتیاز (۲) مسجد نبوی...... میں حلقۂ درس

شعبان ۱۳۱۶ھ میں آپ کو تعلیم وتحصیل سے فراغت حاصل ہوئی اور اسی سال ماہ شعبان میں آپ کے والد ماجد نے مدینہ طیبہ زادہا شرفا وتعظیما کی جانب ہجرت کے ارادہ سے رختِ سفر باندھا، والد محترم کے حکم سے حضرت شیخ الاسلام نے بھی انھیں کی معیت میں ہندوستان کے بجائے ارضِ رسول...... کو اپنا مسکن وماویٰ بنالیا، جیسا کہ خود رقم طراز ہیں:

> ''محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا، حرم نبوی کے باب النساء کے قریب زقاق البدور کے کنارے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا گیا۔'' (۱)

مدینہ منورہ میں پہنچ کر رہائش وغیرہ کے معاملات سے مطمئن ہوجانے کے بعد آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کی زبانی سماعت کیجئے۔ فرماتے ہیں:

> ''درس وتدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی (حضرت شیخ الاسلام، مولانا صدیق صاحب ومولانا سید احمد صاحب)

(۱) نقش حیات ج۱ ص۱۵۱۔

دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے، تو من جملہ رخصت کرنے والوں کے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک تشریف لائے تھے، راستہ میں پرزور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ ''پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے دو ایک طالب علم ہی ہوں'' اس لئے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستان اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے (اور حسب ہدایت حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز اس کام کو شروع کردیا۔'' (۱)

چونکہ حضرت شیخ الاسلام کی عمر ابھی کم تھی اور یہاں کے نو وارد بھی تھے اور بقول سعدیؒ

تا مرد سخن نگفتہ باشد　　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آپ کے علمی مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں پر اجنبیت اور عدم واقفیت کا پردہ پڑا ہوا تھا اس لئے ابتدا میں تقریباً ایک سال تک طلبہ کا رجوع آپ کی طرف کم رہا، لیکن دو سال گذرتے گذرتے آپ کا نہال علم ایک تناور درخت ہوگیا جس کے سائے میں حجاز، ترکستان، بخاریٰ ہندوستان، کابل، الجزائر، قازان، مصر وغیرہ دور و نزدیک سے مسافران علم کے قافلے در قافلے اترنے لگے اور آپ کے تبحر علمی کے غلغلے سے مدینۃ الرسول ...... کے گلی کوچے پرشور ہوگئے، آپ کے درس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم اساتذۂ مسجد نبوی کے حلقہ ہائے درس سونے پڑ گئے اور ان کی ساری رونق سمٹ کر حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں نچھاور ہونے لگی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا　　　پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ایک نو وارد اور وہ بھی ایک نوعمر کا اس قدر جلد شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر پہنچ جانا عام حالات میں بڑے بڑے وسیع ظرف اور سیر چشموں کیلئے بھی رشک و رقابت اور حسد کا سبب ہوجاتا ہے کچھ اسی طرح کا معاملہ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ بھی پیش آیا کہ آپ کا علمی عروج دیکھ کر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قدیم اساتذہ کی رگِ حسد بھڑک

(۱) نقش حیات ج ا ص ۵۷۔

اٹھی، جس کی بنا پر آپ کو چندے مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جس آقائے کریم نے سر پر مقبولیت کا تاج رکھ کر آپ کو سرفراز فرمایا تھا اسی نے ان مشکلات کا مداویٰ بھی کر دیا، اور آپ کی نیک نامی دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہی رہی خود حضرت شیخ الاسلامؒ نے مدینہ منورہ میں اپنے مشاغل علمیہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''۱۳۱۸ھ شوال تک ... میں ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علم کو پڑھاتا رہا ۱۳۱۸ھ ذی قعدہ میں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا۔ اور ۱۳۲۰ھ محرم میں مدینہ منورہ واپس ہوا، یہاں پہنچنے کے بعد مدرسہ شمسیہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ میں بعہدہ مدرسی ۳۵ روپے ماہوار ملازم ہو گیا چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لئے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم میں کتابیں شروع کرادیں، سمجھدار اور جدوجہد کرنے والے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہو گیا جس سے مدرسین حرم محترم کو حسد اور رقابت پیدا ہو گئی، طلبہ صرف اہل مدینہ نہ تھے بلکہ ترک، بخاریٰ، قازانی، قزق، ترکستان، کابلی، مصری وغیرہ بھی تھے (اس حسد کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ)....ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار ہوا کہ خارج از اوقات مدرسہ میں کہیں نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند باتیں اور پیش آئیں جن کی وجہ سے بہ مجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفادینا پڑا اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اس کے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے، چنانچہ کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی...(کہ) طلبہ علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے مجبور ہو کر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے، جواب میں حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا ''پڑھاؤ خوب پڑھاؤ، اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی، روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا،

پانچ صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد دو عصر کے بعد، دو مغرب کے بعد ایک عشاء کے بعد۔(۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا... چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے، تو ان تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے ...علوم میں جدوجہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر رہا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی۔(۲)

۱۳۲۷ھ میں آپ پھر ہندوستان وارد ہوئے اور ۱۳۲۹ھ تک ہندوستان ہی میں قیام پذیر رہے اسی سفر میں آپ نے حضرت شیخ الہند سے ترمذی و بخاری دوبارہ پڑھی جس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ نیز اس عارضی قیام کے زمانہ میں آپ کو اکابر دارالعلوم نے باقاعدہ طور پر دارالعلوم کا استاذ بھی منتخب کرلیا تھا اور اس تصریح کے ساتھ کہ یہ انتخاب دوامی ہے، درمیان میں وقفہ کے بعد جدید تقرر کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ یہی تجویز تقرر کافی سمجھی جائے گی، یہ حضرات اکابر رحمہم اللہ کی جانب سے آپ کی علمی لیاقت پر اعتماد اور وثوق کی ایسی گرانقدر سند ہے جو فضلائے دارالعلوم میں سب سے پہلے آپ ہی کو مرحمت ہوئی اور غالباً آپ ہی پر اس کا آخر بھی ہوگیا۔ ذلك فضل الله يعطيه من يشاء.

حضرت شیخ الاسلام نے بھی اس یادگار تجویز کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم دیا جلسہ اہل شوریٰ نے حضرات مہتممین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش پر تجویز پاس کردیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ ۳۴ روپے ماہوار مدرس کردیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس

(۱) نقش حیات ج اص ۵۷ تا ۶۴ باختصار۔

(۲) ایضاً ج اص ۹۶ تا ۹۹ باختصار۔

شوریٰ مدرس کیا جائے۔(۱)

۱۳۲۹ھ میں آپ مدینہ منورہ واپس حاضر ہوگئے۔۱۳۳۱ھ میں چند مہینوں کے لئے پھر ہندوستان آنا ہوا اس کے بعد مسلسل محرم ۱۳۳۵ھ تک آپ کا قیام مدینہ ہی میں رہا اور مشاغل درس وتدریس برابر جاری رہے تا آنکہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حکومت برطانیہ کی سازش اور ایماء پر حضرت شیخ الہند (جو اس وقت حجاز مقدس ہی میں تھے) اور دیگر رفقاء کے ساتھ آپ کو گرفتار کرکے مالٹا جیل میں پہنچادیا گیا، اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی سترہ سالہ اقامت مدینہ کے دوران باستثناء وقفۂ قیام ہند کم وبیش ۱۲-۱۳ سال مسجد نبوی میں خود صاحب وحی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نظر کتاب وسنت اور دیگر فنون اسلامیہ کا کامیاب درس دیا، مجد وشرف کا یہ تاج جو حضرت شیخ الاسلام کے سر پر رکھا گیا بارگاہ صمدیت کا ایسا بیش بہا اور عظیم عطیہ ہے جو بندگان خاص ہی کو عطا کیا جاتا ہے، بغیر کسی خوفِ تردید کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا یہ ایسا طرۂ امتیاز ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر علماء میں بالکل منفرد وممتاز ہیں،

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا''

اس خصوصی تربیت گاہ مدنی کے افق سے علم وفکر اور جہد وعمل کے کیسے کیسے ماہ واختر طلوع ہوئے افسوس کہ آپ کے سوانح نگاروں نے اپنی سہل انگاری اور سہولت پسندی کی بنا پر اس کی جانب کوئی توجہ ہی نہ کی، اس طرح حیات مدنی کا یہ زریں وروشن باب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور اب اس پر ماہ وسال کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ انھیں ہٹا کر حقیقت حال کو واضح کرنا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، لیکن اس مشکل کی وجہ سے اس اہم ترین موضوع سے آنکھ بند کرکے گذر جانا کسی طرح مناسب نہیں، اس لئے اس کی طرف مختصر طور پر ہی سہی کچھ اشارات ضروری ہیں، ممکن ہے آگے آنے والے مورخ کو انھیں اشاروں کی روشنی میں بحث ونظر کیلئے کوئی واضح شاہراہ مل جائے اور وہ اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کرسکے۔ وما توفیق الا باللّٰہ علیه توکلت والیه انیب.

(۱) ایضاً ج ۱ ص ۱۳۲

”طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اسکی مثال نہیں تھی۔“

حضرت شیخ الاسلام کا یہ اشارہ بتا رہا ہے کہ شمع مدنی کے گرد اکٹھا ہونے والے پروانوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں رہی ہوگی، پھر خود حضرت ہی یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ ”یہ طلبہ علم صرف مدینہ منورہ ہی کے نہیں تھے بلکہ اس ہجوم میں ہندوستان، ترک، بخارا، قازان، قزق، ترکستان، کابل، مصر وغیرہ کے طالبان علم بھی تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ درس و دائرہ تربیت نہایت وسیع تھا۔ مجلّہ المنہل مدینہ منورہ کے بیان سے بعض تلامذہ کے ناموں کی تعیین بھی ہوجاتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ضروری اقتباس اس موقع پر پیش کردیا جائے، مجلّہ المنہل نے حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مضمون شائع کیا تھا یہ اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے:

فتلقى عليه العلم الناس كثيرون وانتفع الطلاب من تعليمه وكان من تلاميذه مدرسون وقضاة وحكام مديرون وروساء يذكرون منهم المرحومين المشائخ عبدالحفيظ الكردى الكورانى عضو المحكمة الكبرى بالمدينة واحمد البساطى نائب القاضى بها سابقا ومفتى الاحناف بها ومحمود عبدالجواد رئيس بلدية المدينة المنورة وكذلك الشيخ محمد البشير الابراهيمى العالم الجزائرى المجاهد فى سبيل التطويح ببغاة الاستعمار من الجزائر العربية العريقه(۱)

بہت سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا اور کثیر طلبہ آپ کی تعلیم و تدریس سے مستفیض ہوئے آپ کے تلامذہ میں مدرسین، قاضی و حکام، سرکاری محکموں کے سکریٹری اور رؤسا تھے ان میں حسب ذیل مرحومین مشائخ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) الشیخ عبدالحفیظ الکردی الکورانی رکن محکمہ کبریٰ، مدینہ منورہ (۲) الشیخ احمد البساطی نائب قاضی و مفتی احناف مدینہ منورہ (۳) الشیخ محمود عبدالجواد صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ (۴) محمد البشیر الابراہیمی الجزائری، جنھوں نے الجزائر سے استعماری باغیوں کو دور

(۱) نقش حیات

کرنے میں زبردست جہاد کیا۔

مجلّہ الوعی الاسلامی کویت سے مزید ایک اور الجزائری مجاہد کے نام کی تعیین ہوتی ہے الامام عبدالحمید بن بادیس المصلح الجزائری المعاصر کے عنوان سے الوعی الاسلامی نے ڈاکٹر محمود بن محمد قاسم کا ایک مقالہ شائع کیا ہے اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف شیخ عبدالحمید بن بادیس کے سفر حجاز کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ثم سافر الٰی مکة لاداء فریضة الحج فی سنة ۱۹۱۳م وفی الحجاز لقی عددا من علماء مصر والشام وتتلمذ علی الشیخ حسین احمد الھندی الذی نصحه بالمعودة الی الجزائر، اذلاخیر فی علم لیس بعده عمل.

پھر شیخ عبدالحمید بن بادیس نے فریضۂ حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ معظّمہ کا سفر کیا اور حجاز میں متعدد علماء مصر وشام سے ملاقات کی اور شیخ حسین احمد ہندی سے (شرف) تلمذ حاصل کیا جنھوں نے شیخ عبدالحمید کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی کیونکہ اس علم میں کوئی خوبی نہیں جس کے بعد عمل نہ ہو۔

ان مراجع سے درج ذیل تلامذہ کی نشاندہی ہوتی ہے جنھوں نے آپ سے قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں اخذ فیض کیا۔ شیخ عبدالحفیظ کردی کورانی (رکن محکمہ کبریٰ مدینہ منورہ)، شیخ احمد بساطی نائب قاضی ومفتی احناف مدینہ منورہ، شیخ محمود عبدالجواد (صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ) شیخ محمد البشیر الابراہیمی جزائری، شیخ عبدالحمید بن بادیس الجزائری، آخرالذکر دونوں جزائری تلامذہ کے سلسلے میں ہم قدرے تفصیلی گفتگو کررہے ہیں کیونکہ ہمارے موضوع کے آخری جز سے انھیں ہر دو حضرات کی خدمات وکارنامے متعلق ہیں اور آج تک اس پر کچھ لکھا بھی نہیں گیا ہے۔

امتیاز (۳) الجزائر کے جہاد حریت میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ

تفصیلات میں جانے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس اور محمد بشیر ابراہیمی کو کیا مقام حاصل ہے تو مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ہندوستان

میں حکومت اور عوام کے نزدیک جو حیثیت گاندھی جی اور جواہر لال کی ہے علی الترتیب یہی درجہ و مرتبہ شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد بشیر الابراہیمی کا الجزائر میں ہے۔

ایک الجزائری مصنف لکھتے ہیں ۱۹۴۰÷ میں جس تاریخ کو شیخ ابن بادیس کی وفات ہوئی اس وقت میری عمر صرف دس سال کی تھی اور میں ایک مکتب (مدرسہ حیات الشباب) میں زیر تعلیم تھا، ہم درجے میں جانے کی تیاری کرر ہے تھے کہ ہمارے درجہ کے استاذ نے آ کر کہا ''اب سبق نہیں ہوگا شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے'' ہم بچوں کو شیخ کے مقام و مرتبہ کی کیا خبر ہمیں تو اس غیر متوقع چھٹی مل جانے پر بڑی مسرت ہوئی، راستے میں کھیلتے کودتے گھر آئے میرے والد شیخ کی علالت کی اطلاع پر قسنطینہ ان کی عیادت کو گئے ہوئے تھے اور میری یہ عادت تھی کہ جب معلوم ہوتا کہ والد صاحب گھر میں نہیں ہیں تو دروازے کی کنڈی خوب زور زور سے بجاتا، چنانچہ حسب عادت آج بھی میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد گھر میں داخل ہوا میری والدہ شام کا کھانا پکا رہی تھی، میں نے بے وقت آنے کی وجہ بتاتے ہوئے ان سے کہا کہ مدرسہ میں تعطیل ہوگئی ہے کیونکہ شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے میرے منھ سے یہ جملہ نکلنا تھا کہ میری والدہ بے قابو ہوکر چیخ اٹھیں۔ ''أ صحیحٌ ما تقول'' کیا تم سچ کہہ رہے ہو، میں نے جب مؤکد طور پر یہی بات دہرائی اور انھیں اس کا یقین ہوگیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، اس وقت مجھے کچھ احساس ہوا کہ یہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہے، دوسرے دن شیخ کی تجہیز و تکفین کے بعد میرے والد قسنطینہ سے واپس لوٹے، ان کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کبھی شہر جاتے تو میرے لئے کھلونے وغیرہ ضرور لاتے، میں اس بار بھی منتظر تھا کہ عادت کے مطابق میرے لئے ضرور کھلونے لائیں گے، لیکن اس مرتبہ جب وہ گھر واپس آئے تو ان کی عجیب وغریب کیفیت تھی، گم سم، گویائی کی طاقت بالکل ناپید، بولنے کی کوشش کرتے بھی تو صرف ہونٹوں میں حرکت ہوجاتی آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، شدّتِ غم سے تحیر کی یہ حالت ان پر کئی دن تک طاری رہی۔(۱)

(۱) محمد المیلی: ابن بادیس وعروبۃ الجزائر ص ۷، ۸۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس کو کیا مقام حاصل تھا اور الجزائری انھیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ابن بادیس کا مختصر تذکرہ

الشیخ عبدالحمید بن بادیس ۴؍دسمبر ۱۸۸۹÷/ ۱۳۰۶ھ کو الجزائر کے مشہور شہر قسنطینہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳؍سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت کے بعد قسنطینہ ہی میں شیخ حمدان لونیسی سے علوم عربیہ کی تحصیل شروع کردی اور پانچ سال تک انھیں کی خدمت میں رہ کر ابتدائی مرحلے کی تعلیم مکمل کی اور آگے کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۸÷ میں جامعہ زیتونیہ تیونس میں داخل ہوگئے، چار سال وہاں رہ کر بقیہ تعلیم پوری کی اور ۱۹۱۲÷ میں عالمیت کی سند لے کر گھر واپس آگئے، پھر ۱۹۱۳÷/۱۳۳۲ھ میں حج وزیارت کے ارادے سے مکہ معظّمہ کا سفر کیا، فریضۂ حج ادا کرکے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور تقریباً تین ماہ یہاں قیام کیا، اسی قیام کے دوران حضرت شیخ الاسلام سے استفادہ کیا، بعد ازاں حضرت شیخ الاسلام ہی کے مشورہ پر وطن واپس آئے اور درس وتدریس اور وعظ وتذکیر میں مشغول ہوگئے، ۱۹۲۵÷ میں المنتقد کے نام سے اصلاحی ہفت روزہ جاری کیا، حکومت کی پابندی عائد کردینے کی وجہ سے اس کے صرف ۱۸ شمارے نکل سکے، اس کے بند ہونے کے بعد دوسرا جریدہ الشہاب کے نام سے جاری کیا جو ابتدا میں ہفت روزہ تھا بعد میں ماہانہ ہوگیا تھا جس میں علمی اصلاحی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے اور پورے الجزائر میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۳۱÷ جمعیۃ علماء الجزائر قائم کی اور تاحیات اس کی صدارت کے منصب پر فائز رہے، اسی کے پلیٹ فارم سے الجزائر کی آزادی کی جنگ کا آغاز کیا، ۵۱ سال کی مختصر عمر میں بمرض کینسر ۸؍ربیع الاوّل ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۶؍اپریل ۱۹۴۰÷ کو وفات پائی۔ (۱)

حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتدا

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شیخ ابن بادیس حجاز پہنچے اس سے پانچ سال قبل

(۱) ماخوذ تر کی راجح: الشیخ عبدالحمید ابن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیہ۔

ان کے استاذ شیخ حمدان استعماری جبر وتشدد سے تنگ ہوکر الجزائر سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں آباد ہوگئے تھے، چنانچہ ابن بادیس جب مدینہ منورہ پہنچے تو انھیں بھی یہی مشورہ دیا کہ الجزائر اب رہنے کی جگہ نہیں وہاں سے قطع تعلق کرکے جوار رسول ...... میں مقیم ہوجائیں، لیکن ان کے برعکس حضرت شیخ الاسلامؒ انھیں الجزائر واپس جانے اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے کی رائے دی، اس سلسلے میں تحریک الجزائر کے دوسرے لیڈر شیخ ابن بادیس کے رفیق کار تلمیذ شیخ الاسلام الشیخ محمد البشیر الابراہیمی کا درج ذیل بیان قابل ملاحظہ ہے۔

''مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ نے احقر سے بیان فرمایا کہ میں ۱۹۵۰ء میں عم محترم الشیخ السید محمود رحمہ اللہ کی خدمت میں مدرسۃ الشرعیہ المدینۃ المنورہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور چچا سے مصافحہ ومعانقہ کے بعد دریافت کیا: ''این شیخی وکیف'' میرے شیخ کہاں اور کس حال میں ہیں، چچا نے بتایا کہ ہندوستان میں ہیں اور بحمد اللہ خیر وعافیت سے ہیں، پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کے خلف اکبر ہیں، یہ سنتے ہی مجھ سے چمٹ گئے اور دیر تک مجھے گلے سے لگائے رکھا اس کے بعد اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں محمد البشیر الابراہیمی الجزائری ہوں اور آپ کے والد ماجد کا ایک ادنیٰ تلمیذ، ہمیں حضرت نے جہاد حریت کی ترغیب دے کر الجزائر واپس بھیجا تھا۔'' (۱)

قریب قریب یہی بات شیخ ابراہیمی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے ایک ملاقات کے موقع پر بتائی تھی مولانا ندوی صاحب اپنے مکتوب بنام مولانا سید ارشد مدنی میں لکھتے ہیں:

''میں ۱۹۵۶ء میں جب دمشق محاضرات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو الشیخ محمد بشیر الابراہیمی دمشق آئے تھے انھوں نے ذکر کیا تھا کہ الجزائر کی جنگ

(۱) روایت حضرت مولانا سید اسعد مدنی۔

وآزادیٔ جہاد کے قائد شیخ عبدالحمید کا خیال ہجرت اور مستقل قیام کا ہورہا تھا، حضرت نے ان کو واپس جانے کا مشورہ دیا، وہ واپس گئے اور انھوں نے تحریک کی قیادت کی۔(۱)

ان معتبر بیانات کے علاوہ خود ابن بادیس کی یہ تحریر ملاحظہ کیجئے۔

اذکر انی لما زرت المدینة المنورة واتصلت فیها بشیخی الاستاذ حمدان لونیسی المهاجر الجزائری وشیخی حسین احمد الهندی اشار علی الاول بالهجرة الی المدینة المنورة وقطع کل علاقة لی بالوطن واشار الثانی وکان عالمًا حکیمًا بالعودة الی الوطن وخدمة الاسلام فیه والعربیة بقدر جهد فحقق الله رائ الشیخ الثانی ورجعنا الی الوطن بقصد خدمته(۲)

مجھے خوب یاد ہے میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا اور وہاں میری ملاقات اپنے قدیمی استاذ شیخ حمدان مہاجر جزائری اور دوسرے استاذ شیخ حسین احمد ہندی سے ہوئی تو پہلے استاذ (شیخ حمدان) نے مجھے مشورہ دیا کہ الجزائر کو خیرآباد کہہ کر مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن ومستقر بنالوں اور دوسرے استاذ (شیخ الاسلام) جو عالم محقق تھے کی رائے یہ ہوئی کہ میں الجزائر جاؤں اور وہاں اسلام وعربیت کی خدمت کروں، اللہ تعالیٰ نے شیخ ثانی کی رائے کو محقق فرمایا اور میں الجزائر کی خدمت کیلئے واپس آگیا۔

لیکن ان مصادر سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ حضرت شیخ الاسلام نے اس عظیم خدمت کو انجام دینے کیلئے ابن بادیس کو کیا ہدایات دیں اور کن افکار اور طریقۂ عمل کے تحت انھیں کام کرنے کی ترغیب دی، ظاہر ہے کہ ایک ۲۴ سالہ نوجوان کو جس کی اب تک کی پوری زندگی گھر یا تعلیم گاہ کے ماحول میں گذری ہو جو تنظیم وتحریک کے تجربات سے بالکل ناآشنا ہو، اسے یکایک بغیر کسی تعلیم وتربیت کے ایسے اہم ترین صبرآزما اور دوررس

(۱) مکتوب حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۸٦/۹/۲۷÷۔

(۲) ابن بادیس: الشہاب ج ۸ص ۳۵۵ عدد اکتوبر ۱۹۳۷÷ بحوالہ ترکی رائح الشیخ عبدالحمید بن بادیس ص ۲۷۔

نتائج کی حامل خدمت پر مامور کردیا جائے عقل اسے باور کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت شیخ الاسلام نے ضروری اصول وضوابط سمجھانے کے بعد ہی انھیں اس جوکھم کام پر لگایا ہوگا، لیکن وہ اصول وضوابط کیا تھے کن افکار ونظریات کے تحت اس تحریک کا آغاز کرایا گیا تھا، نہ تو شیخ ابن بادیس کی تحریروں سے اس کا سراغ ملتا ہے اور نہ شیخ ابراہیمی کے بیانات ہی سے، اس وقت کے احوال وظروف کا تقاضہ یہی تھا کہ اس جہاد سے حضرت شیخ الاسلام کے براہ راست تعلق کو واضح نہ کیا جائے، ورنہ شیخ کے لئے مشکلات ومصائب پیش آسکتی تھیں، اور جب حالات سازگار ہوئے تو بیان کرنے والے ہی دنیا سے جاچکے تھے اس لئے یہ راز پردۂ راز ہی میں رہ گیا، لیکن علمی ومنطقی اعتبار سے اگر یہ درست ہے کہ تلمیذ وشیخ کے فکر وعمل میں یکسانیت اور توافق اس بات کی دلیل ہے کہ تلمیذ نے ان افکار واعمال کو اپنے شیخ سے اخذ وجذب کیا ہے تو بغیر کسی پس وپیش کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قائد جہاد شیخ ابن بادیس کو مکمل طور پر اصول وضوابط کے کیل کانٹے سے لیس کر کے میدان عمل میں اتارا تھا، کیونکہ دونوں کے نظریات اور طریقۂ عمل میں اس قدر موافقت اور یکسانیت ہے کہ الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ایک لمحہ کیلئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ الجزائر کی تاریخ آزادی کو پڑھ رہا ہے یا حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اور جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ اس کے پیش نظر ہے، اس موقع پر طوالت سے بچتے ہوئے چند نظائر پیش کئے جاتے ہیں۔

فکر وعمل میں یکسانیت

حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی تنہا ہندوستان کی آزادی نہیں ہے بلکہ یہ ایشیا کی آزادی کا پیش خیمہ ہے، اور ایشیا کی آزادی مشرق کے کتنے ہی پسماندہ اور کمزور قوموں کی آزادی کا ذریعہ ہے، اپنے احوال وظروف کے مطابق اسی نظریہ کا اعلان شیخ ابن بادیس ان الفاظ میں کررہے ہیں:

نعم ان لنا وراء هذا الوطن الخاص اوطانا اخرىٰ عزيزة علينا هى دائما

على بأل و نحن فيما نعمل لوطننا الخاص نعتقد انه لابد ان تكون قد خدمناها واوصلنا اليها النفع والخير من طريق خدمتنا لوطننا الخاص واقرب هذه الاوطان الينا هو المغرب الاقصىٰ والمغرب الادنىٰ والمغرب الاوسط ثم الوطن العربى الاسلامى ثم الانسانية العام. (۱)

اس وطن خاص (الجزائر) کے علاوہ ہمارے اور بھی اوطان ہیں، جو ہمیں بہت محبوب ہیں جن کا خیال ہمہ وقت رہتا ہے اور ہم جو خدمات اپنے وطن کی انجام دے رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اس راہ سے ہم ان اوطان کی بھی خدمت کررہے ہیں اور انھیں بھی نفع و خیر پہنچا رہے ہیں، اوران میں ہم سے سب سے قریب مغرب اقصیٰ، مغرب ادنیٰ اور مغرب اوسط ہیں، ان کے بعد یہ نفع وطن عربی اسلامی اور پھر وطن انسانیت کو پہنچے گا۔

(۲) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ مشرق کی ساری تباہی اور فساد کی جڑ مغربی اقتدار کا غلبہ ہے اگر مغرب کا یہ استعماری غلبہ ختم ہوجائے تو مشرق کے مزاج کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اس نظریہ کی بازگشت شیخ ابن بادیس کے کلام میں سنی جاسکتی ہے۔

اننا نفرق جيدا بين الروح الانسانية والروح الاستعمارية فى كل امة فنحن بقدر ما نكره هذه و نقاومها نوالى تلك ونؤيدها لاننا نتيقن كل اليقين ان كل بلاء العالم هو من هذه وكل خير يرجىٰ للبشرية انما يكون يوم تسود تلك فتسقط الروح الاستعمارية ولمتندحر ولترتفع الروح الانسانية والنشر. (۲)

ہم روح انسانیت اور روح استعماریت کے درمیان فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم اسی فرق کے مطابق استعماریت کو ناپسند کرتے اوراس کی مخالفت کرتے ہیں اور روح انسانیت کو دوست رکھتے اوراس کی تائید کرتے

(۱) ابن بادیس الشہاب بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس وعروبہ الجزائر ص ۵۶۔

(۲) ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۸ء بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس وعروبۃ الجزائر ۵۳۔

ہیں، اس لئے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ عالم کی تمام تر مصیبت کا سبب یہی استعماریت ہے اور انسانیت کیلئے کسی خیر کی امید اسی وقت کی جاسکتی ہے جس وقت کہ انسانیت کی سیادت اور بالاتری حاصل ہو جائے، لہٰذا اس وقت روح استعماریت ساقط اور ختم ہو جائے گی اور روح انسانیت بلند اور چھا جائے گی۔

(۳) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک عنصر ہیں کیونکہ آج کل قومیت کا تشخص وطنیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور لفظ قوم اپنے معنی کے اعتبار سے اسی جماعت پر منطبق ہوتا ہے جس میں جامعیت کا کوئی سبب موجود ہو۔

شیخ ابن بادیس نے اس نظریہ کی تعبیر حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

المسلم هو المتدين بالاسلام والاسلام عقائد واعمال واخلاق بها السعادة فى الدارين والجزائرى انما ينسب للوطن افراده الذين ربطتهم ذكريات الماضى ومصالح الحاضر ومآل المستقبل فالذين يعمرون هذا القطر وتربطهم هذه الروابط هم الجزائريون. (۱)

مسلم وہ شخص ہے جو دین اسلام کا پابند ہے اور اسلام ایسے عقائد، اعمال اور اخلاق کو شامل ہے جس سے دارین کی سعادت متعلق ہے، اور جزائری تو صرف وطن کی جانب منسوب ہیں جس کے افراد کو ماضی کی تاریخ، حال کے مصالح اور مستقبل کی امیدوں نے باہم مربوط کر رکھا ہے، لہٰذا جو لوگ اس ملک میں آباد اور ان مذکورہ روابط میں مربوط ہیں وہ جزائری ہیں۔

(۴) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا حق وانصاف میں ذات و مذہب کی بنیاد پر امتیاز غلط ہے ملک کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی ذات و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں حق وانصاف میں سب کے حقوق یکساں ہیں۔

(۱) ابن بادیس: الشہاب ج ۱۰ عدد نومبر۔

شیخ ابن بادیس اس نظریہ کا اعلان یوں کرتے ہیں:

فنهضتنا نهضة بنيت على الدين اركانها فكانت سلاما على البشرية ... لايخشاها والله النصرانى لنصرانيته ولا اليهودى ليهوديته بل ولا مجوسى لمجوسيته ولكن يجب والله ان يخشاها الظالم بظلمه والدجال لدجله والخائن لخيانته. (۱)

ہمارے اس انقلاب کی اساس دینی ہے جو انسانیت کی سلامتی کا ذریعہ ہے، اس میں نصرانی اپنی نصرانیت اور یہودی اپنی یہودیت کی وجہ سے خائف نہیں ہوگا بلکہ مجوسی کو بھی اپنی مجوسیت کی بنا پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ البتہ ظالم اپنے ظلم دجال اپنے دجل وفریب اور خائن اپنی خیانت کی بنیاد پر خوف زدہ ہوگا۔

نظریات میں اس وحدت کے بعد ایک سرسری جائزہ طریقۂ کار اور دستور العمل پر بھی ڈالتے چلئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تحریک کی ابتدا درس وتدریس سے کی تھی۔ دورانِ درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ اس کی سیاسی تربیت بھی فرماتے تھے ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف وجوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظّم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لئے تیار ہوگئی تو جمعیۃ الانصار کی داغ بیل ڈالی اور پھر دہلی میں مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کے عنوان سے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، اس طرح سے ملک کے ذہین، بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد اکٹھا کر لی اور پھر انھیں کے واسطے سے تحریک کا جال پورے ملک میں بچھا دیا، تحریک کی اسی ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور قید وبند کی وجہ سے کام کرنے والوں میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا بلکہ انھوں نے خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے نام سے ایک محاذ کے بجائے دو دو محاذ کھول دیئے اور بالآخر اسی جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے آزادی کی بھرپور جنگ لڑی گئی۔ اس پس منظر

(۱) ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۶ء بحوالہ سابق۔

کو ذہن میں رکھتے ہوئے شیخ ابن بادیس کی تاریخ جہد وعمل کا مطالعہ کیجئے۔

وہ ۱۹۱۳÷ میں حضرت شیخ الاسلام کی ہدایت پر الجزائر واپس آئے اور ہر مشغلہ سے بالکل یکسو ہوکر درس وتدریس وعظ وتذکیر میں لگ گئے اور ایک دوسال نہیں بلکہ پورے دس سال اس خالص علمی مشغلہ کو جاری رکھا وہ خود لکھتے ہیں:

قضينا عشر سنوات فی الدرس لتكوين نشأءِ العلمی لم تخلط به غيره من عمل آخر فلما كملت العشر وظهرت بحمد اللّٰہ نتيجتها الخ

> ہم نے پورے دس سال (الجزائر) کی نشأۃ علمی میں گذار دیئے جن میں ترویج علوم کے علاوہ ہم نے کوئی کام نہیں کیا اور الحمدللہ اس کے اچھے نتائج بھی ظاہر ہوئے۔

طریقہ یہ تھا کہ رات کو قرآن حکیم کا مجموعی درس ہوتا تھا، جس کے ضمن میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات کو بھی مدلل طور پر بیان کرتے رہتے تھے، اس درس کو اس درجہ مقبولیت ہوئی کہ شہر قسنطینہ کے علاوہ مضافات سے بھی بڑی جماعت اس میں شرکت کے لئے آتی تھی، اور دن کو خصوصی درس ہوتا تھا جس میں صرف طلبہ شریک ہوتے تھے، اس درس میں تفسیر قرآن، موطا امام مالک مقدمہ ابن خلدون اور بعض فقہ اور تاریخ کی کتابیں ہوتی تھیں، اس طرح سے دس سال کی مدت میں انھوں نے آگے کے کام کی زمین تیار کرلی اور اپنے تلامذہ اور مستفیدین کے ذریعے پورے ملک میں اپنے نظریات کو عام کردیا اس کے بعد ۱۹۲۵÷ میں یکے بعد دیگرے علی الترتیب دو رسالے المنتقد اور الشہاب جاری کئے (ممکن ہے الشہاب نام حضرت شیخ الاسلام کی فاضلانہ کتاب "الشہاب الثاقب" کے نام سے اخذ کیا ہو، یہ کتاب اس وقت شائع ہوچکی تھی) جس میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات پر کھل کر بحث کرتے تھے، اس کا اثر بھی ملک پر نہایت اچھا پڑا اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوگئی بعدازاں ۱۹۳۱÷ میں جمعیۃ علماء الجزائر کی بنیاد رکھی جس کے خود ہی تاحیات صدر رہے، شیخ بادیس کے جانشین جمعیۃ علماء کے دوسرے شیخ محمد بشیر الابراہیمی جمعیۃ علماء کی اہمیت وضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لو تأخر ظهور جمعية العُلماء عشرين سنة لما وجدنا فى الجزائر من يسمع صوتنا"

اگر جمعیۃ علماء کی تاسیس میں دس بیس سال کی تاخیر اور ہو جاتی تو ہماری باتیں سننے کے لئے الجزائر میں ایک آدمی بھی نہ ملتا۔

پھر جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے کھل کر آزادی کی جنگ لڑی گئی۔

فکر و عمل کا یہ اتحاد بلاشبہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی حضرت شیخ الاسلام کے متعین کردہ خطوط پر برپا کی گئی ورنہ اس طرح کا کلیتًا اتحاد ممکن نہیں تھا، اس لئے تاریخ کا طالب علم اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تاریخ آزادی میں اگر حضرت شیخ الہندؒ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو وہ تاریخ ناقص اور ادھوری ہوگی ٹھیک اسی طرح اگر الجزائر کے جہادِ حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ذکر نہ ہو تو وہ تاریخ بھی غیر مکمل و نا تمام ہوگی، تو اس کا دعویٰ یقینًا مبنی برحق ہوگا، حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایک ایسا عظیم اور بے مثال امتیاز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی بھی قومی لیڈر اور سیاسی رہنما میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ ع

''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا''

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمين والصلوة والسلام على خاتم المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين.

☆ ☆ ☆

(ا) ابن بادیس کے جہد و عمل کی ترتیب کے لئے ترکی رابح الشیخ عبدالحمید بن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیہ فی الجزائر کے صفحات ۴۷، ۵۷ اور ۵۳ ملاحظہ ہوں۔